

# نقوشِ راہ

سید قطب شہید

توجہ

عنایت اللہ سجانی



فاران اکیڈمی

۵۸۔ علیم اسکوائر۔ ملتان

IC.E-185/1990

✓  
۲۹۴۴۰  
۵۴۵  
23712

### جملہ حقوق بحق مترجم محفوظ ہیں

پاکستان میں اشاعت اول	مئی ۱۹۸۱ء
ناشر	اکرام الحق راجہ
مطبع	
تعداد	ایک ہزار
قیمت	(مجلد) ۳۰ روپے
	(عام ایڈیشن) ۲۴ روپے

### ملنے کا پتہ

- فارانہ اکیڈمی ۵۸ حلیم اسکوائر ملتان
- ادارہ مطبوعہ طالب الف ذیل پارک اچھرہ - لاہور
- البدر پبلیکیشنز راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## کلمہ خیر

(از مولانا جلیل احسن صاحب ندوی)

حَمْدًا لِلّٰهِ وَ صَلَوةً عَلٰی مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ عَلٰی آلِهِ وَ  
اَصْحَابِهِ دُعَاةَ الْحَقِّ وَالْخَيْرِ۔

اس دور کے اسلامی لٹریچر میں سید قطب شہید کی کتاب معالم فی الطریق انتہائی گراں قدر اہمیت رکھتی ہے۔ یہ دورِ باطل نظریات اور باطل تحریکات کے عام استیلاء کا دور ہے لیکن ہادٹی مطلق کی عنایت سے پورے عالم اسلام میں ایسی تحریکیں بھی جنم لے رہی ہیں جو تجدیدِ دینِ حق اور احیاءِ اسلام کا عزم رکھتی ہیں۔ ناگزیر ہے کہ یہ داعیانِ حق دانستہ یا نادانستہ طور پر باطل تحریکات یا کم از کم باطل طریقہ مانے کار سے متاثر ہو جائیں۔ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ دعوتِ اسلامی کی خصوصیات اور خطوط کار قرآن و سنت کی روشنی میں اس طرح واضح کر دیے جائیں کہ اس میں باطل کے گڈ مڈ ہونے کی گنجائش نہ رہ جائے "معالم" اسی اہم ضرورت کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ کتاب اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے۔ یہ کتاب ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو قرآن و سنت میں گہری بصیرت رکھتا ہے جس نے وقت کے باطل نظریات کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور ساتھ ہی دعوتِ اسلامی کے مختلف مراحل، یہاں تک کہ قید و بند اور دار و درن کی منزلوں سے بھی گزرا

اس دور میں سید قطب شہید

ہے۔ یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ کتاب علمی اور عملی دونوں ہی قسم کی غلط اندیشوں سے زیادہ ہے زیادہ پاک ہے۔ ضرورت تھی کہ اس کو انقدر کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا جائے مجھے خوشی ہے کہ یہ سعاد عزیز گرامی مولوی محمد عنایت اللہ سحانی کو حاصل ہوئی۔ ترجمہ آپ کے سامنے ہے، آپ خود محسوس کریں گے کہ کام پوری محنت اور دیانت داری سے کیا گیا ہے

تحریر میں بڑی پختگی اور روانی ہے۔ چونکہ مصنف سے سچی محبت اور احیاء اسلام کا درد رکھتے ہیں۔ اس لیے اصل کتاب کا سوز و ساز بھی مجروح نہیں ہونے پایا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے۔ داعیان دین کو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق بخشے، اور مترجم کو دنیا و آخرت کی سعادتوں سے بہرہ ور فرمائے۔ یہ مصنف تو ان کو تو اللہ تعالیٰ نے شہادت سے نواز کر قبولیت کی ایسی سند عطا فرمادی ہے جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رَبَّنَا قَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

عاجز جلیل الحسن

۵۸-۵۷ ۱۵-۸-۶۶

سرخاکِ شہیدے برگِ ہائے لالہ می پائیم  
 کہ خوش با نہال ملتِ ماسازگار آمد

---

سید قطب شہیدؒ کو جب پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا تو کسی  
 روز تک میرے حواس قابو میں نہیں تھے ؟  
 (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

# فہرست مضامین

۳	۱	کلمہ خیر
۷	۲	دیباچہ طبع چہارم
۹	۳	دیباچہ طبع اول
۱۹	۴	گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
۲۸	۵	نقوشِ راہ
۵۸	۶	بے مثال قرآنی اُمت
۶۹	۷	قرآنی نظام کا مزاج
۱۰۰	۸	مسلم معاشرے کا قیام اور اس کی خصوصیات
۱۱۱	۹	جہاد فی سبیل اللہ
۱۳۸	۱۰	لا الہ الا اللہ — ایک نظام زندگی
۱۶۵	۱۱	کائناتی شریعت
۱۷۵	۱۲	اسلام ہی تہذیب ہے
۱۹۸	۱۳	اسلام اور کلچر
۲۱۵	۱۴	مسلم کی قومیت اس کا عقیدہ ہے
۲۳۵	۱۵	ہمہ جہتی انقلاب
۲۵۳	۱۶	ایمان کی سر بلندی
۲۶۶		یہی شاہراہ ہے

# دیباچہ طبع چہارم

قارئین کرام!

”نقوشِ راہ“ کو منظر عام پر آئے ہوئے آج تقریباً پانچ سال ہو رہے ہیں اس اثناس میں کتاب کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ سرتاسر اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کے فضل و کرم کا کرشمہ ہے۔ ہندوپاک کے تمام ہی دینی و علمی حلقوں نے اسے قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھا۔ اور عوام و خواص سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اب ہم نہایت مسرت کے ساتھ اس کا چوتھا ایڈیشن پیش کر رہے ہیں۔ پہلا ایڈیشن کچھ اتنی بجلت میں شائع ہوا تھا کہ ہم ٹھیک سے نظر ثانی بھی نہ کر سکے تھے۔ اس کے بعد ہی متواتر دو ایڈیشن شائع ہوئے اور وہ بھی اس قدر جلد جلد شائع ہوئے کہ ہمیں نظر ثانی کا موقع نہ مل سکا۔ اب یہ چوتھا ایڈیشن کافی اصلاح و ترمیم کے ساتھ ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ پہلے ایڈیشنوں میں کتاب کے اندر کہیں کہیں اغلاق تھا جس سے عام قارئین کو دشواری پیش آتی تھی، اس ایڈیشن میں ہم نے حتی الامکان وہ خامی دور کر دی ہے اور عبارت میں زیادہ سے زیادہ روانی اور دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح امید ہے عام قارئین کو اب کوئی دشواری نہ ہوگی اور وہ آسانی سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

طبع اول کے وقت باوجود کوشش و جستجو کے مصنف کی ایمان افروز زندگی سے متعلق ہمیں کچھ زیادہ تفصیلات نہیں فراہم ہو سکی تھیں۔ جن سے قارئین کی کچھ تشنگی دور ہو سکتی اور اس مجاہد جلیل کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور داعیانہ کوششوں کا کسی حد تک تعارف ہو سکتا۔ بس تھوڑی سی کچھ متفرق معلومات تھیں، جو ہم نے ”عرض مترجم“ کے عنوان سے ہدیہ ناظرین کر دی تھیں کتاب شائع ہو جانے کے بعد ہمیں مدینہ منورہ کے

ایک درو مند عالم دین الاستاذ عبدالحق محروس کا ایک مقالہ موصول ہوا۔ جس میں مصنف کی زندگی، ان کی دعوت و عزیمت اور مجاہدانہ سرگرمیوں کا کسی قدر تفصیل سے تعارف کرایا گیا تھا۔ ماہنامہ زندگی کے رجب ۱۳۸۹ھ کے شمارے میں ”گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان“ کے عنوان سے راقم الحروف کے قلم سے اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ جو کافی پسند کیا گیا۔ لہذا ہم نے اسے بھی شامل کتاب کر لیا۔ تاکہ اصل کتاب کے مطالعے سے پہلے صاحب کتاب کی شخصیت، اور ان کے عملی کارناموں کا مختصر سا تعارف ہو جائے۔ واللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور ہمارے اندر بھی وہ ایمان و یقین اور وہ جذبہ بے تاب پیدا کر دے جو اس کتاب کی تصنیف کا اصل محرک ہے۔



بِسْمِہِ سُبْحٰنَہُ

## دیباچہ طبع اول

عمر لیت کہ آوازہ منصور کہن شد

من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

دیباچے نیل کی موجیں شاہد ہیں کہ سرزمینِ مصر تاریخ کے ہر دور میں حق و باطل کی رزم گاہ رہی ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی وہاں خیر و شر کے معرکے پارہے ہیں ہمیشہ سے ہی وہاں نور و ظلمت اور کفر و ایمان باہم دست و گریباں رہے ہیں۔ وہاں ایک سے ایک نول آشام اور بے رحم ذرائع و جبارہ پروان چڑھتے رہے ہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جب بھی کسی فرعون وقت نے اَنَارَ لَکُمُ الْاَعْلٰی کا نعرہ لگایا، اسی دم کوئی موسیٰ بھی نمودار ہوا ہے۔ جب بھی کسی نمودار نے اَنَا وَاٰغِیْرِی کی صدا بلند کی ہے اسی لمحے کسی خلیل بت شکن کا دست بے باک بھی ظاہر ہوا ہے۔ جب بھی باطل نے حق کو چیلنج کیا ہے حق پرستوں کی ایک جماعت نے آگے بڑھ کر اس کے چیلنج کو قبول کیا ہے۔ وہ مردانہ دار و سر بکف میدان میں آنکلتے ہیں اور ہم کر پوری بے خوفی سے باطل کا مقابلہ کیا ہے۔ اُنھوں نے جانیں تو دے دیں مگر باطل کو کبھی پیٹھ نہ دکھائی۔ اُنھوں نے سر تو کٹا دیا مگر سرنگوں ہونے کا نام نہ لیا۔ جب جلا د تلوار چمکاتا ہوا آگے بڑھا تو اُنھوں نے مسکرا کے نظر ملائی پھر یہ کہتے ہوئے مردانہ دار تلوار کے نیچے سر رکھ دیا۔

فلسط ابالی حسین اقتل مسلما

علی ای جنب کان فی اللہ مصرعی

اور جب انھیں دار و رسن کی دھمکی دی گئی تو بصد ناز اس دھمکی کو قبول کیا اور بزبان

حال یہ کہتے ہوئے مستانہ دار خود آگے بڑھ کر اپنے کو حوالہ کر دیا۔

نہ شو و نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغ  
سر دستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

وادئی نیل کسی بھی دور میں ایسے شہیدانِ وفا سے خالی نہیں رہی۔ ہر دور میں فداکاری و جاں نثاری کی یہ مثالیں سامنے آتی رہی ہیں۔ آج بھی کتنے ہی شہیدانِ عشق و وفا اور جبروہ خوارانِ بادۂ توحید ہیں جو اس رسم کی تجدید میں مصروف ہیں جو کہ ہمالہ کی طرح راہِ حق پر قائم و دائم ہیں اور باطل کی طرف سے ہونے والے ہر وار کو اپنے سینوں پر روک رہے ہیں۔ جو چینستانِ اسلام کی طرف بڑھنے والی ہر بادِ سموم کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہیں۔ اور خود اپنے خونِ دل و جگر سے اس کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ ان میں سے کتنے ہیں جو اس راہِ عشق میں کام آچکے۔ اور کتنے ہیں جو اس کے انتظار میں ہیں۔ کتنے ہیں جو جامِ شہادت ہونٹوں سے لگا چکے اور کتنے ہیں جو اسی کی تمنا میں جی رہے ہیں۔ مِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ حُبَّهُ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ۔

انہی شہیدانِ راہ و وفا اور انہی کشتگانِ خنجرِ تسلیم میں وہ شخصیت بھی شامل ہے جس کی کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کتاب "نقوشِ راہ" "معالم فی الطریق" کا اردو ترجمہ ہے۔ "معالم فی الطریق" سید قطب رحمۃ اللہ علیہ کی بہت ہی مشہور و مقبول اور آخری تصنیف ہے۔ یہ مصر و حجاز کے ہر خاص و عام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ ہمارے ایک معزز دوست جو حجاز میں کئی سال رہ چکے ہیں اور جنہوں نے مصر میں بھی کچھ دن گزارے ہیں۔ ان کی روایت ہے کہ یہ کتاب عرب ممالک میں ہاتھوں ہاتھ لگتی۔ مصر میں اس کی مقبولیت کا حال بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ صرف مصر میں ایک ایک ہی دن میں اس کے ہزاروں نسخے فروخت ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ہمارے علمی اور تحریری لٹریچر میں ایک بیش بہا اضافہ اور قافلہ تحریرِ اسلامی کے لیے بہترین رہتا ہے۔ اس کتاب میں تحریرِ اسلامی کے خطوط کا اس کے نقطہ ہائے نظر اور راہِ دعوت میں پیش آنے والے تدبیر کی مراحل کا جو تجزیہ کیا گیا ہے وہ انتہائی حکیمانہ اور شریعتِ اسلامی کے مزاج کا بہترین ترجمان ہے۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت اور بھی ہے جو اس کی قدر و قیمت میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ یہ کتاب کوئی عام انداز کی علمی اور فنی تصنیف نہیں۔ یہ نظریہ اور تحریک، علم اور وجدان، حقائق اور جذبات کا ایک موثر اور دلاویز مرقع ہے۔ یہ ایک دردمند دل کی پکار اور ایک بے قرار روح کی فریاد ہے، کتاب کے جملے کیا ہیں، مصنف کے جگر پارے ہیں۔ کتاب کی ایک سطر کہہ رہی ہے کہ اس کے لیے جو دشنائی استعمال کی گئی ہے اس میں صرف پانی ہی نہیں دل کے لہو کی بھی آمیزش ہے۔

اس لحاظ سے بھی یہ کتاب انتہائی اہم ہے کہ اسی کو مصوف کی شہادت کے لیے بہانہ بنایا گیا کتاب پڑھ کر قاری حیران رہ جاتا ہے کہ اس میں وہ کون سی بات تھی جو مصر کی حکومت کے لیے حلق کا کانٹا بن گئی۔ اور اس کی کن طور سے اقتدار وقت کو یہ اندیشہ ہوا کہ یہ کتاب سلطنت مصر کا تختہ الٹنے کی ایک منظم سازش ہے۔ لیکن یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ حیرانی کی بات تو اس وقت ہوتی جب حکومت مصر کا رویہ اس کے برعکس ہوتا۔ اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ یہ کتاب واقعہ مصر کے کلیت پسند نظام کے سراسر خلاف تھی۔ اور اس کی عسکری حکومت کے لیے ایک عظیم خطرہ بھی، ظاہر ہے اسلام کو قائم کرنے اور حق کو زندہ کرنے کی ہر کوشش نظام جاہلیت کی بنیادوں پر انتہائی زبردست چوٹ ہے اور ایسے موقع پر جاہلیت کا تلملانا اور پیچ و تاب کھانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ اس کتاب کو بنیاد بنا کہ جو خونیں ڈرامہ کھیلا گیا وہ کچھ بھی حیرت ناک اور خلاف توقع نہ تھا۔ ہاں افسوس ناک اور شرمناک ضرور تھا۔ کہ یہ ظلم و بربریت اور جبر و استبداد کا اتنا زبردست مظاہرہ تھا کہ انسانیت جتنا ماتم کرے تھوڑا ہے۔ اس حادثہ سے عالم اسلام کو اتنا شدید دھکا لگا کہ

آسمانِ راحق بود گر خوں بیار ویر ز میں

اس جاں کا المیہ پر بلند ہونے والے نالے اور سرد آہیں اگر دودھ آتش کی صورت اختیار کر لیتیں تو یقیناً مانیے پور بفع مسکوں تاریک نظر آتا۔۔۔۔۔ مگر نہیں، اس سانحہ سے ہمیں غم سے زیادہ خوشی اور رنج سے زیادہ مسرت ہے۔

کیونکہ یہ حق کی فتح اور باطل کی شکست تھی۔ اُجالے کی جیت اور اندھیرے کی مار تھی۔ روح کی سر بلندی اور ماؤسے کی ہزیمت تھی، ایمان و یقین کی کامیابی اور الحاد و ہریت کی ناکامی تھی۔ یقیناً اس عظیم ہستی کا ہم سے اس طرح چھین جانا انتہائی صبر آزما اور وصلہ شکن آزمائش تھی مگر سوچتے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

پھر اس دنیا میں کوئی عمر جاودانی لے کر نہیں آیا۔ ان سے پہلے بھی کتنی ہی عظیم اور یگانہ روزگار ہستیاں آئیں اور چلی گئیں۔ سچی کہ خلاصہ کائنات اور فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم و ذراہ ابی و امی کو بھی موت سے دوچار ہونا پڑا۔ دیکھنے کی چیز اصل میں یہ ہے کہ اس مردِ مجرب نے جان دینی گوارا کر لی، مگر عقیدہ و روح کی ہر قیمت گوارا نہ کی۔ تختہ دار پر چڑھ گیا، مگر ایمان و یقین پر آنچ نہ آنے دی۔ زندگی، اور زندگی کی ساری لذتیں چھین گئیں، مگر حق و صداقت کی رسوائی نہ ہونے دی، اس نے دنیا اور عیشِ دنیا کو اس شانِ بے نیازی کے ساتھ الوداع کہا کہ باطل انگشت بندہاں ہے۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

اس مردِ شہید کی تصویریں بیروت، امریکہ اور برطانیہ کے اخبارات میں شائع ہوئیں، اس نوٹ کے ساتھ کہ موت کا حکم مجیر العقول طور پر ٹھنڈے اعصاب سے سنا۔ بیروت کے اخبار "الحیاء" نے لکھا ہے: "صبح شہادت جب ان سے آخری خواہش معلوم کی گئی، تو صرف سنتہ القتل کی دو رکعتیں پڑھنے کی اجازت طلب کی، اور آخری نوٹوں میں مسکراتے ہوئے بگہ ہنستے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ گویا کوئی دولہا ہو جو مستقبل حسین کی رعنائیوں کا تصور کر کے خوشی سے بے قابو ہو۔

جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر،

جب وقت شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

یقیناً امت مسلمہ کی بہت بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس دور میں بھی وہ ایسے

نفوس سے خالی نہیں جو اس کی آبرو کے تحفظ کے لیے نقدِ جاں پیش کر سکیں۔ جو اپنا سر تو کٹا دیں مگر اس کی ناک نیچی نہ ہونے دیں۔

اب ہم ذرا اختصار کے ساتھ مصنف کی زندگی کا تعارف کر لیں گے پھر بیچ سے ہٹ جائیں گے تاکہ براہ راست آپ ان کی باتوں سے مستفید ہو سکیں۔

سید قطبؒ ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک صوبہ اسیوط کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام قطب ابراہیم، اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ سید قطبؒ اپنے والدین کے سب سے بڑے ذریعہ تھے۔ چھوٹے بھائی کا نام محمد قطبؒ تھا۔ سید قطبؒ ہی کی طرح یہ بھی بہت ہی اہم اور مقبول عام کتابوں کے مصنف ہیں ان کی بہن جمیدہ قطب بھی دین کی سرگرم خاتون اور نامور انشاعر پر داز تھیں۔ والدہ بھی بڑی نیک اور دیندار خاتون تھیں۔ قرآن کریم سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھتی تھیں۔ ان کی تمنا تھی کہ بیٹے حافظِ قرآن ہوں۔ خدا رسیدہ مال کی آرزو بر آئی۔

ان کا لال سید قطبؒ نہ صرف حافظِ قرآن ہوا، بلکہ قرآن کریم کے اسرار و علوم سے بھی خوب نہال ہوا۔ اور پھر تیس جلدوں میں ایک نئے طرز کی تفسیر لکھ کر دنیا کو بھی علومِ قرآن سے مالا مال کیا۔ سید قطبؒ کی ابتدائی تعلیم شہر ہی کے ایک مکتب میں ہوئی۔ پھر ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم کالج قاہرہ میں داخلہ لیا۔ اور ۱۹۳۳ء میں یہاں سے بی، اے کی ڈگری اور ڈپلوما ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات سید قطبؒ کی پیشانی پر بچپن سے ہی اقبال مندی کا ستارہ چمک رہا تھا۔ کالج میں بھی ان کا شمار انتہائی ذہین طلبہ میں رہا۔ اسی زمانے میں ان کے اندر شعر و ادب اور صحافت کا بھی ذوق پیدا ہو گیا۔

تعلیم سے فراغت ہوئی تو وزارتِ تعلیم میں آگئے اور انسپکٹر آف اسکولز کی حیثیت سے ایک عرصے تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ وزارتِ تعلیم کی طرف سے امریکہ گئے۔ وہاں مختلف نظامہائے تعلیم و تربیت کا مطالعہ کیا اور دو سال رہ کر ۱۹۵۱ء میں واپس آگئے۔

دور ان تعلیم اور اس کے بعد ایک زمانے تک رشدِ قطب کو اسلام سے کوئی  
عملی اور گہرا گٹاؤ نہ رہا۔ خالص ادبی رنگ ان کے مزاج پر غالب رہا۔ شعر و شاعری کے  
 علاوہ انھیں فنِ تنقید سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ مصر کے اس مشہور ادبی و تنقیدی حلقے  
 کے ایک اہم رکن تھے جو عباس محمود العقاد کا مدرسہ یادبستاں کہلاتا ہے۔ وہ عقاد کے  
 اسلوب نگارش سے متاثر تھے۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں اکثر وہی رنگ جھلکتا ہے  
 لیکن اس کے باوجود وہ خود ایک صاحب طرز ادیب اور صاحب فن نقاد تھے۔  
 ان کے ادبی اور تنقیدی مضامین، ادبی حلقوں میں بڑی قدر وقعت کی نگاہ سے  
 دیکھے جاتے تھے۔ ان کی کتابیں ”النقد الادبی“ اور ”کتب و شخصیات“ تنقیدی  
 ادب کی شاہکار ہیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے قرآن کریم کا ادبی اور فنی حیثیت  
 سے گہرا مطالعہ کیا۔ اور اپنے نتائج مطالعہ کو ”التصویر اللفنی فی القرآن“ اور  
 ”مشاہد القیامۃ فی القرآن“ نامی کتابوں کی شکل میں پیش کیا۔ جو علمی اور ادبی  
 حلقوں میں کافی مقبول ہوئیں۔ قرآن کریم کے اس مطالعہ اور ان دونوں کتابوں  
 کی تصنیف سے سید صاحب کی زندگی پر بہت ہی خوشگوار اثرات مرتب ہوئے  
 اور دین بدن فکری اور جذباتی طور سے اسلام سے ان کی دلچسپیاں بڑھتی گئیں۔  
 شخصیت میں انقلاب کا یہ عمل ۱۹۲۵ء تک جاری رہا۔ ۱۹۲۶ء میں موصوف  
 نے ”العنایۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام“ کی تصنیف شروع کی۔ اس وقت  
 ان کے مزاج پر اسلامی رنگ پوری طرح غالب تھا اور اس میں خاصی پختگی اور  
 صلابت آچکی تھی۔ اس کتاب کی تصنیف شروع کی تو اس کی برکت سے ان  
 کی طبیعت کا آئینہ اور زیادہ محلی و مصفا اور صیقل ہو گیا۔ ۱۹۲۸ء میں یہ کتاب پایہ  
 تکمیل کو پہنچ گئی اور اس کے بعد دو سال کے لیے موصوف کو امریکہ جانے کا موقع  
 ملا۔ اس سفر میں انھوں نے امریکہ اور یورپ کے تمام تعلیمی اور تہذیبی مراکز  
 کو قریب سے دیکھا۔ اور مغرب کی شیشہ گری اور اس کی مادی تہذیب کا بغور مطالعہ  
 کیا اس وقت اسلام کی عظمت اور اس کی قدر و منزلت پوری طرح نکھر کر ان

کے سامنے آگئی اور انھیں اس حقیقت کا علم الیقین حاصل ہو گیا کہ تنہا اسلام ہی وہ دینِ فطرت ہے جو دنیا کو تہذیبی بحران سے نکال کر ایک متوازن نظامِ حیات دے سکتا ہے اور شقاوت و بد بختی کی ہولناک تیرگی کو ختم کر کے صبحِ سعادت کی دلکش ساعت لاسکتا ہے، چنانچہ امریکہ سے واپس آ کر انھوں نے ”امریکالیٹی“ نامی کتاب کی شکل میں اپنے یہ تاثرات قوم کے سامنے پیش کیے۔ چونکہ اس وقت دوسرے عربی اور اسلامی ممالک کی طرح مصر بھی مغرب کی ماویٰ دوڑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا اور مغرب کی اندھی تقلید میں ہی اپنے لیے فخر محسوس کرتا تھا اس لیے سید صاحب نے مغربی نظاموں کی خوب قلعی کھولی۔ اور ان کی طرف سے قوم کو بیزار کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

اسلام سے جوں جوں ان کا تعلق بڑھتا گیا اور علومِ اسلامیہ کا جیسے جیسے مطالعہ ہوتا رہا۔ ”الاکخوان المسلمون“ سے بھی دلچسپی ہوتی گئی۔ ایک زمانے میں تحریکِ اخوان کے مرشد عام حسن ابننا شہید سے موصوف کو خاصا اختلاف بھی رہا لیکن امریکہ سے واپسی پر اس تحریک سے خاصا لگاؤ ہو گیا۔ اور وہ اخوانی اخبارات و رسائل میں کثرت سے مضامین لکھنے لگے، چنانچہ ایک وقت وہ بھی آیا کہ ”الدعوة“ کا ہر شمارہ ان کے رشحاتِ قلم سے مزین ہوتا۔ ۱۹۵۳ء میں وہ اخوان کے باضابطہ ممبر بن گئے۔ اخوان نے انھیں مرکزی شعبہٴ نشر و اشاعت کا سکریٹری بنا دیا۔ سید صاحب نے اخوانی لٹریچر کو مختلف زبانوں میں منتقل کرنے اور اس میں مزید اضافہ کرنے کا ایک جامع نقشہ بنایا۔ لیکن ابھی اس کے مطابق کام شروع ہی کیا تھا کہ یہ تحریک خلافِ قانون قرار پا گئی۔ پھر جب یہ تحریک دوبارہ بحال ہوئی تو اخوان نے ”الاکخوان المسلمون“ کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کی ایڈیٹری کے لیے سید صاحب کا انتخاب ہوا۔

جدید مصری فرعونیت کے زمانے میں جب پہلی بار تحریکِ اخوان خلافِ قانون قرار دی گئی، تو سید قطب کو بھی گرفتار کر کے جیل کی آہنی سلاخوں کے پھینے والے دیا

گیا۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں رہا کر دیا گیا۔ پھر اکتوبر ۱۹۵۴ء میں بڑے پیمانے پر افغان  
 کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اسی موقع پر سید صاحب کو بھی دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ جیل  
 کی وحشت ناک تنہائیوں میں بھی قلمی جہاد کا سلسلہ جاری رہا اس مدت میں انہوں  
 نے کئی کتابوں پر نظر ثانی کی۔ ”فی ظلال القرآن“ کی تکمیل بھی جیل ہی میں ہوئی۔  
 درمیان میں حکومت مصر نے کرنل عارف عبدالسلام کی طرف سے بہت دباؤ  
 پڑنے پر انہیں کچھ دنوں کے لیے آہنی سلاخوں سے باہر آنے کی اجازت دے  
 دی تھی۔ مگر یہ وقفہ زیادہ طویل نہ ہوا تھا کہ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا الزام لگا کر  
 پھر قید کر لیا گیا۔ پھر ان اور ان کے ساتھیوں پر ایسے ایسے بیہیمانہ اور شرمناک مظالم  
 کے پہاڑ توڑے گئے کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی باسانی انہیں سننے کی تاب نہیں  
 لاسکتا۔ مگر سید صاحب اور ان کے بے گناہ ساتھی صبر و استقامت کا پیکر بنے رہے۔  
 اور باطل کی تیز و تند اور بھیانک آندھیوں کے مقابلے میں آہنی چٹان اور سیسہ پلائی  
 ہوئی دیوار کی مانند ڈٹے رہے۔ بالآخر ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کی شب میں جدید  
 مصری فرعونیت کے لیے رحم ہاتھوں نے امت مسلمہ کو اس کی اس عظیم دولت سے  
 محروم کر دیا۔ اور سید قطب یعنی آسمان علم و یقین کا قطب تارہ اپنے دو ساتھیوں کے  
 ساتھ تختہ دار کا خندہ چلینی سے استقبال کرتے ہوئے اپنے رب سے جا ملا۔

حق کے پر دانو! سلام ہو تم پر۔ ملت کے رہنماؤ! سلام ہو تم پر۔ صداقت کے  
 علمبردارو! سلام ہو تم پر۔ اسلام کے فداکارو! سلام ہو تم پر۔ امت کے ناخداؤ!  
 سلام ہو تم پر۔ دین کے پاسبانو! سلام ہو تم پر۔ ہمیں یقین ہے تمہارا خون ضرور  
 رنگ لائے گا۔ تم نے اپنے خون سے جس کشت اسلام کی آبیاری کی ہے وہ ضرور  
 لہلہائے گی۔ تم نے ”سرخ روغن“ سے ایمان و یقین کی جو قنیلیں روشن کی ہیں  
 وہ ضرور روشن رہیں گی، اور دنیا کو روشن کریں گی۔ کیونکہ

خونے کہ عشق ریزد ہرگز ہلکا نہ باشد

سید صاحب دودرجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں، جو اسلامیات کے



علاوہ شعر و افسانہ، تنقید و ادب اور سفر نامہ وغیرہ اصناف سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ ساری کتابیں اپنے اپنے فن کی نہایت اہم اور کامیاب کتابیں ہیں۔ مگر ان میں ”فی ظلال القرآن“ ”العدالة الاجتماعية في الاسلام“ ”التصوير الفنى في القرآن“ ”مشاهد القيامة في القرآن“ ”معركة الاسلام والرواسلية“ اور ”معالم في الطريق“ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ”معالم في الطريق“ کا تذکرہ قدرے تفصیل سے ہم پیچھے کر آئے ہیں۔ ”فی ظلال القرآن“ کی کچھ جلدیں اور ”العدالة الاجتماعية في الاسلام“ کا اردو ترجمہ دیکھنے کا بھی ہمیں اتفاق ہوا۔ یہ کتابیں اپنے موضوع پر نہایت اہم اور ایک انفرادی شان کی حامل ہیں۔ بقیہ کتابیں دیکھنے کا ہمیں موقع نہ مل سکا۔ لیکن اتنا ہمیں معلوم ہے کہ یہ بڑے بڑے اساتذہ فن اور اساطین علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اور خاص و عام سب نے ان کی قدر و وقعت کو تسلیم کیا اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ ان کتابوں سے سید صاحب کی غیر معمولی صلاحیت، علمی مہارت اور دین کی گہری بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام کی یہ کتنی زبردست ٹریسجڈی ہے کہ اسلام کا یہ ہیرو خود مسلمانوں کی ہی لڑہ خیز ستمانیوں کا ہدف بنا۔ ان کے بے رحم ہاتھوں نے اس گل سرسبد کو مسل دیا اور علم و عمل کے اس پہاڑ کو دنیا کی نظروں سے اوجھل کر کے ہی دم لیا ہے

حیف بریں گزندگاں داتے ازیں دندگاں  
تینخ جفائے دوستاں بر سر دستاں نگر

”معالم في الطريق“ سید صاحب کی دوسری تصنیف ہے جو اردو زبان میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ ان کی نہایت اہم اور آخری تصنیف ہے۔ اس سے موصوف کی ایمانی خردت اور علمی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ ترجمہ میں ہم نے کتاب کی اصل روح قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور زور و تاثیر کو حتی الامکان مجروح ہونے سے بچایا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں ہمیں کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ کتاب کا مسودہ کچھ ذی علم اور صاحب بصیرت حضرات کی نظروں سے بھی گزر چکا ہے۔ ان بزرگوں نے اسے دیکھ کر جن تاثرات کا



## گفتار میں کردار میں اللہ کی بہان

کسی بھی دعوت یا تحریک کی جان بس دو ہی چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک تو اس کے اصول و نظریات اور طریق کار، دوسرے اس کے وہ افراد جن کی زندگیاں ان اصولوں کا نمونہ ہوں اور عملاً اس کے طریق کار کی ترجمانی کرتی ہوں۔ بس انہی افراد سے صحیح معنوں میں ان اصولوں کا وقار بڑھتا اور ان کی توانائی اور استحکام میں اضافہ ہوتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ دعوت کے علمبرداروں کی تربیت پر ہی کسی دعوت کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے، وہ جس پیمانے پر دعوتی افکار و نظریات کو اپنے اندر جذب کرتے اور اس کے طریق کار کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اسی پیمانے پر وہ دعوت کامیاب یا ناکام ہوتی ہے، گویا کسی دعوت یا تحریک کی اولین اساس افراد اور ان افراد کی تربیت ہی ہوا کرتی ہے۔ اس حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اسلام ایک بہترین فکر اور کامیاب ترین نظریہ ہے، چنانچہ مردم سازی کے اس کارخانے سے برابر ایسے نمونے برآمد ہوتے رہے ہیں جو انسانی کمالات کے نقطہ عروج پر رہے ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ دین اسلام گویا عظمت کا ایک منارہ ہے، کہ جس نے بھی کبھی اس کی روشنی میں تربیت پائی ہے، اس کے گنبد زندگی میں عظمت کے ققمے روشن ہو گئے ہیں۔ یہی راز ہے کہ تاریخ اسلام ایسی یا عظمت شخصیتوں سے بھری پڑی ہے، جنہوں نے زندگی کے ہر میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہ عظمائے اسلام کوئی گنتے چنے افراد نہیں، بلکہ ایک عظیم انبؤہ ہے، جس کو شمار کرنا کوئی آسان کام

نہیں، بلکہ بسا اوقات تو پورا پورا خاندان آسمان اسلام پر آفتاب و ماہتاب بن کر اپنی تابانیاں دکھلاتا رہا ہے۔ قرنِ اول میں حضرت یاسرؓ کے خاندان کی کچھ ہی صورت تھی، وہ ان کی بیوی، ان کے بیٹے، سبھی تاریخ اسلام کے ہیرو تھے، آلِ مقرر کے خاندان کی بھی یہی نوعیت تھی۔ سوید، عبد اللہ، نعمان، سبھی لشکر اسلام کے قائد اور ظفرِ مندیِ اسلام کے تاجدار تھے۔ عباسی دورِ خلافت میں آل شاکر کا بھی یہی حال تھا، کہ وہ سب کے سب ریاضیات اور میکانک کے اساتذہ فن تھے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو تاریخ اسلام کے ہر دور میں ہی ایسی شخصیتیں اور ایسے گھرانے برابر نمودار ہوتے رہے ہیں جنہوں نے ہمیشہ عظمت و بلندی کے مناروں پر ایشیا نے بنائے ہیں۔ زمانہ حال میں آل قطب، سید قطب، محمد قطب، امینہ قطب، حمیدہ قطب اور ان کی بڑی بہن (شہیدہ) رفعت بکر شافعی کی والدہ ماجدہ کا گھرانہ بھی اسی انداز کے گھرانوں میں سے تھا، اور اس گھرانے کی رہنمائی و سربراہی کا سہرا سید قطب کے سر ہے۔ شاید اب آپ جاننا چاہیں گے کہ سید قطب اور ان کے گھرانے کی سرگزشت کیا ہے؟ اسلام کی نگاہ میں ان کا کیا مقام ہے؟ اور دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں ان کا کیا رول رہا ہے؟

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، مصر کے ریاضی علاقوں میں حفظ قرآن کا بڑا چرچا تھا۔ حفاظ کی کثرت پر وہ علاقے ہنر کیا کرتے، یہی وجہ ہے کہ وہ بچوں کو کوئی تعلیم دلانے سے پہلے قرآن پاک حفظ کرتے اس وجہ سے نہیں کہ بچوں کو اس سے آئندہ تعلیم میں سہولت ہو جائے گی بلکہ یہ دراصل قرآن پاک سے ان کے قلبی لگاؤ اور ذہنی وابستگی کا کرشمہ ہوتا، یہی سبب ہے کہ جو لوگ علمی میدان میں آگے بڑھنے کا ارادہ نہ بھی رکھتے، وہ بھی قرآن پاک حفظ کرتے اور اس سے فارغ ہونے کے بعد زراعت یا کسی حرفت میں لگ جاتے، پھر سارے کاروبار کرتے ہوئے بھی وہ زندگی بھر قرآن پاک کی طرف سے لاپرواہ نہ ہوتے۔

اس لیے کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اگر اسلامی ممالک میں تعلیم کی اساس قرآن پاک ہو اور قرآنی و دینی کلچر ہی ان کا مطرح نظر اور ان کی توجہات کا مرکز ہو، سید قطب شہید ان سعید رجول میں سے ہیں جنہوں نے عقل و شعور کی آنکھیں قرآن کریم کی اغوش میں کھولیں۔ بچپن میں حفظ کیا اور جوانی میں اس پر غور و تدبر کیا لطف کی بات ہے کہ اس دور کے متعلق یہ تاثر عام ہو چکا تھا کہ مسلمان ممالک میں اب انسانی سوتے خشک ہو چکے اور آج سے بہت پہلے ہی عظمائے اسلام کا یہیں سلسلہ منقطع ہو چکا، مگر آج زمانے کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ شہد اور عظام کے قافلے پر قافلے، یکے بعد دیگرے نمودار ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ بلاشبہ تیرے رب کی فوجوں کا علم تو بس اسی کو ہے۔ مومنین میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جنہوں نے اپنے عہد کو سچ کر دکھایا، ان میں سے کتنے تو اپنے ارمان پورے کر چکے اور کتنے اس کے انتظار میں ہیں، اور انہوں نے ذرا بھی تبدیلی نہیں کی۔

یہ چند تمہیدی کلمات تھے۔ اب ہم چاہتے ہیں امام شہید کی زندگی کا براہ راست کچھ تعارف کرائیں۔ موقع زیادہ تفصیل میں جانے کا نہیں، اس لیے چند ابھرے ہوئے گوشے ہی سامنے آسکیں گے۔

سید قطبؒ ۱۹۰۶ء میں صوبہ اسیوط کے ایک گاؤں "موشی" میں پیدا ہوئے۔ والدین بہت صالح اور دین دار تھے، والد حافظ قرآن تھے، اور ماں قرأت قرآن سننے کی بے حد شوقین تھیں، ریڈیو اور گراموفون پر تلاوت قرآن سننا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ سید قطبؒ پر ان کا کافی دنوں سایہ رہا۔ یہاں تک کہ قاہرہ میں وہ سپرد خاک ہوئیں، سید قطبؒ کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے ہی ایک مکتب میں ہوئی، قرآن پاک بھی وہیں حفظ کیا، پھر وہ قاہرہ چلے آئے اور دارالعلوم کے مدرسہ اعدادیہ میں داخل ہو گئے۔ پھر کچھ دنوں بعد دارالعلوم کالج میں داخلے سے پہلے وہاں سے ذرا عنت کے بعد ٹریننگ کالج میں کچھ دن گزارے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۲ء



وقت کے ایک ممتاز ادبی مجلہ "الرسالة" کے کالم اس ادبی جنگ کا محاذ بنے اور محمد سعید عریاں اور سید قطب کے درمیان نہایت مفرکہ آرا بحثیں چلیں۔ محمد سعید العریاں رافعی کی حمایت میں تھے اور سید صاحب عقاد کی مدافعت میں انجام کار میدان عریاں کے ہاتھ رہا۔ رافعی کی بلاغت اور ان کے مطالعہ قرآن کی وجہ سے عریاں ہی غالب رہے۔

خدا کی مشیت ایسی کہ نیک نفس اور بلند کردار سید قطب کے لیے یہی ادبی جنگ خیر و بہتری کا فتح باب بن گئی۔ وہ از سر نو بلاغت قرآن اور اسالیب قرآن کا نہایت دیدہ ریزی اور گہرائی سے مطالعہ کرنے لگے، اس طرح کئی سال کے غور و تحقیق کے بعد سید قطب نے بھی عبقری انسانوں کے مثل ایک نیا انکشاف کر کے عربی ادب اور اسلامی علوم میں قابل قدر اضافہ کیا۔ اس نئے انکشاف نے سید صاحب کو عریاں اور عقاد سے بھی آگے بڑھا دیا، اور اب دنیا سے عرب اور عالم اسلام کے ممتاز اہل قلم میں ان کا شمار ہونے لگا۔ پھر یہی دریافت اسلام کے گہرے مطالعہ اور بعد میں تحریک سے وابستگی کا سبب بنی، نیز اسی کا کرشمہ تھا کہ آخر میں شہادت کا خلعت زیبایا بھی ان کے قد اقدس پر راست آگیا، اس موقع پر شاید آپ جاننا چاہیں گے کہ وہ کون سی نئی اور مہتمم بالشان دریافت تھی، وہ تھی "قرآن میں منظر کشی یا فنی تصویر کشی" کی دریافت۔ یہ دریافت سید صاحب نے اپنی مشہور کتاب "التصویر المعنی فی القرآن" میں پیش فرمائی۔ ۱۹۴۴ء کے لگ بھگ اس کتاب کی اشاعت ہوئی۔ اس کے بعد ہی "مشاہد القیامۃ فی القرآن" نامی ایک دوسری کتاب منظر عام پر آئی، جو دراصل ایک قرآنی موضوع کے سلسلے میں اسی جدید نظریہ کی تطبیق کی ایک کوشش تھی۔ سید صاحب کی شہرہ آفاق تفسیر "فی ظلال القرآن" میں بھی بنیادی طور پر اسی نظریہ کی جلوہ طرازی ہے۔ اسی کی بدولت سید صاحب علمی اور عملی طور پر اسلام سے قریب ہوئے۔ اسی مطالعہ سے سید صاحب کے عقیدے میں استحکام آیا۔ ان میں دعوت کا فہم پیدا ہوا، نیز اس کے لیے جدوجہد کی دھن، اور

تن من دھن سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ بے پناہ اٹھ پڑا۔ بس اسی وقت سے سید صاحب ایک اسلامی ادیب اور ایک دینی شخصیت کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ جبکہ اس سے قبل وہ بس ایک ادیب کی حیثیت سے متعارف تھے اور اب خدا سے ان کے تعلق میں استواری آگئی اور صحیح معنوں میں وہ ایک دین دار انسان نظر آنے لگے۔

سید صاحب محض کوئی مصنف یا مضمون نگار نہ تھے کہ بس خطوط اور سطروں کے تنگ ہارے میں محصور رہتے اور کتابوں کے صفحات میں ہی ان کی شخصیت کی جلوہ گری ہوتی، اور نہ کوئی مفکر تھے کہ فکر و خیال کی پنہائیوں میں غوطے لگاتے یا شعر و نغمہ کی کیاریوں میں ہی چمکتے رہتے، وہ تو ایک زندہ اور جاندار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بہادر اور حوصلہ مند انسان تھے، جو سوسائٹی کے معاملات سے براہ راست تعرض کرتے، اس کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو پوری شدت سے محسوس کرتے، اس کے مسائل پر غور و فکر کر کے کسی کامیاب حل کا سراغ لگاتے۔ وہ برابر اس فکر میں رہتے کہ کیونکر معاشرہ ساحل سعادت سے ہمکنار ہو سکتا اور کیونکر یہ امت ترقی کے مدارج طے کر سکتی ہے۔ چنانچہ سید صاحب نے ۱۹۲۵ء میں کچھ لوگوں کے تعاون سے ”الفکر المجدید“ نامی ایک رسالہ نکالنا شروع کیا۔ سید صاحب کی سرپرستی کی وجہ سے یہ رسالہ وقت کا ایک نہایت زور دار اور بے باک ”محتسب“ بن گیا۔ جس نے پوری بے خوفی کے ساتھ اجتماعی مظالم کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ حکام کی زیادتیوں اور کوتاہیوں پر تنقیدیں کیں۔ وقت کے ناخوشگوار حالات کا تجزیہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے بائیں بازو... کا ترجمان قرار دے کر اسے بند کر دیا۔ اس مدت میں سید صاحب نے ایک نظام حکومت اور ایک نظام معاشرہ کی حیثیت سے اسلام کا مطالعہ کیا۔ اجتماعی مظالم کے خلاف ان کی ابھی ذہنی بغاوت کا نتیجہ تھا کہ اس مطالعہ کے دوران ”العدالة الاجتماعية في الاسلام“ جیسی مہرکتہ الآراء کتاب تیار ہو گئی۔ اسلام کے



اجتماعی نظام کا مطالعہ کرتے ہوئے سید صاحب نے پوری وقت نظر کے ساتھ اشتراکیت کا بھی مطالعہ کیا اور بہت قریب سے اشتراکیوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سید صاحب ان سے بری طرح متنفر ہو گئے۔ اشتراکیت کی حقیقت سامنے آنے پر انھیں اندازہ ہوا کہ یہ تو انسانیت کے لیے ایک بلائے بے درماں ہے۔ یہ پریشانیوں کا حل نہیں، بربادیوں کا پیش خیمہ ہے۔ چنانچہ اسلام کی حمایت میں اب وہ اور زیادہ سرگرم ہو گئے۔ اشتراکیت کے گہرے مطالعے اور اشتراکی لیڈروں کے قریبی مشاہدے نے ان کے استدلال میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا اور اب وہ اشتراکیت کے لیے ایک خنجر بے نیام اور اک تیغ بے امان بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ سید صاحب کی کتابوں سے بڑی طرح خائف رہتے اور ان کی ہر تحریر سے اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے۔ وزارت تعلیم و تربیت میں آنے کے بعد سید صاحب برابر ترقی کرتے رہے اور شہرت و نیک نامی دن بدن بڑھتی ہی رہی۔ یہاں تک کہ وہ وزارت تعلیم کے منکران اعلیٰ بن گئے۔ جو ایک غیر معمولی عہدہ تھا۔ پھر وزارت نے جدید نظام تعلیم و تربیت کے مطالعے کے لیے سید صاحب کو امریکہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں وہ امریکہ روانہ ہو گئے۔

سید صاحب نے "العدالة الاجتماعية" کی تالیف ۱۹۴۶ء میں شروع کی۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر تک اس سے فارغ ہو گئے۔ پھر ۱۹۴۸ء کے آغاز میں ہی امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے مگر کتاب کا مسودہ ساتھ نہ لے گئے۔ امام حسن البنا کو اطلاع ملی کہ ایک ادیب نے "اسلام میں عدل اجتماعی" کے موضوع پر کوئی کتاب تصنیف کی ہے۔ امام محترم نے سید صاحب کے آثار سے وہ کتاب طلب کی، اور اس کے لیے خود ایک پیش لفظ رقم فرما کر جلد سے جلد اسے شائع کرنے کی تاکید کی۔ پھر دسمبر ۱۹۴۸ء میں اخوان کی رہائی ہوئی تو مکتبوں میں موجود نسخوں سے امام محترم کا پیش لفظ حذف کر دینے کی تحریک

۱۹۴۸

اٹھی، کیونکہ امام موصوف نے کتاب کا پیش لفظ لکھنے پر ہی اکتفا کیا تھا، کتاب کے اندرونی مباحث سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا، جبکہ اس کتاب میں صحابہ کرامؓ سے متعلق کچھ ایسی عبارتیں بھی موجود تھیں، جو ان کے شایان شان نہ تھیں۔ پھر بعد میں اخوان نے سید صاحب سے اس سلسلے میں گفت و شنید کی اور آئندہ ایڈیشنوں میں وہ عبارتیں حذف کر دی گئیں۔

سید صاحب کا سفر امریکہ دراصل ایک سنہری موقع تھا، جو ان کے لیے غیب سے فراہم کیا گیا تھا، تاکہ اشتراکیت کا اچھی طرح جائزہ لے چکنے کے بعد اب وہ سرمایہ دار نہ نظام زندگی کا قریب سے جا کر مشاہدہ کریں۔ چنانچہ سید صاحب نے بہت ہی غائرانہ اور ناقدانہ نگاہ سے امریکی ماحول اور وہاں کے تہذیب و تمدن کا جائزہ لیا اور امریکہ کی ایک ایک چیز کو اسلام کی ترازو میں تول کر دیکھا۔ اس طرح امریکی تہذیب اپنی ساری اختراعات اور تمام دلچسپیوں کے باوجود بھی ان کی نگاہیں خیرہ نہ کر سکی۔ اس کے برعکس انھیں واضح طور پر محسوس ہوا کہ امریکی نظام فطرت کا دشمن اور انسانیت کا رہزن ہے، جو انسان کو بالکل مفلوج اور ناکارہ بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امریکہ کے زمانہ قیام میں ہی کوئی منظم اسلامی تحریک چلاتے اور ایک ایسی مسلم نسل تیار کرنے کا پروگرام بنانے لگے جو عقیدے کے گہوارے میں پروان پڑھے، اور اخلاق کے سانچوں میں ڈھل جائے۔ جو علم و معرفت کے ستونوں سے سیراب ہو، اور صحت و قوت کے خزانوں سے بھر پور ہو۔ چنانچہ امریکہ کے زمانہ قیام میں وہ برابری کاموں میں ہی مصروف ہوتے اور ایک مسلم نسل تیار کرنے کی تدبیریں سوچتے رہتے، امریکہ ہی میں انھوں نے عزم کیا کہ مہر واپس ہوتے ہی پورے زور و شور سے اسلامی سرگرمیاں شروع کر دیں گے اور ایک ایسی اسلامی تنظیم قائم کریں گے جو اس مقصد کو لے کر آگے بڑھے، اور دعوت کے لیے یکسو ہو کر پوری قوت کے ساتھ کام کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے، کس قدر عجیب بات ہے کہ اسلام

کے لیے جدوجہد کا یہ بے پناہ عزم اور یہ پُر جوش ولولہ ان کے سینے میں موج زن ہوتا ہے، امریکہ کے انسانیت سوز اور ایمان دشمن ماحول میں ہیں۔ سید صاحب ۱۹۵۱ء کے آغاز میں مصر واپس آگئے۔ اور اب یہاں سے سید صاحب کی زندگی کا نہایت اہم موڑ شروع ہوتا ہے۔ مصر واپس آکر انہوں نے امریکی نظام تعلیم پر بے لاک تنقیدیں شروع کر دیں، اور دعویٰ کیا کہ یہ سارے نظام فطرت کو بگاڑتے اور انسان کی شخصیت کو برباد کرتے ہیں، انہوں نے مصر کی وزارت تعلیم کے سامنے تعلیمی امور کے سلسلے میں کچھ اسلامی سفارشات بھی رکھیں۔ سید صاحب کی باتیں اور ان کی سفارشات سن کر وزارت تعلیم کے کچھ افراد تو بالکل ششدر رہ گئے کہ وزارت تو انہیں بھیجتی ہے تاکہ امریکہ کے نظامہائے تعلیم و تربیت کا مطالعہ کریں، اور وہ واپس آکر اپنی نظاموں کی تنقیص کرتے اور وزارت سے انہیں بدل دینے کا مطالبہ کرتے ہیں، ساتھ ہی وزارت نے غواش کی کہ وہ اپنی وسیع تر سرگرمیوں کو محدود کریں اور ذاتی افکار و نظریات کی اشاعت روک دیں۔ ظاہر ہے یہ مطالبہ سید صاحب کے لیے کیونکر قابل قبول ہو سکتا تھا، انہوں نے ۱۹۵۱ء کے آخر یا ۱۹۵۲ء کے اوائل میں وزارت تعلیم سے ہی علیحدگی اختیار کر لی۔

امریکہ سے واپسی پر سید صاحب نے اپنے کسی دوست کے سامنے تنظیم اسلامی کے قیام کے سلسلے میں ان عزائم کا اظہار کیا، جو وہ امریکہ سے لے کر چلے گئے اور اس سلسلے میں اپنے نقطہ نظر اور نقشہ کار کی بھی وضاحت کی۔ دوست نے اس موقع پر سید صاحب کے سامنے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ غرض سے ایک جماعت مصر میں اس مقصد کے لیے کوشاں ہے اور قریب قریب انہی خطوط پر بہت بہتر انداز سے سرگرم عمل ہے اور وہ ہے تحریک اخوان المسلمون بجائے اس کے کہ آپ کوئی نئی جماعت قائم کریں، اسی جماعت میں شامل ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ یہ جماعت پہلے سے منظم ہے اور

دعوتی میدان میں کام بھی کر رہی ہے۔ سید صاحب کے دوستوں نے یہ بھی بتا کھا تھا کہ امام حسن البنا نے ان کی کتاب طبع کرائی تھی اور اس کے لیے پیش لفظ بھی تحریر فرمایا تھا۔ امام حسن البنا کی شہادت اور اخوان پر منظام کی سرگزشت بھی ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔

چونکہ سید صاحب اپنے ان عزائم میں مخلص تھے اور یہ کام نیک نیتی سے محض رضائے الہی کی خاطر کرنا چاہتے تھے، اس لیے فوراً اخوان کے ساتھ ہو گئے۔ ان کے ساتھ مل کر دعوتی میدان میں کام کرنے لگے اور ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ سید صاحب نے اخوان کے سامنے امام حسن البنا کے بعض افکار سے اپنے اختلاف کا بھی اظہار کیا اور بعض دیگر امور کے سلسلے میں بھی اپنے موقف کی وضاحت کی پھر سید صاحب اور اخوان کے مابین افہام و تفہیم کی غرض سے ان مسائل پر گفتگو میں ہوئیں۔ اس طرح سید صاحب رفتہ رفتہ تحریک اخوان سے قریب تر ہوتے گئے اور اخوان کے ساتھ ان کی فکری ہم آہنگی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۲ء میں وہ باقاعدہ تحریک کے ممبر ہو گئے۔ نہ صرف ممبر بلکہ شعبہ نشر و اشاعت کے انچارج بھی بن گئے۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں وزیر اعظم نحاس پاشا نے ۳۶ء کا معاہدہ توڑ دیا۔ اب مصر میں جیسے ایک تہلکہ مچ گیا، ہر طرف ایک حشر پھا ہو گیا اور انگریزوں نے مصر کو ہلا کر رکھ دیا، جامع اذہر نیز دیگر مدارس اور یونیورسٹیاں فوجی چھاؤنیوں میں تبدیل ہو گئیں، جہاں اسلامی قومیت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ سارا مصر غاصبین کے لیے برق تپاں اور شعلہ سوزاں بن گیا اور انگریزوں کے خلاف جوانان اسلام کی باقاعدہ گویا جنگیں شروع ہو گئیں، سید صاحب بھی اس مسلم قومی تحریک کے ساتھ تھے اور زبان و قلم کے ذریعے اس کی طرف سے خوب خوب شعلہ افشائیاں اور بہاریاں کر رہے تھے۔

۱۹۵۱ء میں وزارت تعلیم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد سے سید صاحب

کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں۔ چنانچہ اس کے بعد ان کے قلم سے متعدد اہم تصنیفات منظر عام پر آئیں، جن میں ”معرکہ الاسلام والراسمالیۃ“، ”الاسلام بین الراسمالیۃ والشیوعیۃ“، ”الاسلام العالمی والاسلام“، خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ تو ان کی مستقل تصانیف میں درجہ مقالات اور تقاریر کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء میں میجر جنرل محمد مجیب کی قیادت میں اخوان اور

عوام کے ہاتھوں مصر میں انقلاب آگیا، اسی زمانے میں بعض مصری رسالوں نے سید قطب کو ہی انقلاب مصر کا ہیرو قرار دیا، کیونکہ ان کی کتاب ”معرکہ الاسلام والراسمالیۃ“ نمایاں طور پر ان اول تا آخر اسی روح کی حامل تھی اور واضح طور پر اسی جیسے انقلاب کی دعوت دے رہی تھی۔

۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۱ء میں مجلہ ”العالم العربی“، سید قطب کی نگرانی دسرپتی

میں رہا۔ اس طرح موصوف کی کوششوں سے وہ انتہائی شاندار قسم کا سیاسی و ادبی جریدہ بن گیا، جس کے سیاسی مضامین کا غیر ملکی حلقوں پر کافی اثر پڑتا تھا کہ غیر ملکی اخبارات میں بھی اس کے بہت سے مضامین کے ترجمے شائع ہوتے رہتے۔ پھر حزب انقلاب نے اسے بند کر دیا تو مجلہ ”الدعوة“، جو اخوان کے نام سے نکلا کرتا تھا، سید صاحب کے قلمی جہاد کا میدان بن گیا، اسی طرح قاہرہ اور اس کے علاوہ دیگر شہروں میں اخوان کے گھروں میں سید صاحب کی پرسوز تقریریں اور ایمان افروز مجالسیں ہوتی رہیں۔

سید صاحب تحریک دعوت اسلامی سے وابستہ ہوئے، تو دوسرے بھائی

بہنوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اس طرح اس پورے گھرانے کی سرگرمیاں دعوتی کاموں کے لیے وقف ہو گئیں، یہ لوگ دعوتی میدان میں جدوجہد کرتے اور شاندار ادب اسلامی کی تخلیق کرتے۔ یہاں تک کہ عربی ادب اسلامی میں بالکل ایک نئے رنگ کا اضافہ ہو گیا، سید صاحب کے بھائی محمد قطب

اور بہن امینہ قطب کے قلم سے متعدد ایسی کتابیں سامنے آئیں جنہیں بلاشبہ ادب اسلامی کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ رہیں حمیدہ قطب تو اگرچہ ان کی لکھی ہوئی کوئی کتاب ہمارے ہاتھوں میں نہ پہنچ سکی لیکن ان کی دعوتی سرگرمیاں انتہائی اہم اور ناقابل فراموش ہیں اور ان سارے ہی لوگوں کی رہنمائی و سربراہی کا سہرا بلاشبہ سید قطب کے سر ہے۔ پھر ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر نعید رمضان کے ہاتھوں ایک ماہنامہ "المسلمون" کا اجراء ہوا۔ سید صاحب اس کے خصوصی معاون یا اس کے سب سے بڑے مضمون نگار تھے، چنانچہ ادارہ "المسلمون" نے موصوف سے خواہش کی کہ وہ اس میں کوئی مستقل موضوع لکھیں۔ اس موقع پر سید قطب نے اپنے سابق انکشاف "قرآن میں تمثیل و تلمیح اور منظر کشی" کی طرف پھر توجہ کی اور اسی نظریہ کی بنیاد پر ایک تفسیر لکھنے کا وعدہ کیا۔ بس اسی تقریب سے سید صاحب کی عجیب و نادر تفسیر "فی ظلال القرآن" وجود میں آگئی۔

سفر امریکہ کے بعد سے سید صاحب کی کتاب زندگی کا ایک نہایت اہم باب شروع ہوتا ہے، اور وہ عالمی شہرت کے مالک بن جاتے ہیں۔ اب وہ متعدد اہم کانفرنسوں میں شرکت کرتے ہیں اور عالمی انجمنوں کی طرف سے انہیں دعوت نامے موصول ہوتے ہیں چنانچہ ۱۲/۳/۵۳ء میں مصر کی معاشرتی جائزہ کمیٹی نے انہیں بلایا، تاکہ دمشق میں منعقد ہونے والی معاشرتی کانفرنس میں اس کی طرف سے نمائندگی کریں۔ پھر ۱۲/۳/۵۳ء میں تحریک اخوان المسلمون کے مکتب الارشاد کی خواہش پر بیت المقدس میں ہونے والی اسلامک پبلک کانفرنس میں اخوان کی طرف سے نمائندگی کی۔ سید صاحب کی کتاب "دراسات اسلامیہ" (اسلامی مطالعے) سے ہم کو ان انجمنوں اور کانفرنسوں کے سلسلے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

۱۹۵۲ء میں جب مصر کے اندر انقلاب آیا تو اخوان المسلمون نے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق بہت سی اسکیمیں اور تجاویز پاس کیں۔ تعلیم، اصلاح

معاشرہ، صنعت زراعت، ہر چیز کے سلسلے میں منصوبے بنائے، انہی اسکیموں میں ایک زرعی اسکیم تھی، جو تحریک آزادی کے لیے ریٹھ کی بڑی کی خشیت رکھتی تھی۔ اسی طرح وہ سے فولاد سے بھی متعلق ایک صنعتی اسکیم اور تعلیم کے سلسلے میں خاصا وسیع پروگرام تیار کیا گیا۔ اس موقع پر جو اخوانی کارکن شعبہ تعلیم سے متعلق تھے، سید صاحب ان کے ساتھ ہو گئے، پھر ان لوگوں نے مل کر مصر میں دینی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ایک ایسا پروگرام بنایا جس میں ملک کے سارے رجحانات اور تمام نقطہ ہائے نظر کی پوری رعایت موجود تھی، مگر یہ تمام پروگرام اور یہ سارے نقشے و مذاقی کونسل کے طاق نسیاں کی زینت بن کر رہ گئے۔

۲۳ جنوری ۱۹۵۲ء میں حزب انقلاب نے بلکہ صحیح تر الفاظ میں جمال عبدالناصر نے ایک انجمن آزادی کی تشکیل کی پھر انجمن کی صدارت عظمیٰ نے سید صاحب سے خواہش کی، کہ وہ اس انجمن کے لیے باقاعدہ پالیسی اور پروگرام مرتب کر دیں۔ اور اسے اپنے مفید مشوروں سے نوازیں۔ اس سے سید صاحب کو امید ہوئی کہ شاید لوگوں کے اندر کچھ خیر کار حجان ابھر رہے، اور وہ خلوص کے ساتھ عوام کی تربیت کرنے میں کوئی مفید قدم اٹھانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر سید صاحب نے بڑے ذوق و شوق سے اس انجمن کی نہایت نفیس عوامی تنظیم کی، تاکہ وہ ایک مفید قسم کی عوامی انجمن بن سکے۔ اور اس طرح اسلام سے بد کے ہوئے عوام کچھ تربیت پاسکیں۔ سید صاحب ان کے سامنے اپنا تیار کردہ پروگرام پیش کر کے دمشق کے سفر پر چلے گئے۔ مگر بعد میں واپس آئے تو دیکھا کہ لوگوں نے سید صاحب کا پورا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے اور یہ انجمن آزادی منفعت کے پیجاریوں، اغراض کے بندوں اور ناکارہ انسانوں کا ایک ٹولہ بن کر رہ گئی ہے۔ سید صاحب نے یہ صورت حال دیکھی تو سخت آزدورہ ہوئے اور انتہائی قلق کے ساتھ ان کے سامنے اپنے اس تاثر کا اظہار کیا کہ وہ لوگ کوئی ایسی انجمن ہرگز نہیں بنانا چاہتے جس سے عوام کی کچھ خدمت ہو سکے، بلکہ ان کے پیش نظر تو کمیونسٹ

پارٹی کے نہج پر کسی ایسی تنظیم کا قیام ہے جو کچھ اور باتوں کو اپنے گرد جمع کر لے۔  
سید صاحب نے بالکل واضح انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا کہ حزب انقلاب  
کی نیٹیں ناپاک اور ارادے فاسد ہیں۔

۵۳ء کے نصف آخر میں اخوان نے سید صاحب کو مرکزی شعبہ نشر و اشاعت  
کا انچارج بنا دیا۔ یہ کام سید صاحب نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور  
اپنے علمی و تہذیبی تجربات سے دعوت کی خدمت اور اقصائے عالم میں اس کی  
توسیع و اشاعت کے سلسلے میں پوری طرح فائدہ اٹھایا، اور اب یہ بات راز  
نہیں رہی کہ اخوان کا کوئی ممبر خواہ وہ خوش حال ہو یا تنگ حال، جماعت سے  
کسی قسم کی اعانت یا تنخواہ لینے کا روادار نہیں ہوتا بلکہ سارے لوگ خود تحریک  
پر خاص اپنی جیبوں سے خرچ کرتے ہیں۔ سید قطب اور ان کے بھائی بہن بھی اسی  
راہ حکمت پر قائم رہے۔ یہ لوگ اپنا سارا اثاثہ تحریکی تقاضوں کے لیے وقف  
کر دیا کرتے۔

پھر اخوان کے دور ابتلا کا آغاز ہوتا ہے، اور جنوری ۱۹۵۴ء میں  
سید قطب اور ان کے اخوان قید و بند کا شکار ہو جاتے ہیں، مگر کچھ ہی عرصے بعد  
۲۵ مارچ ۱۹۵۴ء میں رہ کر دیئے جاتے ہیں۔ قید و بند کا یہ زمانہ مختصر رہا، قید  
کیے جانے والے بھی تھوڑے تھے اور اس قید و بند میں سختیاں اور اذیتیں بھی نہ  
تھیں، پھر ۵/۷، ۱۹۵۴ء میں تحریک اخوان کی قیادت نے سید قطب شہید  
کو ہفت روزہ "الاخوان المسلمون" کا چیف ایڈیٹر بنا دیا مگر ابھی کچھ ہی دن وہ  
یہ خدمت انجام دے سکے تھے کہ ۱۰، ۹، ۵۴ء میں یہ رسالہ خلاف قانون  
قرار دے دیا گیا۔

پھر ۲۶ اکتوبر ۵۴ء میں جمال عبدالناصر نے دنیا کے ایٹم پر ایک ڈرامہ  
پیش کیا جس کے بعد اخوان کی زد و کوب شروع ہو گئی اور ہزاروں اخوان آہنی  
سلاخوں کے پچھے ڈال دیئے گئے۔ سید صاحب بھی آخر اکتوبر ۱۹۵۴ء میں نظر بند



کر دیے گئے اور نہایت وحشیانہ مظالم کا تختہ مشق بنا گئے۔ اسی دوران ۳ ہزار  
 اخوان عدالت میں پیش کیے گئے۔ سید قطب شہید اور دیگر عملے تحریک بھی ان  
 میں شامل تھے۔ پھر یکایک ایذا سانیوں کا سلسلہ رک گیا، عدالتی کارروائیاں رک  
 گئیں اور اب نرمی، رواداری اور تشویق و ترغیب کی کمندیں پھینکی گئیں۔ کتنے ہی  
 اہل قلم . . . . . اور اباب علم و فضل اچھے اچھے مقالے لکھتے اور اسلام کے سلسلے  
 میں نہایت عمدہ عمدہ کتابیں تیار کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ چیز بڑی ہی مسرت انگیز اور  
 انتہائی خوش آئند ہے۔ لیکن ان اہل قلم اور اباب علم و فضل کا سختیوں اور آزمائشوں  
 کے طوفان میں بھی ڈٹا رہنا ان سے بھی آگے کی منزل ہے۔ یہی بے پناہ  
 صبر و استقامت دراصل ایمان اور مردانگی کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ یہی چیز ہے جو  
 تاریخ کا دھارا موڑ دیتی اور زندگی کی تاریک وادیوں میں امتوں اور قوموں کے لیے  
 روشنی کا منارہ ثابت ہوتی ہے۔ بلاشبہ اس طرح کے افراد تھوڑے اور نایاب  
 ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں یہی تاریخ ساز اور عہد آفرین ہوتے ہیں۔

سید صاحب کی نیت خالص اور بے لوث تھی۔ اس لیے وہ بھی انہی گئے  
 چنے افراد کی صف میں آگئے۔ جنھوں نے گول کے خون اور قلم کی روشنائیوں  
 سے تہاں اسلام کی آبیاری کی اور مال و ثروت کی پھواروں سے اسے تازگی و شادابی  
 بخشی، ان نفوس قدسیہ کو کیسی کیسی دھکیاں دی گئیں کہ بڑے بڑے سوراخوں کے  
 دل دہل جائیں اور مال و دولت اور جاہ و منصب کی کیسی کیسی دل ربا اور زہد شکن  
 حوریں پیش کی گئیں، جن کے ذکر سے ہی اچھے اچھوں کے منہ دل سے رال ٹپکنے  
 لگے، مگر ان نفوس کی لگا ہوں میں یہ ساری چیزیں بیچ تھیں۔ ان درندہ خصلت ظالموں  
 نے عدالتی کارروائیاں نومبر ۱۹۵۴ء سے جون ۱۹۵۵ء تک کے لیے مؤخر کر دیں،  
 اس درمیانی مدت میں وہ طرح طرح سے سید صاحب پر ڈورے ڈالتے رہے۔  
 کہ کسی صورت سے وہ اخوان سے علیحدگی اختیار کر لیں اور کسی اخبار میں محض درجے  
 شائع کر دیں کہ ”اخوان سے اب ان کا کوئی تعلق نہیں اب تک ان کے سلسلے میں

وہ فریب میں تھے " سید صاحب کو پورا یقین دلایا گیا کہ اگر وہ اس پر آمادہ ہو جائیں تو نہ صرف یہ کہ جیل سے رہا کر دیے جائیں گے بلکہ وزارت تعلیم یا وزارت ثقافت کی کرسی ان کے لیے خالی کر دی جائے گی اور اگر چاہیں گے تو قومی پیشوائی کی مسند بھی انہی کی جلوہ گاہ بنے گی۔ سید صاحب فوجی جیل کے بیرک نمبر ۲ میں تھے تو صدر ناصر کے آدمی برابر آتے اور باصرار انھیں اپنے موقف سے ہٹانا چاہتے مگر سید صاحب نے ان کی ہر پیش کش کا جواب ٹھوکر دل سے دیا۔ اتنا ہی نہیں عبدالناصر کے کسی ایلچی نے جب یہ کہا " استاذ سید! آپ تو اخوان میں نہ تھے، بد بختوں کی جماعت کے سلسلے میں آپ کیوں اس قدر سخت ہیں، جب کہ ان سے آپ کا کوئی علاقہ بھی نہیں؟! تو سید صاحب غصہ سے بے تاب ہو گئے اور فوراً ان کی زبان سے نکلا۔ " اخوان کیوں بد بخت ہوتے؟! بد بخت تو وہ لوگ ہیں جو ان خدا پرستوں کی دشمنی میں اندھے ہو چکے ہیں۔ اخوان کے سلسلے میں سوائے خیر و صلاح کے میں کچھ نہیں جانتا اور میں تو اخوان کے انتہائی خاص اور اہم لوگوں میں سے ہوں۔ میں تو مرکزی شعبہ نشر و اشاعت کا انچارج بھی رہ چکا ہوں، جبکہ یہ مرکز کا انتہائی اہم شعبہ ہے۔" ناصر کے ایلچی نے کہا! " اگر ایسا ہوا بھی، تو محض ایک سال کے لیے اور ایک سال کی مدت بھی کیا مدت ہوئی، سید صاحب نے کہا! دعوت کی طرف اتنا بے لگائی سے کسی طویل مدت کی ضرورت نہیں، یہاں تو چند لمحے بھی کسی کو وابستگان تحریک بلکہ شہدائے دعوت میں شامل کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ اس موقع پر سید صاحب نے اس تاریخی واقعہ کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ غزوہ یتیم میں کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سیاہ فام چرواہے نے جہاد کیا اور جام شہادت ہونٹوں سے لگائے ہوئے جنت الفردوس میں پہنچ گیا، جبکہ وہ کافی دن چڑھے ایمان لایا اور ظہر سے پہلے ہی پہلے جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ اس طرح اسلام میں اس کی مدت عمر کل تین گھنٹے کے لگ بھگ تھی۔"

ناصر کے ایلچی نے کہا۔ "استاذ! ہم محض یہ چاہتے ہیں کہ ملک مصر آپ کے وسیع علم و فضل، وافہ تجربات اور گہری تحقیقات و معلومات سے محروم نہ ہو۔ ورنہ ہم آپ سے حلقہ کفر میں آنے یا دین سے مرتد ہو جانے کے لیے تو کہہ نہیں رہے ہیں۔ ہم تو محض آپ کے علم و فضل اور آپ کی اسلام پسندی ہی کی وجہ سے آپ کے اس قدر متمنی ہیں۔ خدا را خود کو جیل کی کال کوٹھری میں مت سڑائیے ملک و ملت کو اپنے علم و فضل سے محروم مت کیجئے" سید صاحب نے پوری بے خوفی سے فرمایا: تو یہ ایک نرا دعویٰ ہے، ورنہ تمہیں میرے علم اور میرے دین سے کیا دلچسپی؟ اتنم تو بس ہمیں رسوا اور بے آبرو کرنا چاہتے ہو، تمہاری کوشش یہ ہے کہ میرے دوستوں سے مجھے ٹکرا دو۔ اس سے قبل انجمن آزادی کی تنظیم کے سلسلے میں تم سب کا میں تجربہ کر چکا ہوں۔ میرا احساس ہے کہ تمہیں خیر سے کوئی رغبت نہیں۔ تمہیں تو بس ایک بھیڑ چاہیے جو تالیاں تو بجائے مگر عقل سے کوری ہو، نعرے تو لگائے مگر فہم سے عاری ہو، میں نے تعلیمی اصلاحات کے لیے کئی پروگرام رکھے تھے مگر وہ تم لوگوں کے لیے قابل قبول نہ ہوئے اور انہیں بالکل ہی مہمل سمجھ کر وہی کئی ٹوکری میں ڈال دیا گیا، تمہیں لوگ تو ہو کہ مجھ کو بر بنائے ستم جیل میں پھینک دیا۔ ورنہ اس کے علاوہ میرا اور کیا جرم ہے کہ میں دعوت اسلامی کا علمبردار ہوں؟ ناصر کے ایلچی نے پھر اپنی بات دہرائی۔ "استاذ! بس دو سطر میں آپ اخبار میں شائع کرادیں، ان ساری آفتوں سے آپ کو نجات مل جائے گی۔" سید صاحب نے پوری بنجیدگی سے کہا۔ حالانکہ وہ جیل میں تھے۔ ناصر کا ایلچی ان کے سامنے تھا۔ اور موت بے حجابانہ ان کی نگاہوں کے سامنے رقصاں تھی "مجھے حیرت ہے ان نادانوں پر جو کسی بے گناہ پر مشق ستم کریں۔ پھر اس سے خواہش کریں کہ وہ انہی ظالموں اور مجرموں کی بے گناہی کا چرچا کرے۔ خدا کی قسم، اگر مجھے یقین ہو جائے کہ اس طرح کے جملے مجھے پھانسی کے پھندے سے بچالیں گے۔ تب بھی میں انہیں زبان پر لانے کا روادار نہیں۔ میں تو اسی بات کو ترجیح دوں گا کہ

اپنے رب سے جا ملوں، اس طور سے کہ میں اس سے راضی ہوں اور وہ بھی مجھ سے خوش ہو۔“ ساری ترغیبات سے بے نیاز اور ہر قسم کی دھمکیوں سے بے پروا مومن قیدی کی طرف سے یہ ایک زور دار طمانچہ تھا۔ اس طمانچہ کی ضرب نامہ کے ایلچی نے براہ راست اپنے رخصتوں پر محسوس کی۔ وہ سید صاحب کی طرف سے مایوس ہو گیا اور پھر دوسری بار اخوانیوں کے ساتھ سید صاحب کو بھی عدالت کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

چنانچہ ۱۲، ۱۹۵۵ء میں عوامی عدالت نے ان کے خلاف ۱۵ سال قید با مشقت کا فیصلہ صادر کیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دعوتِ حق کے علمبردار تھے، تحریکِ اسلامی کا ساتھ چھوڑنے اور وزارت کو قبول کر لینے کی پیش کش کو انہوں نے پوری بے نیازی سے ٹھکرا دیا تھا۔

یہ فیصلہ صادر ہونے کے بعد سید صاحب فوجی جیل سے لیمان طرہ کے جیل خانے میں پہنچا دیئے گئے پھر وہاں سے مہر کے عام جیل خانے میں منتقل کر دیئے گئے۔ جیل کے اندر ہی سید صاحب نے اپنی مشہور تفسیر ”فی ظلال القرآن“ کی تکمیل کی، اس کے علاوہ آخری دور کی متعدد کتابیں بھی وہیں تیار کیں، مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ جیل خانے کے نظم یا اس متمرّد فرعون کے کسی لطف و کرم کا کرشمہ تھا اور نہ یہ غلط فہمی ہو کہ جیل میں رہنے والے اخوانیوں کو اطمینان کا سانس یا آزادی کا کوئی لمحہ بھی میسر تھا، کیونکہ وہاں تو جیل خانوں میں بے گناہ اخوان کے لیے بس حوصلہ شکن آزمائشیں تھیں، اور زہرہ گلزابتلائیں اور ان سب کی تہ میں جو ناپاک جذبہ کارفرما رہا ہے، وہ بس یہ ہے کہ یہ پروا کے شمع ہدایت سے دور ہو جائیں۔ اور اخوت و مودت کے جو استوار رشتے ان کے مابین قائم ہوئے ہیں وہ پارہ پارہ ہو جائیں۔ ظاہر ہے ایسے بدیاظن افراد سے اس طرح کی نیک نفسی کی توقع کیونکر کی جاسکتی ہے؛ سید صاحب کی کتابیں تو دراصل ان رقموں کا کرشمہ تھیں جنہیں سید صاحب اور دوسرے بہت سے اخوان جیل کے اندر خود اپنی جیبوں سے

ادا کر کے بہت سی سہولتیں اور مراعاتیں حاصل کر لیا کرتے تھے، اخوان اپنی خاص جیبوں سے محض دین اور دعوت دین کی خاطر جو رقمیں جیلروں کو ادا کرتے تھے بس انہی کا نتیجہ تھا کہ انہیں ان امور کے سلسلے میں کچھ سہولتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ ورنہ ان اخوانیوں کی حالت تو بڑی ہی دردناک تھی۔ جو عام جیل خانوں میں تھے اور جن پر خصوصی طور پر فوج کا ہمہ وقتی پہرہ رہا کرتا تھا۔ بہر کیف سید صاحب کی یہ کتابیں مصر اور بیرون مصر میں خوب شائع ہوتی اور پھیلتی رہیں۔ کیونکہ حالیہ مصری فرعونیت کی نگاہ میں اس وقت کتابوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ تو اس انداز سے سوچنے کی عادی تھی کہ اگر لوہا، بارود اپنے ہاتھوں میں ہے، جیل خانوں کی کوٹھریاں اپنے قبضہ میں ہیں اور سرانجام رساں محکمے پوری طرح مستعد اور چاق و چوبند ہیں تو یہ کاغذی سفینے کیا بنا بگاڑ سکتے ہیں۔

اخلاص، نکتہ چینی کی بلندیوں پر بسیر کرنے والے افراد کا موقف بھی کس قدر تعجب خیز ہوا کرتا ہے۔ صدر مملکت کا خاص ایلچی کس طرح منت سماجت کرتا ہے کہ اخوان اور تحریک اخوان سے اعلان برأت کر کے سید صاحب جیل سے باہر آجائیں اور جیل کی اذیتوں کے مقابلے میں وزارت کی آسائشوں سے محظوظ ہوں لیکن سید صاحب پوری شان بے نیازی سے یہ پیش کش ٹھکرا کر دیتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف سنگدل جلا دلوں کی بے رحم تلواریں ان کی گھات میں ہیں اور موت اپنی پوری خونخوئیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے رقصاں ہے۔ بلاشبہ تنہا یہی موقف زمانے کے ہزاروں انقلابات کے باوجود کسی شخص کو فرود دام دوام بخشنے کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم مزید کچھ نہیں کہنا چاہتے قاری کے فکر و فہم پر اعتماد کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۴ء تک کا طویل عرصہ سید صاحب کو جیل کی وحشتناکیوں میں ہی گزارنا پڑا۔ یہاں تک کہ شاہ عراق عبدالسلام عارف بیچ میں پڑے اور سید صاحب کو بازیابی صحت کے نام پر رہائی مل گئی جبکہ جیل میں انتہائی ماتم رنگیز

اور شرمناک مظالم سہتے سہتے سید صاحب نہایت مہلک بیماریوں کا شکار ہو چکے تھے۔ دس سال کے بعد سید صاحب گھر پہنچے تو حکومت وقت کے ذمہ دار ترین لوگوں میں سے ایک شخص آپ کے پاس آیا اور بولا آپ کا فرض ہے عالی جاہ مملکت جمال عبدالناصر سے ملاقات کی درخواست کریں نیز ان کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کریں کہ انہوں نے آپ کے ساتھ درگزر سے کام لیا۔

سید صاحب نے پوری جرأت سے جواب دیا، جبکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ جواب صدر ناصر کے کانوں تک پہنچ کر رہے گا، ”میں اس ہاتھ سے مصافحہ کیسے کروں جو بے گناہ اخوان کے خون سے رنگین ہے؟!! پھر میں نے تو درگزر کرنے یا رہائی دینے کی خواہش کی نہیں تھی“ سید صاحب کا یہ جرأت مندانہ جواب سن کر وہ ذمہ دار افسر ہٹکا بگاراہ گیا اور پھر اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا اسیر کے دور میں سید صاحب کی کتابیں برابر چھپتی رہیں، بار بار چھپتی رہیں اور نہ صرف عالم اسلام بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی پوری تیزی سے پھیلتی اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتی رہیں، چنانچہ ان سے اور ان کے علاوہ دیگر کتابوں سے ایک وسیع حلقہ میں انتہائی پر زور اسلامی شعور بیدار ہو گیا۔ ان کتابوں نے بے پناہ اکثریت کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان فکر اسلامی کی شمع دل افروز پر پردانہ دار ٹوٹ پڑے۔ مصر میں اس سرچھڑے طاغوت کی سرپسندیوں، فتنہ انگیزوں اور قید و بند کی ناقابل برداشت سختیوں کے باوجود ان کتابوں کا سخت رد عمل ہوا۔ جبکہ اشتراکی تنظیم کی برانچوں میں اشتراکی کتب و رسائل کی گڈیوں پر گڈیاں لگی ہوئیں، اور کہ انہیں پوچھنے والا نہ ہوتا۔ حالانکہ یہ کتابیں اور رسالے بالکل مفت تقسیم کیے جاتے بلکہ کتنوں کو زبردستی لینے پر مجبور کیا جاتا۔ چنانچہ وہ بے شوقی کے ساتھ انہیں لیتے اور لے جا کر گھر کی انگیٹھیوں میں ڈال دیتے یا پھر یہ رسالے اور کتابیں صیوں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر سستے داموں بیچ دی جاتیں اور وہاں ان کے اوراق پڑیاں باندھنے کے کام آتے۔

بہر کیف مسلم عوام بالخصوص اسلام سے نا آشنا جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اندر ان دینی کتابوں کے اثرات جیہ نمایاں طور پر محسوس کیے جانے لگے تو طواغیت کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ یہی طرح بیچ و تاب کھانے لگے اور پھر وہ سب کچھ ہوا جسے بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ انہی دس مہینوں میں جو سید صاحب نے جیل سے باہر انتہائی کڑی نگرانی میں رستہ ہونے گزارے۔ اپنی آخری کتاب ”معالم فی الطریق“ اور ان کے چھوٹے بھائی محمد قطب نے اپنی شاہکار تصنیف ”جاہلیۃ القرن العشرین“ تیار کی۔

سید قطب کی سرگزشت کے سلسلے میں ہم نے کافی دراز نفسی کام کیا۔ اب ہم چاہتے ہیں، اس مسلم گھرانے کے بقیہ افراد کا بھی کچھ تعارف کرائیں جو شدید ابتلا عن گناہ شکار ہوئے اور ان میں سے تین شہادت کے رتبہ بند۔ سے بھی سر فرار ہوئے۔ ہاں تو اس مسلم گھرانے کے دوسرے فرد الازہار محمد قطب ہیں، جن کے سلسلے میں الازہار ذلال الفاسی کا یہ تاثر سامنے آیا ہے۔

”میں اس شخص کو سرزمین مصر کا پہلا اسلامی منکر سمجھتا ہوں، جس کو صحیح معنوں میں خطاب زیب دیتا ہے“ اس موقع پر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ محمد قطب ایک عظیم منکر ہی نہیں، وہ ایک سرگرم داعی اسلام بھی ہیں جن کی پوری زندگی جہاد میں گزری۔ انھوں نے قلم سے بھی جہاد کیا، مال سے بھی جہاد کیا، جان و دل سے بھی جہاد کیا، وہ ۱۹۵۲ء میں جیل گئے پھر ۱۹۵۶ء میں رہا ہوئے۔ اس سے قبل وہ وزارت تعلیم میں شبہ ثقافت کے انچارج بھی رہ چکے تھے۔ ان کے شعلہ بار قلم سے اسلامی موضوعات پر انتہائی اہم اہم تصنیفات سامنے آئیں، جن میں سب سے آخری تصنیف جاہلیۃ القرن العشرین“ ہے۔ اس کے علاوہ سید صاحب کی کتابوں کی طباعت کا اہتمام بھی یہی کرتے، بہن امینہ قطب کے باطل سوز قلم سے بھی متعدد ادبی کتابیں ہمارے ہاتھوں میں پہنچیں جو انتہائی جان دار اور حرارت ایمانی سے بھر پور۔

ہیں۔ بہن حمیدہ قطب کے قلم سے نکلی ہوئی کوئی کتاب تو ہم تک نہ پہنچ سکی، لیکن دعوت دین کے سلسلے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، اخوانی گھرانوں کی غمگساری و دستگیری کے سلسلے میں بھی ان کی سرگرمیاں ہمارے لیے ایک بہترین اسوہ ہیں۔ اس مثالی کنبہ کے پانچویں فرزند شہید رفعت بکر شافعی ہیں، جو سید صاحب کی بڑھی بہن کے لائق فرزند تھے۔ دعوت دین کی سرگرمیوں اور جہاد کی آزمائشوں میں یہ بھی آخر دم تک اپنے ان بزرگوں کے ساتھ رہے اور بالآخر ان کے ساتھ وہ بھی اسی راہ میں شہید ہو گئے۔

اس متبرک اور تقدس بد اماں کنبہ نے عالی شان اداروں کے اندر نرم و گداز غالیچوں پر بیٹھ کر سکون و عافیت کی روح پر در فضاؤں میں قلم کے رگڑنے اور فکر و خیال کے ناخن کھسے کو پسند نہ کیا کہ اس طرح وہ لوب حاضر کی تجارت گاہ میں اپنی کاوشیں پیش کر کے لوگوں کی واہ واہ سے محظوظ ہوتا اور گھر میں دولت و ثروت کے ڈھیر لگا لیتا۔ نہیں — اس نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ اس نے پورے اخلاص کے ساتھ دعوت حق کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس کے برعکس اس نے راہ خدا میں سر فرود شانہ جہاد کیا اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا، اس نے شاندار فکری کاوشوں کے ساتھ ساتھ انتہائی مکمل شکل میں عملی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں، اس نے دعوت دین کے تمام پہلوؤں پر توجہ دی، اس نے اپنا سارا اثاثہ راہ خدا میں لٹا دیا۔ اس نے مجوس و غیر مجوس اخوانی گھرانوں کی غمگساری و دستگیری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، وہ برابر ان کی اشک شونی اور دلجوئی کرتا رہا کہ یہ گھرانے منتشر نہ ہو جائیں، کہیں ہمت ہار کر بیٹھ نہ رہیں کہ اس طرح اس سر پھرے طاغوت کی آرزو پوری ہو جائے، یہی اسباب ہیں کہ اخوان پورے صبر و تحمل کے ساتھ قید و بند کی ساری اذیتیں جھیلتے رہے اور سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی ہمت و عزیمت کا پہاڑ ثابت ہوئے۔ یہاں تک کہ یہ تحریک، اس کا بے پناہ جوش و خروش پریشانی و تنگ حالی میں بھی اس کی مثالی اخوت، نازک سے نازک موقع پر بھی اس کا بے پایاں



جذبہ ایشاد و سخاوت، یہ ساری چیزیں لوگوں کے لیے عجوبہ بن گئیں۔ چنانچہ ان باتوں نے بے شمار دلوں اور ذہنوں کو دعوتِ اسلامی کی طرف کھینچ لیا اور وہ تحریکِ اخوان کے سرگرم کارکن بن گئے۔

وَمَا يَفْلَهُ جُنُودَ رَبِّكَ  
إِلَّا هُوَ  
اور تمہارے رب کے لشکروں کو تو وہی جانتا ہے۔

اور یہ ہماری بہنیں ہی ہیں جن کا اس مثالی کردار میں زیادہ ہاتھ رہا ہے۔ اسی لیے دشمنِ خدا ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گیا تاکہ وہ ان سے اپنی ناکامیوں کا انتقام لے اور دہشت انگیزی کر کے اخوانی خواتین اور اخوانی بچوں کو گرد کی طرح اڑا دے۔ وہ چاہتا ہے کہ ان کے گھرانوں میں خاک اڑنے لگے اور ان کی دعوت کے شیرازے بکھر جائیں۔ اس کی آخری تمنا یہ ہے کہ اس مضبوط و محکم رسی کے ریشے منتشر ہو جائیں اور لوگ دینِ اسلام سے ناپٹ توڑ لیں کہ اس طرح دینی شعور اور اسلامی اقدار کا جنازہ اٹھ جائے۔ باطل کے خلاف اسلام کی معرکہ آرائیوں سے نجات مل جائے، اشتراکیت کی جنس کس مخر کی، بازارِ انسانیت میں مانگ بڑھ جائے اور نعوذ باللہ اسلام جیسی متاعِ بے بہا کا کوئی پوچھنے والا نہ رہ جائے۔ بلاشبہ ناصر کی آنکھیں اسی طرح ٹھنڈی ہو سکتی ہیں مگر حیف ہے اس عقل و دانش پر! احمق سے پیچھے آزمائی کر کے وہ چاہتا ہے، اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لے۔ !!!

یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور بجھا دیں، حالانکہ اللہ مان نہیں سکتا۔ جب تک وہ اپنے نور کا تمام نہ کرے، کافر خواہ کتنے ہی جبریز ہوں۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفَؤُا نُّورَ اللَّهِ  
بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ  
يَتِمَّ نُورُهُمْ لَأَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ

چند سال پہلے کی بات ہے، جبکہ مصر پر ناصر آتشیں گولوں اور آہنی سلاخوں کے بل پر حکومت کر رہے تھے اور مصری عوام کو کھینچنے، عرب ممالک کی کمر توڑنے اور عالمِ اسلامی کے پرزے اڑانے کے لیے نہایت خطرناک اسکیم چلا رہے تھے وہ پورا زور لگا رہے تھے کہ خدا نخواستہ — نہ صرف مصر بلکہ پورے عالمِ اسلام سے

اسلام کا چراغ گل کر کے خدا کا نور مٹادیں، اس وقت انھوں نے امریکی دانشوروں اور اشتراکی لیڈروں کی رہنمائی میں بڑی عیاری کے ساتھ اپنی اس اسکیم کا آغاز کیا۔ انھوں نے سب سے پہلے تو عرب قومیت کا نعرہ لگایا۔ پھر وہ اپنے اصل رنگ میں آگئے۔ اور اشتراکیت کا راگ الاپنے لگے۔ اور نو نہالان اسلام کو یہ باور کرانا چاہا کہ یہ اشتراکیت اسلام کے خلاف نہیں، بلکہ عین تقاضائے اسلام ہے۔ انھوں نے اشتراکی یونین بھی بنائی اور مصر میں اشتراکی انقلاب لانے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، اشتراکی لیڈروں نے بھی اپنی پُر خباثت چالوں اور طویل تخریبی تجربات سے ناصر کی اس ناپاک اسکیم کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی۔ حتیٰ کہ عبدالناصر کو یقین ہو گیا کہ بس چند ہی دنوں میں مصر کمیونزم کا گوارہ بنا جاتا ہے، لیکن تحریک اشتراکیت کی کامیابی کے لیے کئی سال تک جان توڑ جدوجہد کرنے کے بعد اشتراکی لیڈروں سی۔ آئی۔ ڈی کے افسروں اور خبر رساں ایجنٹیوں کے بیانات سے عبدالناصر کو اندازہ ہوا کہ مصری عوام اشتراکیت کی زہر آلود گولیاں حلق سے اتارنے کے لیے تیار نہیں، اور وہ پوری شدت کے ساتھ اس کی راہ میں مزاحم ہو رہے ہیں، حتیٰ کہ اشتراکی یونین کے بعض ممبر بھی اس سے بے زار ہو چکے ہیں۔ اور اس سلسلے کی ساری کوششیں رائگاں جا رہی ہیں۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام اور اسلام سے وابستگی ہی اشتراکیت کی راہ کا سب سے بڑا روڑہ ہے۔ یا بالخصوص جو افراد تحریک اخوان کے ممبر ہیں، وہ تو اس کے لیے شدید خطرہ ہیں۔ اور باوجودیکہ ان کی کوئی جماعت یا باقاعدہ تنظیم نہیں پائی جاتی، لیکن ان کی کارکنوں میں ڈھلی ہوئی کار تو ہیں، تو کسی پارٹی یا تنظیم سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو رہی ہیں یہ کتابیں اس سلسلے میں بڑا ہی اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ عوام اور بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نوجوان تو ان پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ لہذا یہ کتابیں ان کے لیے انتہائی زبردست ناکامی کا پیش خیمہ ہیں۔ چنانچہ عبدالناصر اور ان کے فتنہ پرور حاشیہ نشین پیچ و تاب میں پڑ جاتے ہیں، اور متفقہ طور پر یہ سازش کرتے ہیں کہ مصر میں اخوان کے نام پر اسلام کے ہی حلقوم پر چھری

رکھ دی جائے، اسلامی کتابوں کی اشاعت روک دی جائے، ان کے خلاف زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈا کیا جائے، نیز خواتین اور نوجوانوں پر یہ الزام لگا کر انھیں نظر بند کر دیا جائے کہ وہ حکومت مصر کا تختہ الٹنے کی سازش میں ملوث ہیں۔ چنانچہ عبدالناصر اگست ۱۹۵۵ء میں ماسکو جاتے ہیں اور وہیں سے اخوان کے خلاف نہایت سنسنی خیز پیغام نشر کرتے ہیں۔ ماسکو سے عبدالناصر کا یہ اعلان ان کے ارمانوں کو سمجھ لینے کے لیے کافی ہے۔ پھر اعلان کے بعد ہی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہو جاتی ہیں ایک ہزار سے زائد توفیق عورتیں ہی قید و بند کا شکار ہوتی ہیں اور ان بے گناہ قیدیوں میں آل قطب بھی شامل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے اگست ۱۹۶۵ء میں بھائی محمد قطب اسیر ہونے۔ جبکہ وہ گرمیاں گزارنے کی غرض سے راس العریض میں قیام پذیر تھے۔ بھائی محمد قطب کی گرفتاری پر سید صاحب نے خطوط اور رسالوں کے ذریعے احتجاج کیا۔ پھر چند ہی دنوں بعد سید صاحب اور بہن حمیدہ بھی اسی پٹیٹ میں آگئے اور بہن امینہ کو بھی جلد ہی گرفتار کر لینے کی دھمکی دی گئی پھر سید قطب، محمد قطب، حمیدہ قطب اور ان دونوں کی کتابوں بالخصوص محمد قطب کی کتاب جاہلیۃ القرن العشرين اور سید قطب کی کتاب "معالم فی الطریق" کے خلاف تشہیر کی پر زور مہم شروع ہو گئی۔ ہمارے کانوں نے اس وقت پہلی بار سنا کہ جس حکومت نے ان دونوں کتابوں کی مصر اور بیرون مصر میں نشر و اشاعت کی اجازت دی، وہی حکومت ان دونوں کتابوں کے خلاف ہنگامہ بپا کرتی اور پھر انھیں ضبط کر لیتی ہے۔

مصر کی متعدد جیلوں میں یوگوسلاویہ، جرمنی اور مصر کے نہایت ماہر اور سنگ دل جلاورکھے گئے جو اخوان پر نئے نئے مظالم ڈھاتے اور نئی نئی ترکیبوں سے انہیں اذیت پہنچاتے بقیہ مظلوم اور بے بس اخوان کی طرح آل قطب بھی انہی ظالموں کے صید زبون بنے رہے۔ ایک بار وہ وحشی بہن حمیدہ پر مشتق ستم کر رہے تھے، اسی حالت میں ان کے بھانجے شہید رفعت شافعی وہاں لائے گئے کہ

وہ خالہ کی بے قرار یوں کا نظارہ کریں۔ نیک دل اور غیرت مند بھانجے سے خالہ کی یہ کیفیت دیکھی نہ گئی۔ انھوں نے دفاع کی کوشش کی نتیجہ معلوم تھا، ظالموں نے خالہ کے سامنے بھانجے کو ٹھنڈا کر دیا۔ اس طرح بہن حمیدہ نے خود اپنی آنکھوں کے سامنے بھانجے کو انتہائی بے بسی کے عالم میں دم توڑتے ہوئے دیکھا، جبکہ وہ خود اس ضعیفی میں انتہائی لرزہ خیز مظالم کی چکی میں بس رہی تھیں۔

ان جاں گسل اور وحشیانہ مظالم میں گھرے ہونے کے باوجود عدالت میں بھی اخوان نے اسی جرات و بے باکی کا مظاہرہ کیا، جو ہمیں حضرت سعید بن جبیرؓ کے یہاں نظر آتی ہے، اسی طرح جیل میں نظر بند خواتین نے جس ہمت و شجاعت اور جس حق گوئی و بے خوفی کا ثبوت دیا وہ نہایت مجر العقول ہے اگرچہ یہ ساری عدالتی کارروائیاں بہت ہی پراسرار انداز سے انتہائی دیر پر دوں کے پیچھے ہوئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود خاصی خبریں چھین چھینا کر باہر آگئیں۔ اور عدالت کے سامنے اخوان نے جو موقف اختیار کیا، اس کی بہت سی تفصیلات عالمی اخباروں اور ریڈیو اسٹیشنوں نے نشر کیں۔ اس موقع پر سید صاحب کا موقف بھی حق گوئی و بے باکی کا ایک مثالی نمونہ تھا، وہ نہایت بے خوفی سے اپنے دین، اپنی تحریک اور اپنے اخوان کا دفاع کرتے رہے اور نظروں کے سامنے رقص کرتی ہوئی موت کے خونناکیوں سے ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔

عدالت نے حال کیا: کیا یہ بات صحیح ہے کہ آپ حکومت کا تختہ الٹنے اور صدر ناسر کو قتل کر دینے کی سازش کر رہے تھے؟

”ایسی تو کوئی بات نہ تھی۔ البتہ تمنا ضرور تھی، کاش میرے پاس قوت ہوتی تو میں ایسا کر ڈالتا“ سید صاحب نے پوری بے خوفی سے جواب دیا۔ سید صاحب نے مزید وضاحت کی کہ جن مقاصد کے تحت انقلاب آیا تھا، ان کے سلسلے میں ناصر کا کیا کردار رہا اور اس معاملہ میں اس نے کتنی زبردست خیانت کا ثبوت دیا۔ سید صاحب نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا کہ اخوان اور حزب انقلاب

کے درمیان انقلاب سے پہلے جو معاہدہ ہوا تھا اس کو کس طرح نظر انداز کر دیا گیا۔ نیز اخوان کے معاملہ میں ناصر نے جو قید و بند اور ظلم و ستم روا رکھا، وہ ایک المناک وطنی سانحہ بھی تھا اور کیونزیم اور سامراج کے ساتھ نہایت شرمناک گٹھ جوڑ بھی۔ صدر عدالت نے اگرچہ بیچ بیچ میں سید صاحب کی زبان روک دی اور انہیں پوری بات کہنے کا موقع نہ دیا، پھر بھی سید صاحب پر جو پانچ الزام لگائے گئے تھے، سید صاحب نے پوری بیباکی سے ان کی اصل حقیقت ان کے سامنے رکھ دی۔ سید صاحب نے عدالت میں یہ بھی فرمایا:-

”بلاشبہ اخوان نہایت وحشیانہ مظالم کا تجربہ مشق بنائے گئے ہیں۔ اور جو اعتراضات بھی ان کی طرف منسوب ہیں وہ بالجر حاصل کیے گئے ہیں“

سید صاحب نے عدالت میں یہ بھی فرمایا:-

”اگر حق کا تقاضا تھا کہ میں گرفتار کیا جاؤں تو میں حق کے فیصلے پر راضی ہوں اور اگر باطل کے ہاتھوں میری گرفتاری عمل میں آئی ہے تو باطل سے رحم کی اپیل میرے لیے کیونکہ ممکن ہے“

عدالت ہی میں سید صاحب سے یہ یادگار فقرے بھی سنے گئے:-

”مجھے معلوم تھا کہ اس بار حکومت میرا سرچا ہتی ہے، لہذا میں اس پر نادم نہیں اور نہ مجھے اپنی شہادت کا کوئی غم ہے۔ میں اپنی دعوت کی راہ میں کام آ جاؤں، اس سے بڑھ کر میرے لیے سعادت اور کیا ہو سکتی ہے مستقبل کا مورخ جلد ہی فیصلہ کرے گا کہ راہ راست پر کون تھا۔ اخوان یا حکومت وقت کا نظام؟“

سید قطب اور اخوان کی دوبارہ گرفتاری کو بھی ایک ہی سال ہوا تھا کہ ۲۸ اگست ۱۹۶۶ء کو سید صاحب اور ان کے دوست تھی محمد یوسف ہواش اور شیخ عبدالفتاح اسمعیل تھنہ دار پر چڑھا دیئے گئے۔ جبکہ ان سے پہلے بھی پچاسوں اخوان جیلوں کے اندر ہی شہید ہو چکے تھے۔ ان شہدائے ثلاثہ کو

تختہ دار پر چڑھایا گیا تو تماشائیوں میں امریکی اور روسی سفیر بھی شامل تھے۔ اللہ جانے، کتنے اخوان اسی طرح جاں بحق ہو گئے۔ مگر اسلام آج بھی زندہ و تابندہ ہے جس طرح پہلے تھا۔ شجر دعوت کی جڑوں میں جب بھی شہداء کا خون پہنچا ہے، اس کی تو انائیوں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اس وقت وہ اور تیزی سے پھولا پھولا اور برگ و بار لایا ہے۔ بلاشبہ اشتراکیت خواہ کتنا ہی ناک رگڑ ڈالے، اسلام کا چراغ گل کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ پڑھ چکے ہو کہ عبد الناصر کی صحافت اور ان کے ریڈیو نے ۱۹۵۵ء میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ اخوان کا خاتمہ ہو گیا اور اب ان کی تحریک دم توڑ چکی ہے۔ مگر ۱۹۶۵ء میں جبکہ عبد القادر اور فرغانی کی شہادت کو صرف گیارہ سال ہوئے تھے۔ عبد الناصر ماسکو میں اخوان کے خوف سے لرزہ بر اندام نظر آتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حزب انقلاب کے ہزاروں پر جوش جوان دعوت سے آشنا اور اس کے ہم نوا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کی نگاہوں نے اخوان کا دور سعادت دیکھا بھی نہ تھا۔ ان پر جوش جوانوں میں ۳ ہزار جوان تو ایسے تھے جن کی عمریں ۱۸ اور ۲۱ کے درمیان تھیں اور یہ جوان، ہر طبقے سے تعلق رکھتے تھے، حتیٰ کہ ان میں سائنس دان اور خلائی تجربات کے ماہرین بھی تھے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کر کے رہتا ہے، مگر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ (وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ وَاَلْکٰثِرُ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ)

شہید اسلام کی شخصیت کے سلسلے میں یہ مختصر سی معلومات ہیں ان سے سرسری طور پر یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ سید صاحب کی زندگی میں کیا کیا مراحل پیش آئے۔ اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں کن امور کو زیادہ دخل رہا۔ چونکہ سید صاحب سے میرے شخصی روابط کبھی نہ رہے اس لیے اپنی محدود معلومات کے لحاظ سے یہ چند سطریں ہی ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جن کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہے جیسے سمندر کا ایک قطرہ، یا زمانے کا ایک لمحہ۔ اگر حالات سازگار رہتے اور توفیق الہی شامل حال رہی تو جو لوگ سید صاحب کے سلسلے میں تفصیلی معلومات رکھتے ہیں اور

دعوتی سرگرمیوں میں برابر ان کے ساتھ رہ چکے ہیں، انشاء اللہ وہ ان کی مفصل  
 اور جامع سوانح آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔ اللہ ان شہدا کی قبروں کو  
 نور سے بھر دے اور کاروانِ ظفر منڈی اسلام کے ساتھ ہمیں بھی ان سے ملا دے۔

(الاتاذ) عبدالحق محروس (مدینہ منورہ)

۱۹ / محرم ۱۳۸۹ھ

# نقوشِ رالا

انسانیت آج ہلاکت کے دہانے پر کھڑی ہے۔۔۔ اس لیے نہیں کہ اس کے سر پر تیسری عالمگیر۔۔۔ بلکہ کائنات گیر ایٹمی جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں اس طرح اس کے وجود کو ہولناک تباہی کا خطرہ لاحق ہے۔۔۔ کہ یہ اصل مرض نہیں، مرض کی محض ایک علامت ہے۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ وہ ان صحت مند قدروں سے عاری ہو چکی ہے جو حیات انسانی کی بقا و ترقی کے لیے ناگزیر ہیں۔ مغربی دنیا پر یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو چکی ہے کہ اب تک وہ ایسی قدریں نہ مہیتا کر سکی جن سے وہ انسانیت کو مالا مال کر سکے۔ یہی نہیں، اس کے پاس تو وہ چیز بھی نہ رہی جو خود اس کے وجود و بقا کی ہی ضمانت بن سکے۔ وہاں کی ڈیموکریسی تقریباً افلاس کا شکار ہو چکی ہے۔ اب دھیرے دھیرے اس نے مشرقی کیمپ کے نظاموں بالخصوص معاشی نظام کی طرف ہاتھ بڑھانا بھی شروع کر دیا ہے! اگرچہ اس کے یہاں اب اس کا نام ہے اشتراکی نظام! خود مشرقی کیمپ کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، آج تمام ہی کلیت پسندانہ نظریات فکری میدان میں واضح طور پر پسپا ہو چکے ہیں۔ ان ہی پسپا نظریات میں سرفہرست وہ مارکسزم بھی ہے جس کی بنیاد کچھ عقیدوں پر تھی، اس لیے ابتداء میں تو اس نے مشرق اور خود مغرب کے بے شمار دلوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا مگر آج وہ صرف حکومت اور نظام ہائے حکومت میں ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ آج اسے اپنے بنیادی عقیدوں اور اصولوں سے دور کا بھی واسطہ نہ رہا۔ یہ نظریات بالعموم انسانی فطرت اور



اس کے تقاضوں سے ٹکراتے ہیں۔ اور صرف اسی طبقے میں فروغ پاسکتے ہیں۔ جو معاشی اور معاشرتی لحاظ سے انتہائی پسماندہ ہو یا جو عرصہ دراز تک کسی قاہرانہ نظام کے شکنجے میں رہ چکا ہو۔ بلکہ اس طرح کے طبقات میں بھی ان کی مادی اور معاشی ناکامی ظاہر ہونے لگی ہے، جبکہ معاشیات ہی وہ شعبہ ہے جو ان کی خصوصی توجہات کا مرکز اور ان کے فخر و ناز کی بنیاد ہے۔ روس جو کلیتاً پسندانہ نظاموں کا نمائندہ ہے، دن بدن غذائی سجران کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ یہی روس ہے جو نازوں کے زمانے میں اپنی پیداوار میں ضرب المثل تھا۔ حالت یہ ہے کہ اس وقت وہ گندم اور غذائی اشیاء دوسرے ملکوں سے درآمد کرنے پر مجبور ہے۔ اور اس غرض سے وہ بے تحاشا اپنا زر مبادلہ دوسرے ملکوں کے حوالے کر رہا ہے، کیونکہ اس کا اجتماعی کاشت کا نظام فیل ہو چکا ہے۔ وہ نظام جس کا انسانی فطرت سے براہ راست تصادم ہو رہا تھا۔

### انسانیت کو اب

ایک نئی قیادت کی ضرورت ہے!

اب مغرب کی قیادت بالکل زوال آمادہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ مغربی

تہذیب مادی افلاس کا شکار ہے، یا عسکری اور اقتصادی پہلو سے کمزور ہے بلکہ اس لیے کہ اب مغربی نظام کا بھرم اٹھ چکا ہے۔ اب اس کے پاس ان "قدروں" کا ذخیرہ نہ رہا جو اس کی قیادت کو قائم کر سکیں۔

اب ایک ایسی قیادت ناگزیر ہے جس کے ہاتھوں اس مادی تہذیب کا نشوونما

ارتقار ہو سکے جس کو انسانیت نے یورپ کی حیرت انگیز ایجاد ہی اور اختراعی

ترقیوں کی راہ سے پایا ہے۔ ساتھ ہی وہ قیادت انسانیت کو نئی، محکم اور مکمل

قدروں سے مالا مال کر کے اس کے سامنے زندگی کا ایک مثبت اور قابل عمل

پر وگرام بھی پیش کر سکے۔

اسلام — تنہا اسلام ہی وہ نظام ہے جو اپنے پاس ایسی قدریں اور

ایسا پروگرام رکھتا ہے۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ جس کا آغاز سو لہویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ جو بیداری کا دور کہلاتا ہے اور جو اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے درمیان اپنے منتہی کمال کو پہنچ گئی وہ بھی اپنا سب کچھ دائر پر لگا چکی۔ اس کے پاس بھی اب کوئی نیا اثاثہ نہ رہا۔

اسی طرح ”وطنیت“ اور ”قومیت“ کی علمبردار پارٹیاں اور دوسری تمام مقامی تنظیمیں جو اسی دوران میدان میں آئیں، وہ سب بھی انہی صدیوں میں اپنے سارے پتے پھینک چکیں۔ ان کے پاس بھی اب مزید کچھ نہ رہا۔ . . . .

آخر کار سارے نظام فیل ہو کر رہ گئے۔ چاہے وہ کلیت پسندانہ نظام رہے ہوں یا جمہوریت پسندانہ۔

اب آج، حیرانی و سرگشتگی اور تنگی و ذبوں حالی کے اس بدترین دور میں، اسلام اور خیر امت کی باری ہے۔ اس اسلام کی باری ہے جو مادی ایبادات کو گرم نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ کیونکہ اس کے نزدیک تو یہ انسان کے اولین فرائض میں سے ہے جس کا مکلف وہ اسی وقت سے ہے جبکہ اسے کائنات کی خلافت سونپی گئی تھی۔ اتنا ہی نہیں وہ تو کچھ خاص شرطوں کے ساتھ اسے خدا کی عبادت اور وجود انسانی کی غایت قرار دیتا ہے :-

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً

اور وہ وقت یاد کر جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ ہماری عبادت کریں۔

د البقرہ ۳۰  
وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

د الذاریات ۵۶

”امت مسلمہ“ کی باری اس لیے آئی ہے کہ وہ اس مقصد کو پورا کرے جس کے

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجُبٌ مُّوَسَّوَةٌ ۚ وَمَن يَشْكُرْ فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تَقُومُ ۖ وَمَن يَكْفُرْ فَإِنَّ اللَّهَ عَن يَمِينِهِ جَنَّةٌ مَّا تَصْطَفِي الْبَنَاتُ ۚ وَمَن يُؤْمَرْ بِاللَّيْلِ فَلْيَمْسِكْ ظَلْمًا ۖ فِئِنَّهُ عَنِ اللَّهِ عَنَّا ۚ وَذَلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

بِاللَّهِ - (آل عمران - ۱۱۰)

تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں میں پیدا ہوئی۔  
بھلائی کا حکم دیتے ہو، بُرائی سے روکتے  
ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو

❖ ❖ ❖

اور داسے ایمان والو! اسی طرح ہم نے  
تمہیں ایک بہترین اُمت بنایا ہے تاکہ  
تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ  
ہو۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا  
لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ  
وَیَكُونَ الرَّسُولُ وَعَلَيْكُمْ  
شَهِيدًا - (البقرہ، ۱۴۳)

لیکن اسلام اُس وقت تک اپنا کردار نہیں ادا کر سکتا۔ جب تک اسے ایک  
معاشرہ نہ ملے۔ ایک ایسی اُمت نہ ملے جو اس کی چلتی پھرتی تصویر ہو... کیونکہ  
انسانیت — خصوصاً اس دور میں — کسی مجرّد عقیدے کا نام سننے کے  
لیے تیار نہیں، جب تک وہ زندگی کے بازار میں اس کی سچی تصویر بھی اپنی آنکھوں  
سے نہ دیکھ لے... اور اُمتِ مسلمہ جو صحیح معنوں میں اسلام کی عملی تصویر ہو —  
صدیوں سے ناپید ہے۔ کیونکہ اُمتِ مسلمہ کسی ”خطۂ زمین“ کا نام نہیں ہے جو کبھی  
اسلام کا مسکن رہا ہو، نہ کسی قوم کا نام ہے، جس کے آباد اجداد تاریخ کے کسی دور  
میں نظامِ اسلامی کے علمبردار رہے ہوں۔

”اُمتِ مسلمہ“ تو انسانوں کی وہ جماعت ہے جس کی رسوم و روایات، جس کے  
افکار و تصورات، جس کے عقائد و نظریات، جس کی اخلاقی قدریں اور ترک و اختیار  
کے پیمانے غرض ساری چیزیں شریعتِ اسلام کے چراغ کا پر تو ہوں۔ اور سچ  
پوچھو تو ایسی اُمت اس وقت سے ناپید ہے جب سے شریعتِ الہی حکومت  
کے ایوانوں سے بے دخل ہے۔ ضروری ہے کہ یہ ”اُمت“ اس زمین پر دوبارہ  
”نمودار“ ہوتا کہ اسلام انسانیت کی قیادت کے سلسلے میں اپنا متوقع کردار پھر

ادا کر سکے۔

ضروری ہے کہ وہ امت پھر "سامنے لائی جائے" جو غلط تصورات و افکار گمراہ نظریات اور باطل نظاموں کے انبار میں کھو کر رہ گئی ہے۔ ان نسلوں کے ہجوم میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ جن کو نہ اسلام سے کوئی واسطہ ہے نہ شریعت اسلامی سے اگرچہ عام طور پر یہ گمان ہے کہ وہ نام نہاد "اسلامی دنیا" میں موجود ہے!!!

میں اس بات سے بے خبر نہیں کہ اس امت کے "اچار" اور "قیادت" کی بازیافت کے لیے ایک نساہت درکار ہے۔ کیونکہ امت مسلمہ کو "بزم" عالم سے غائب ہونے کی عرصہ دراز ہو گیا... اور انسانی قیادت کی باگ ٹویل مدت سے دوسرے افکار و تصورات دوسری امتوں اور دوسرے نظاموں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے۔ علاوہ بریں یورپ کی حیرت انگیز ذہانت اور ایجادی قوت نے اس عرصہ میں "سائنس" "کلچر" "نظریات" اور "مادی پیداوار" کا انبار لگا دیا ہے۔ اس نے ایک ایسا عظیم اثاثہ فراہم کر دیا ہے جو مادی ترقی کی آخری حدیں چھو رہا ہے۔ پھر وہ پوری تیزی سے اس میں اضافہ بھی کر رہا ہے۔ اور ایسے افراد کی کھیپ کی کھیپ تیار کر رہا ہے جو سہولت اس کی نمائندگی کر سکیں! جبکہ نام نہاد "اسلامی دنیا" اس طرح کی مادی ترقیوں سے تقریباً عاری ہے! مگر ان سب کے باوجود "اسلامی بیداری" ناگزیر ہے، چاہے بیداری کی یہ مہم چلانے اور قیادت کو ہاتھ میں لینے کے درمیان ایک لمبی مسافت حائل ہو۔ اسلامی شعور کی بیداری اس راہ کا پہلا زینہ ہے جس کو پھلانگ کر آگے بڑھ جانا ناممکن ہے۔

پھر ہمیں متعین طور سے یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس امت میں انسانیت کی قیادت کے لیے کون کون سی صلاحیتیں موجود ہیں، تاکہ بیداری کی یہ مہم چلاتے وقت بصیرت کی تبدیلی ہمارے ہاتھ میں ہو۔ ایسا نہ ہو کہ پہلے ہی قدم پر ہم بھٹک جائیں اہلیت کے اصل عناصر ہمارے نگاہوں سے اوجھل رہ جائیں۔

اس امت کے لیے آج یہ ممکن نہیں — اور نہ یہ مطلوب ہے — کہ وہ انسانیت کے سامنے مادی حیثیت سے اپنی برتری ثابت کر سکے، گزروں کو ختم کر دے، اور اس پہلو سے اس کی عالی قیادت تسلیم کر لے۔ کیونکہ یورپ اس دوڑ میں بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب کم از کم چند صدیوں تک یہ ممکن نہیں کہ مادی دوڑ میں اس کو پیچھے چھوڑا جاسکے!

لہذا کوئی اور ایسی چیز ناگزیر ہے جو ہمیں اس کا اہل بنا سکے! ایسی چیز جس سے موجودہ تہذیب کے جیب و دامن خالی ہوں!

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم مادی ترقی سے صرف نظر کر لیں بلکہ ہمارا تو یہ فرض ہے کہ ہم اس میں بھی اپنی کوششیں صرف کریں۔ لیکن اس خیال سے نہیں کہ اس کے ذریعے ہم آج انسانیت کی قیادت کر سکیں گے۔ بلکہ اس حیثیت سے

کہ وہ ہماری ایک ذاتی ضرورت ہے۔ اسی طرح یہ اس تصور "اسلامی" کی طرف

سے عائد ہونے والی ایک ذمہ داری بھی ہے۔ جو انسان کے سر پر خلافتِ ارضی کا تاج رکھتا ہے۔ اور کچھ شرائط کے ساتھ اسے خدا کی عبادت اور وجودِ انسانی کی

غایت قرار دیتا ہے۔ غرض مادی ترقی کی ضرورت و اہمیت اپنی جگہ مسلم، مگر

انسانیت کی قیادت کے لیے کوئی اور ایسی چیز ناگزیر ہے جو ہمارے اندر اس

کی اہلیت پیدا کر سکے۔ اور یہ چیز صرف "عقیدہ" اور شریعت ہو سکتی ہے

جو انسانیت کو جہاں یہ آزادی بخشتی ہے کہ وہ مادی اختراعات کو قدر کی نگاہ سے

دیکھے، وہیں یہ بھی چاہتی ہے کہ یہ عقیدہ اور شریعت انسانی سوسائٹی یا مسلم معاشرے

میں بالکل زندہ و متحرک اور محسوس شکل میں چلتے پھرتے نظر آئیں!

آج زندگی کی جتنی قدریں بھی رائج ہیں اور زمین پر جتنے نظام بھی چل رہے

ہیں، ان سب کا سرچشمہ "جاہلیت" ہے۔ وہ جاہلیت جو ہر صورت جاہلیت

ہے، چاہے محیر العقول مادی سہولتوں اور معجزہ نما مادی ترقیوں کے وہ کتنے

ہی طلسم باندھے!

اس جاہلیت کی بنیاد ہی ہے زمیں میں خُدا کی بادشاہت اور الوہیت کی سب سے بڑی خصوصیت پر زیادتی و دست درازی، خُدا کی حاکمیت سے سرکشی و سرتابی۔ یہ حاکمیت کا حق انسان کو دیتی ہے۔ یہ کچھ انسانوں کو کچھ انسانوں کا خُدا قرار دیتی ہے۔ اس سیدھی سادی ابتدائی شکل میں نہیں جس سے قدیم جاہلیت آشنا تھی، بلکہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ خدائی ضابطہ حیات اور الہی نظامِ زندگی سے ہٹ کر شریعت اور قانون وضع کرتے، تصورات اور قدیم متعین کرنے، زندگی کے نظام اور اس کے نقشے مرتب کرنے کا حق رکھتی ہے۔ وہ ان دائروں میں بھی دخل دے سکتی ہے، جن میں دخل دینے کا حق خُدا نے کسی کو نہیں دیا۔ چنانچہ خُدا کی حاکمیت پر دست درازی کا نتیجہ بندوں پر زیادتی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ آج کل کی پسماندہ نظاموں میں انسان کی جو تذبذب و تحقیر ہو رہی ہے اور سرمایہ دارانہ نظاموں میں سرمایہ و سامراج کے تسلط سے افراد اور رعایا پر جو ظلم و زیادتی روا رکھی گئی ہے وہ سب نتیجہ ہے خدائی بادشاہت سے بغاوت اور اس شرف و عزت کے انکار کا خُدا کی جناب سے انسان کو عطا ہوا ہے!

اس معاملے میں اسلامی نظام بالکل منفرد ہے۔ کیونکہ نظامِ اسلامی کے علاوہ ہر نظام میں کسی نہ کسی شکل میں انسان، انسان کو پوج رہا ہے! تنہا نظامِ اسلامی ہی وہ نظام ہے جس میں سارے انسان آزاد ہیں۔ نہ کوئی بندہ ہے نہ بندہ نواز، نہ کوئی عابد ہے نہ معبود، نہ کوئی آقا ہے نہ غلام۔ یہاں بس اللہ کی عبادت کرنی ہے۔ وہی سب کا معبود ہے۔ سب کو اسی کے آگے جھکنا ہے اور اسی کے احکام پر چلنا ہے۔

یہی وہ دور ہے جہاں سے یہ راستہ اور راستوں سے ممتاز ہو جاتا ہے اور یہی وہ نیا تصور ہے جو اس وقت ہم انسانیت کے سامنے پیش کر سکتے ہیں کیونکہ یہی وہ شاہ موتی ہے جس سے آج انسانیت کی جھولی خالی ہے کہ

یہ تہذیب مغرب اور ذہن یورپ دونوں کی دسترس سے باہر ہے۔  
ہم بلاشبہ ایک نئی، بہترین اور کامل ترین چیز کے مالک ہیں۔ ایسی چیز کے  
مالک ہیں، جس سے انسانیت بالکل نا آشنا ہے۔ اور اس کے بس میں بھی نہیں  
کہ اسے وہ "فراہم" کر سکے!

لیکن ضروری ہے کہ یہ نئی چیز — جیسا کہ ہم پہلے کہ چکے ہیں — عملی  
دنیا میں پیکر محسوس بن کر نظر آئے۔ ضروری ہے کہ کوئی امت اس کا بولتا ہوا نمونہ  
بنے۔ جس کے لیے ہمیں دنیا سے اسلام میں "بیداری" کی مہم چلانی ہوگی کہ  
یہی بیداری کی مہم ہے جس کے لیے ویرسویر انسانیت کی قیادت ہمارے  
ہاتھوں میں آسکے گی۔

اسلامی بیداری کی یہ مہم کیسے شروع کی جائے  
ضروری ہے کہ جان فروشوں کی ایک جمعیت یہ عزم لے کر میدان میں اترے  
اور مردانہ وار آگے بڑھتی رہے۔ وہ جاہلیت جس نے زمین کے کونے کونے میں  
اپنی طنابیں گاڑ رکھی ہیں۔ اس کی سرکوبی کے لیے مسلسل جدوجہد کرتی رہے۔ ایک  
طرف تو وہ اپنی سرگرمیوں میں اس عالمگیر اور ہمہ جہتی جاہلیت سے کنارہ کش  
رہے۔ اور دوسری طرف اس سے ایک قسم کا ربط بھی رکھے۔  
یہ جمعیت جو یہ عزم لے کر آگے بڑھے گی اس کے لیے کچھ نقوش راہ دیکار  
ہوں گے۔ ایسے "نقوش راہ" جن سے وہ اپنے کام کے مزاج کو سمجھ سکے۔  
اپنی ذمہ داری کی حقیقت کو جان سکے۔ اپنی غایت کی شہ رگ کو پہچان سکے۔  
اس بات سے واقف ہو سکے کہ اس کے اس طویل سفر کے لیے نقطہ آغاز کیا ہوگا۔  
وہ جاہلیت جس نے عالم کے چتے چتے میں اپنا تسلط جما رکھا ہے، اس کے  
مقابلہ میں اس کا صحیح موقف کیا ہوگا۔ انسانوں سے ربط کہاں ہوگا اور  
کنارہ کشی کا کیا موقع ہوگا؟ اس کی خصوصیات کیا ہوں گی؟ اور گروپیش کی  
جاہلیت کی کیا پہچان ہوگی؟ اس جاہلیت کے ہمنواؤں سے وہ اسلام کی زبان

میں کس طرح گفتگو کرے گی؟ اور کن امور میں کرے گی؟ پھر وہ یہ بھی جان سکے کہ ان سارے معاملات میں وہ روشنی کہاں سے حاصل کرے گی؟ اور کس طرح کرے گی؟

ضروری ہے کہ ان نقوشِ راہ کا ماخذ بھی وہی ہو جو اس عقیدہ کا منبع ہے، یعنی قرآن اور اس کی بنیادنی ہدایات اور وہ تصور جو اس نے اس چیدہ اور برگزیدہ گروہ کے اندر پیدا کیا تھا، جس نے ایک بار تاریخ کے دھارے کو اللہ کی مرضی کے سُرخ پر پھیر دیا تھا۔ اور جس کے ذریعہ اس زمین پر وہ وہ باتیں ظہور میں آئیں، جو کسی پر مخفی نہیں۔

یہ کتاب — ”معالم فی الطریق“ — اسی متوقع اور مطلوب جمعیت کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کے چار ابواب تو ”فی ظلال القرآن“ سے ماخوذ ہیں۔ موضوع کتاب کے لحاظ سے ان میں مناسب ترمیم و اضافہ بھی ہوا ہے۔ اور آٹھ ابواب — اس مقدمہ کے علاوہ — مختلف مواقع پر ضبطِ تحریر میں آئے ہیں۔ جس کی صورت یہ رہی ہے کہ دستورِ الہی اور کلامِ ربانی پر مسلسل غور و غوض کے دوران جب جب کچھ باتیں سامنے آئیں لکھ لی گئیں۔ اس طرح یہ ابواب گرچہ باہمہمگر بالکل مربوط نہیں۔ لیکن اس پہلو سے ان میں خاصا ربط ہے کہ یہ سب ایک ہی راہ کے نقوش ہیں۔

یہ سارے مقالات اپنی مجموعی شکل میں ان نقوشِ راہ کے پہلے مجموعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر خدائے رحمان و رحیم کی مشیت شامل حال رہی تو امید ہے، جیسے جیسے اللہ تعالیٰ ان نقوشِ راہ کی طرف میری رہنمائی فرمائے گا، دوسرے مجموعے بھی آپ کے سامنے آتے رہیں گے، وباللہ التوفیق۔

سہ بظاہر مصنف رحمۃ اللہ علیہ اپنا یہ وعدہ پورا نہ کر سکے۔ وہ حق کے داہروں اور تحریکِ اسلامی کے علمبرداروں کے لیے ”معالم فی الطریق“ و نقوشِ راہ کے اور مجموعے پیش نہ کر سکے



لیکن ذرا اور گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو وہ مردِ حق آگاہ اس دُنیا سے جاتے جاتے ایسے واضح اور درخشاں نقوش قائم کر گیا جو کبھی مٹنے والے نہیں۔ اس نے ایسے نمایاں نشانِ راہ پہنچ دیئے ہیں کہ حق و صداقت کے قافلے رہتی دُنیا تک ان سے راہ پاتے رہیں گے۔ اس نے گرم گرم شعلے سے خون کی سرخیوں سے جریدہٴ عالم پر ایسے گہرے اور روشن خطوط ثبت کر دیئے ہیں جو اپنی ضیا باریوں سے حق کے راہیوں کو راہ دکھاتے رہیں گے۔ بلاشبہ وہ ”معالم“ وہ خطوط اور وہ نقوش لوح و قریطاس پر نقش نہ ہوئے، وہ کتابی مجموعوں کی شکل میں ہمارے ہاتھوں میں نہ پہنچ سکے۔ لیکن یقین مانتے وہ ہزار کتابی مجموعوں پر بھاری ہیں۔

سالہا گوشِ جہاں ز مرز نہ خواہد بود  
 زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گردوں ز وہ ام (مترجم)

# بے مثال قرآنی امت

یہ ایک روشن تاریخی حقیقت ہے جس پر قائلہ دعوتِ اسلامی کو ٹھہر کر غور کرنا چاہیے خواہ وہ کسی بھی زمانے اور زمین کے کسی بھی خطہ میں ہو۔ ضرورت ہے کہ وہ اس پر سنجیدگی سے غور کرے۔ کیونکہ دعوت کے رُخ اور اس کے طریقِ کار پر اس کے نہایت گہرے اور فیصلہ کن اثرات پڑ سکتے ہیں۔

اس دعوت نے کبھی انسانوں کی ایک جماعت تیار کی تھی۔ صحابہ کرام کی جماعت۔ ایسی جماعت جو تاریخِ اسلام کیا، پوری تاریخِ انسانیت میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ لیکن افسوس کہ پھر دوبارہ ویسی جماعت نہ تیار ہو سکی۔ ہاں اس طرح کے کچھ افراد ضرور وقتاً فوقتاً آفتقِ عالم سے طلوع ہوئے اور آسمانِ انسانیت پر آفتاب بن کر چمکے۔ مگر ویسے آفتاب اتنی عظیم تعداد میں کسی ایک جگہ بیک وقت کبھی نہ فراہم ہو سکے۔

یہ ایک واضح اور ثابت شدہ حقیقت ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، کہ شاید اس کا کچھ راز معلوم ہو۔

اس میں شک نہیں کہ قرآنِ کریم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث آپ کا عملی اسوہ اور آپ کی پاک سیرت، یہ ساری چیزیں ہمارے سامنے ہیں۔ بالکل اسی طرح سامنے ہیں، جس طرح اس پہلی امت کے سامنے تھیں، جو دوبارہ تاریخ میں ظہور پذیر نہ ہو سکی۔ ہماری نگاہوں سے اگر کوئی چیز اوجھل ہے تو بس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ تو کیا اس انسانی افلاس، اس

ملی قحط اور اس تاریخی المیہ کا راز یہی ہے؟

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کا بالفعل موجود ہونا اس دعوت کے قائم ہونے اور برگ و بار لانے کے لیے ناگزیر ہوتا، تو اللہ تعالیٰ اسے سارے انسانوں کے لیے کبھی عام نہ کرنا، آپ کو سلسلہ رسالت کی آخری کڑھی کبھی نہ بتانا، اور زمین پر بسنے والے سارے انسانوں کی فلاح و سعادت کو، قیامِ قیامت تک کے لیے، آپ کی رسالت پر کبھی موقوف نہ قرار دیتا۔

لیکن خدائے برتر نے قرآن کی مکمل حفاظت کا ذمہ لیا۔ اور چونکہ یہ دعوت آپ کے بعد بھی ضیا بار و ثمر بار ہو سکتی تھی، اس لیے ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی کے بعد آپ کو جو رحمت میں بلا لیا۔ اور اس دین کو رہتی دنیا تک کے لیے باقی رکھا۔ معلوم ہوا کہ ذاتِ گرامی کی عدم موجودگی باغِ انسانیت کے خزاں نصیب ہونے کا سبب نہیں بن سکتی۔

پھر ہمیں کسی دوسرے سبب کا سراغ لگانا چاہیے۔ دیکھنا چاہیے کہ وہ کونسا سرچشمہ تھا جس سے وہ پہلی امت سیراب ہوئی تھی؟ ہو سکتا ہے اس میں کوئی بات ہو گئی ہو۔ دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سے اصول تھے جن پر اس امت کی تربیت ڈراں ہوئی تھی؟ ممکن ہے ان سے کچھ انحراف ہو گیا ہو۔

وہ سرچشمہ جس سے وہ پہلی امت سیراب ہوئی تھی وہ قرآن تھا، صرف قرآن۔ نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کا عملی اسوہ تو یہ تو اسی چشمے سے پھوٹی ہوئی شاخیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ سے اخلاق رسالت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو بولیں!

کان خلقنا القرآن  
آپ کا خلق قرآن تھا۔ اے

ابو داؤد شریف کی روایت ہے کہ ایک شخص نے اکرام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے  
(باقی اگلے صفحہ پر)

قرآن ہی وہ سرچشمہ تھا جس سے وہ سیراب ہوتے تھے۔ یہی وہ سا پنچ تھا جس میں وہ ڈھلتے تھے۔ مگر اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس وقت انسانیت تہذیب و ثقافت سے نا آشنا اور علوم و فنون سے بے بہرہ تھی۔ اس وقت کتابوں کے ذخیرے اور تحقیقات کے انبار نہ تھے۔ — بخدا یہ سبب ہرگز نہ تھا! وہاں رومی تہذیب و ثقافت موجود تھی۔ اس کی وہ کتابیں اور وہ قوانین موجود تھے جو آج کے یورپ کا سب سے بڑا سہارا ہیں۔ وہاں یونانی تہذیب کے بھی آثار موجود تھے۔ اس کے فلسفہ و منطق اور ان علوم و فنون کا وہاں بھی غلغلہ تھا، جن سے آج تک مغرب سیراب ہو رہا ہے۔ وہاں ایرانی تہذیب کا بھی چرچا تھا۔ اس کے علوم و فنون، اس کی شاعری، اس کی روایات، اس کے عقائد و افکار اور اس کے نظامہ حکومت پر ان کی پوری نظر تھی۔ ان کے علاوہ دُور و نزدیک کی بہت سی تہذیبیں تھیں۔ ہندوستانی اور چینی تہذیبیں تھیں۔ رومی اور ایرانی تہذیبیں، شمال و جنوب سے انھیں آغوش میں لیے ہوئے تھیں، اور یہودیت و نصرانیت خود قلبِ جزیرہ میں اپنے پیرجمائے ہوئے تھیں۔ — معلوم ہوا کہ اس امت نے اگر تربیت و تشکیل کے ابتدائی مرحلے میں اپنی تمام تر توجہات صرف کتابِ الہی پر مرکوز کر دیں، تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ عالمی تہذیبوں اور ثقافتوں تک اس کی رسائی نہ تھی ایسا ہرگز نہ تھا۔ بلکہ یہ ایک سوچی سمجھی اسکیم اور طے شدہ منصوبے کے تحت تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں توراہ کا ایک نسخہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غضب ناک ہو جانا اور پھر یہ فرمانا:

وَإِنَّهُ وَاللَّهِ كَوَاكِبٌ  
 اور بخدا اگر موسیٰ تمھارے درمیان زندہ ہوتے

دبقیہ صفحہ ۶۴) دریافت کیا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ بولیں، کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ کانِ خلق القرآن، جو قرآن پاک میں الفاظ کی صورت میں ہے، وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورتِ عمل تھا۔ (مترجم)

مُوسَىٰ حَيَّابَيْنَ أَظْهَرَ كُمْ مَا  
 حل لہ، الا ان یتبعنی  
 تو ان کے لیے بھی میری پیروی کے سوا کوئی  
 دوسری صورت جائز نہ ہوتی۔  
 اس بات کی انتہائی روشن دلیل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ آغاز تربیت میں وہ امت میں جس سرچشمہ  
 سے سیراب ہو۔۔۔ وہ صرف کتاب الہی ہو۔ تاکہ دلوں پر اسی کا نقش  
 ہو۔ اور اس کی اٹھان اسی کے متعین کردہ خطوط پر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت  
 عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوسرے سرچشمہ سے بھی سیراب ہونا چاہا تو آپ جوش  
 میں آگئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ ایک ایسی امت تیار ہو جس  
 کے دل و دماغ خالص ہوں، فکر و شعور خالص ہو۔ تصورات و عقائد خالص  
 ہوں۔ قرآن کریم کے پیش کردہ خدائی اصولوں کے علاوہ اس پر کسی اور چیز  
 کی چھاپ نہ ہو۔

چنانچہ وہ امت صرف اسی سرچشمے سے سیراب ہوئی۔ اسی لیے وہ تاریخ  
 میں ایک انفرادی شان کی مالک ہوئی۔۔۔ پھر کیا ہوا؟ بہت سے چشمے آ  
 آکر اس میں مل گئے! وہ چشمہ جس سے بعد کی نسلیں سیراب ہوئیں، اس میں  
 ایرانی روایات، یہودی اسرائیلیات، عیسائی الہیات، اور دوسری بہت  
 سی تہذیبوں اور ثقافتوں کے سوتے آکر مل گئے۔ ان چیزوں کی جہاں تفسیر اور  
 علم کلام میں آمیزش ہوئی، وہیں فقہ اور اصول فقہ میں بھی ملاوٹ ہوئی۔ اس  
 طرح بعد میں آنے والی ساری نسلیں اسی غیر خالص سرچشمے سے سیراب ہوتی  
 رہیں۔ اسی لیے وہ اپنے پاک اسلاف کی سچی جانشین نہ بن سکیں۔ اور بالکل  
 دوسری راہوں پر جا پڑیں۔

الغرض سرچشمے کا خلط ملط ہو جانا اس صورت حال کے بنیادی اسباب  
 میں سے ہے۔ یہ ان اسباب میں سے ہے جنہوں نے ہمیں اس بے مثال

قرآنی امت سے اس قدر دور لے جا کر ڈال دیا ہے۔

اس انقلاب کا ایک اور سبب بھی ہے۔ قرآن سے استفادے کا پہلے جو انداز تھا، آج وہ انداز بدل گیا۔

اس امت کے افراد قرآن پاک اس لیے نہیں پڑھتے تھے کہ اس سے تہذیب و ثقافت میں زیادتی یا معلومات میں اضافہ ہو۔ یا وہ تفریح خاطر اور تسکین ذوق کا سامان بنے۔ ان کا کوئی شخص قرآن پاک اس لیے نہیں سیکھتا تھا کہ اس سے علم و ثقافت کی بڑھی سی دکان سجالے، یا اس کے علمی و فقہی مسائل کا وہ تارون بن جائے۔ وہ قرآن سے صرف یہ جانتا چاہتا تھا کہ خود اس کی ذات کے سلسلے میں خدائے تعالیٰ کے کیا احکام ہیں۔ جس جماعت میں وہ شامل ہے۔ اس سے متعلق کیا ہدایات ہیں۔ اس کی اپنی زندگی، اور جماعت کی زندگی کے بارے میں اس کی کیا مرضی ہے۔ وہ یہ باتیں صرف اس لیے جانتا چاہتا تھا کہ انھیں وہ قبائے زندگی میں ٹانگ لے۔ جس طرح ایک فوجی میدان کارزار میں اپنی ڈیوٹی اس لیے معلوم کرتا ہے کہ فوراً وہ سرگرم عمل ہو جائے! یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی فرد ایک ہی نشست میں بہت سا قرآن جان لینے کا حریص نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ محسوس کرتا کہ قرآن جان کر وہ دوش ناتواں پر فرائض اور ذمہ داریوں کا ایک بارگراں لا در ہا ہے۔ وہ بس دس ہی آیتوں پر قناعت کرتا۔ یہاں تک کہ انھیں اچھی طرح یاد کر لے۔ اور سیرت و کردار میں پوری طرح جذب کر لے۔ جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ وہ روایت یہ ہے:

ابو عبد الرحمن سلمیٰ کہتے ہیں کہ مجھ سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن مجید پڑھتے پڑھتے تھے مثلاً عثمان بن عفان اور عبد اللہ بن مسعود وغیرہ

وقد قال ابو عبد الرحمن السلمی حدثنا الذین کانوا یقرؤ القرآن کعثمان بن عفان و عبد اللہ بن

یہ شعور اور یہ جذبہ عمل قرآن میں ان کے سامنے کیفیات کی ایک دُنیا اور علم و معرفت کا ایک جہان بیکراں کھول کر رکھ دیتا، ظاہر سے کہ یہ چیز کبھی ممکن نہ تھی، اگر وہ محض بحث و تحقیق اور علم و اطلاع کی غرض سے اسے ہاتھ لگاتے۔ پھر یہ شعور ان کے لیے عمل کے خارزار سے گزرنا آسان کر دیتا۔ فرائض اور ذمہ داریاں آتیں مگر انھیں کوئی گرانی نہ محسوس ہوتی۔ قرآن ان کے اندر بالکل جذب ہو کر رہ جاتا۔ ان کی شریانوں میں خون بن کر دوڑنے لگتا۔ وہ ایک عملی نظریہ اور متحرک ثقافت کی شکل میں چلتا پھرتا نظر آتا۔ وہ ذہن کے گوشوں اور مصاحف کے اوراق میں معتکف نہ رہتا۔ ان سرحدوں کو عبور کر کے عملی دُنیا میں جلوہ ریز ہوتا۔ اور راہِ ہوادِ زندگی کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ قرآن اپنے خزانوں سے صرف اسی کو مالا مال کرتا ہے جو اس روح اور اس شعور کے ساتھ اس کی طرف بڑھے۔ شوقِ علم اور جذبہ عمل کی بے تابوں کے ساتھ بڑھے۔ قرآن ذہن و دماغ کا کوئی کھلونا نہیں۔ وہ کوئی نرمی فنی اور ادبی تخلیق نہیں۔ وہ کوئی قصہ و تاریخ کا دفتر نہیں۔ گرچہ ضمناً یہ ساری ہی چیزیں اس کے اندر موجود ہیں۔

کہ ان لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں بھی پڑھ لیتے تو جب تک ان آیات کے تمام علم و عمل کو اپنے اندر جذب نہ کر لیتے، آگے قدم نہ بڑھاتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے قرآن کے علم و عمل دونوں کو ایک ساتھ حاصل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سورہ کے حفظ میں وہ برسوں لگاتے۔

(مترجم)

مسعود و غیرہما انہم کانوا تعلموا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر آیات لم يتجاوزوها حتی يعلموا ما فیہا من العلم والعمل قالوا فتعلمنا القرآن والعمل جميعا ولم هذا کانوا یبقون مدة فی حفظ السورة۔

مگر اصلاً وہ ایک نظامِ زندگی ہے۔ خالص خدائی نظامِ زندگی۔ اور خدائے تعالیٰ نے یہ نظامِ زندگی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا ہے:

وَقُرْآنًا فَرَقْنَا لِتَفْرَأَهُ  
عَلَى النَّاسِ عَلَى مَكْتَبٍ وَ  
نَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا

اور قرآن کو ہم نے حصے حصے کر کے اتارا تاکہ  
تم ٹھہر ٹھہر کر اسے لوگوں کے سامنے پڑھو۔  
اور اسے ہم نے انتہائی بہتر انداز میں اتارا ہے۔

قرآن پاک یکبارگی نہیں نازل ہوا۔ وہ منت نئی انسانی ضرورتوں کے لحاظ سے نازل ہوا۔ افکار و تصورات کے تدریجی ارتقا کی رعایت سے نازل ہوا، زندگی اور سوسائٹی کی تدریجی اٹھان کے مطابق نازل ہوا۔ ان عملی مشکلات کے اعتبار سے نازل ہوا، جو امت مسلمہ کو عملی زندگی میں پیش آئیں۔ ایک آیت یا چند آیات کے کسی متعین واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوتی ہیں اور ذہنوں میں ابھرنے والے سوالات کے جوابات دیتیں۔ معاملہ کی صحیح نوعیت سامنے رکھتیں، اور ان حالات میں لوگوں کے لیے راہ عمل متعین کتیں ان کے فکر و عمل کی اصلاح کرتیں، اور ان سارے معاملات میں ان کا تعلق خدائے سے جوڑتیں، اس وقت وہ محسوس کرتے، گویا وہ ملائعہ اعلیٰ کے ساتھ ہیں، خدا کی نگاہ میں قدرت الہی کی آغوش میں۔ اس طرح وہ عملی زندگی میں خدائی نظامِ زندگی کا چلتا پھرتا نمونہ ہوتے۔

یاد رہے! یہ ان کے جذبہ عمل کی بے تابیوں کا ہی فیض تھا کہ ان کی اٹھان اس حسین انداز سے ہوئی۔ اور یہ بعد والوں کی ذہنی و دماغی عیاشی کی نحوست ہے کہ ان کی اٹھان قرآن کی رعنائی و زیبائی سے یکسر محروم رہی۔ یقیناً انقلابِ حال اس بے مثال اور امتیازی نسل سے بعد کی نسلوں کے مختلف ہونے کا بنیادی سبب ہے۔

ایک تیسرا سبب بھی یہاں قابل ذکر ہے اور ضرورت ہے کہ اس پر خاص توجہ دی جائے۔ اس وقت کوئی شخص اسلام میں داخل ہوتا، تو اس کی چوکھٹ



پر ہی جاہلیت کے سایہ میں گزرے ہوئے پورے ماضی کا لبادہ اتار پھینکتا۔ وہ جس لمحہ اسلام کی طرف آتا، ایسا محسوس کرتا گویا وہ ایک نئے دور کا آغاز کر رہا ہے، جو اس زندگی سے بالکل مختلف ہے جو جاہلیت کی مسموم فضاؤں میں گزری ہے۔ وہ ساری چیزیں جن سے وہ جاہلیت میں مانوس تھا، اب ان کو شک و شبہ اور خوف و اندیشہ کی نگاہوں سے دیکھتا۔ اس وقت اسے یہ احساس ہوتا کہ یہ ساری چیزیں پلید ہیں، جو اسلام سے ذرا بھی میل نہیں کھاتیں۔ اسی ذہنی کیفیت کے ساتھ وہ اسلام کے نئے اصولوں کو اختیار کرتا۔ اور اگر کبھی نفس سے مغلوب ہو جاتا، یا عادتوں کی زد میں بہہ جاتا، یا راہِ اسلام کی تکلیف کی تاب نہ پاتا — تو دوسرے ہی لمحہ اُسے اپنی خطا و لغزش کا احساس ہو جاتا، اس کا دامن اشکِ ندامت سے تر ہو جاتا، اور اس کے اندر یہ تڑپ ہوتی کہ کسی طرح وہ اس آلائش سے پاک ہو جائے، اس کی زندگی نئے سرے سے قرآنی ہدایت سے ہم آہنگ ہو جائے۔

اس وقت جاہلیت کے سایہ میں گزرے ہوئے ماضی اور اسلام کی آغوش میں پروان چڑھنے والی زندگی میں بڑا فرق ہوتا۔ شعوری طور پر زمین آسمان کا فرق ہوتا۔ گہرے پیش کے جاہلی ماحول سے جو روابط ہوتے، یا جو اس کے عام اجتماعی تعلقات ہوتے ان میں نمایاں طور پر یہی کیفیت نظر آتی۔ اب وہ جاہلی ماحول سے انتہائی دور اور اسلامی ماحول سے غایت درجہ قریب ہوتا۔ اور اگر تجارت اور لین دین کی دنیا میں وہ کچھ مشرکوں سے تعلق بھی رکھتا تو یہ تعلق اس کے فکر و عمل پر ذرا بھی اثر انداز نہ ہوتا۔

وہاں جاہلی ماحول، جاہلی روایات، جاہلی تصورات اور جاہلی عادات و تعلقات سے مکمل علیحدگی ہوتی۔ اس کی زندگی میں اب عقیدہ شرک کے بجائے عقیدہ توحید، اور جاہلی تصور کی جگہ اسلامی تصور کی حکمرانی ہوتی۔ وہ نئی اسلامی تنظیم اور اس کی نئی قیادت میں باہم ضم ہوتا۔ اور ہر پہلو سے مسلم معاشرے اور مسلم

قیادت کا ہمدرد و وفدا کار ہوتا۔

یہی دور ابہر تھا۔ یہی نئی راہ میں بڑھنے کا نقطہ آغاز تھا۔ وہ مسلمان اس راہ میں اس طرح بڑھتا کہ جن روایات پر نظام جاہلیت کی بنیاد ہوتی، اور جسے اقدار کی اس میں حکمرانی ہوتی، ان کے دباؤ سے بالکل آزاد ہوتا۔ اس وقت ایسے مسلمان کے لیے اذیتوں کی یورش اور آزمائشوں کی یلغار ہوتی۔ ہمہ جہتی یورش اور چومکھی یلغار ہوتی۔ لیکن اس کا عزم بھی انتہائی محکم ہوتا۔ وہ ذرا بھی پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتا۔ جاہلی تصور اور نظام جاہلیت کی روایات اس پر کوئی راہ نہ پاسکتیں۔

اس وقت ہم اسی جاہلیت سے دوچار ہیں، ہاں اسی جاہلیت سے دوچار ہیں جس سے اس دور کا اسلام دوچار تھا۔ بلکہ یہ جاہلیت اس سے بھی زیادہ تلک اور بھیانک ہے۔ ہمارے گرد و پیش جو کچھ ہے، سب جاہلیت ہے۔ تصورات و عقائد، عادات و روایات، تہذیب و ثقافت، علوم و فنون، دستور و قوانین سب اسی جاہلیت کے شاخسانے ہیں۔ حتیٰ کہ آج جن چیزوں کو ہم اسلامی ثقافت، اسلامی ماخذ، اسلامی فلسفہ اور اسلامی فکر سمجھتے ہیں، ان میں سے کبھی بیشتر چیزیں جاہلیت ہی کی پیداوار ہیں!!

یہی وجہ ہے کہ اسلامی قدیں ہمارے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتی۔ ذہنوں میں اسلام کا تصور پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ اور نہ اس انداز کی کوئی نسل جنم لیتی، جس انداز کی نسل اسلام نے پہلی بار تیار کی تھی۔

تحریک اسلامی کے طریق کار کی رو سے ناگزیر ہے کہ ہم اپنی تشکیل و تربیت کے دور میں اس جاہلیت کے اثرات سے بالکل آزاد ہوں جس کی فضاؤں میں آج سانس لے رہے ہیں۔ جس کے سوتوں سے آج سیراب ہو رہے ہیں۔ ناگزیر ہے کہ ہم از سر نو اس خالص سرچشمہ کی طرف پلٹیں۔ جس سے وہ لوگ سیراب ہوئے تھے، جس کے بارے میں اس بات کی ضمانت ہے کہ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں

ہوئی۔ کسی بھی قسم کی آمیزش نہیں ہوئی، اس کی طرف پلٹیں اور وہاں یہ معلوم  
 کہیں کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ وجود انسانی کی غایت کیا ہے؟ کائنات  
 اور انسان کا خدا سے کیا تعلق ہے؟ زندگی کے سلسلے میں ہمارے کیا تصورات  
 ہوں؟ اخلاق اور قدروں سے متعلق کیا تصورات ہوں؟ نظامہائے حکومت  
 و سیاست، اصول اقتصاد و معیشت اور دوسری تمام اقدار حیات کے بارے  
 میں کیا تصورات ہوں۔

پھر جس وقت ہم اس کی طرف پلٹیں ہمارے دل میں تنفیذ و عمل کا جذبہ ہو،  
 نہ کہ محض ریسرچ اور ذہنی عیاشی کا جذبہ۔ ہم اس کی طرف بڑھیں تو یہ جاننے کے  
 لیے کہ وہ ہم کو کس رنگ میں دیکھنا چاہتا ہے، کہ اسی رنگ میں ہم رنگ جائیں۔  
 اس وقت قرآن کا فنی جمال بھی ہمارے سامنے آئے گا اور دلکش واقعات بھی  
 سامنے آئیں گے۔ قیامت کے مناظر بھی سامنے آئیں گے اور وجدان کو اپیل  
 کرنے والی باتیں بھی سامنے آئیں گی۔ اور وہ ساری چیزیں سامنے آئیں گی جنہیں  
 ریسرچ اسکالرز اور لذت ذہنی کے طلب گار ڈھونڈتے ہیں۔ بلاشبہ ساری  
 چیزیں ہمیں ملیں گی۔ لیکن یہی ہمارا مقصد اور ہماری غایت نہ ہوں گی۔ ہمارے  
 اندر تو یہ جستجو ہوگی کہ قرآن ہمیں کس شکل میں دیکھنا چاہتا ہے؟ وہ کون سا جامع  
 تصور ہے جو وہ ہمارے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے؟ خدا نے تعالیٰ کے بارے  
 میں وہ ہمیں کیا احساس و تصور دیتا ہے؟ اخلاق، طرز معاشرت، اور زندگی  
 کے عملی نظام کا وہ کیا نقشہ پیش کرتا ہے؟ ان سارے امور میں وہ ہمیں کیا رہنمائی  
 دیتا ہے؟

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم جاہلی سوسائٹی، جاہلی تصورات، جاہلی روایات  
 اور جاہلی قیادت سے اپنی ذات کی حد تک بالکل آزاد ہوں۔ ہمارے لیے  
 اس کی گنجائش ہرگز نہیں کہ ہم اس جاہلی ماحول کو گوارا کر لیں یا اس کے ساتھ  
 دوستانہ تعلقات قائم کر لیں، کیونکہ وہ بجاہل موجودہ۔ — باہیں صفات ذمیرہ

اس قابل کہاں کہ اس سے صلح و مفاہمت کریں۔ ہمارا نصب العین تو یہ ہے کہ پہلے ہم خود کو بدلیں، پھر اس جاہلی ماحول کو بدل کر رکھ دیں۔ ہمارا اولین مقصد ہے اس ماحول کے ڈھانچے کو بدل ڈالنا۔ ہمارا نصب العین ہے اس جاہلیت کی طنابیں اکھاڑ پھینکنا۔ وہ جاہلیت جو اسلامی اصولوں اور اسلامی تصورات سے بنیادی طور پر ٹکراتی اور ظلم و جبر کے ذریعہ ہمیں نظام الہی سے روکتی ہے۔

ہماری راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہم اس جاہلی ماحول اور اس کے اقدار و تصورات پر غلبہ حاصل کریں، مکمل غلبہ۔ اور اس تمنائیں کہ وہ ہم سے ہم آہنگ ہو جائے، اپنے اقدار و تصورات میں ذرا بھی ترمیم نہ کریں۔ خبردار! ہماری راہ اور ہے، اس کی راہ اور ہے۔ جس لمحہ ہمارا ایک قدم بھی اس کی معیت میں اٹھے گا، ہم اپنے پورے نظام سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، اور راہ سے بہت دُور جا پڑیں گے۔

بلاشبہ اس کے لیے مشقتوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ خطرات اور مصیبتوں سے گزرنا ہوگا، بڑی بڑی قربانیاں پیش کرنی ہوں گی۔ ایک سے ایک محرمیاں گوارہ کرنی ہوں گی۔ لیکن اگر یہ حوصلہ ہے کہ ہم اس پہلی اُمت کی راہ پر چلیں، جس کے ہاتھوں خدائے تعالیٰ نے نظام الہی کو قیام بخشا، نظام جاہلی پر اسے غلبہ عطا فرمایا تو ہمیں ان سب چیزوں کے لیے تیار رہنا ہوگا۔

نیز اگر ہم واقعہً جاہلیت سے باہر آنا چاہتے ہیں، اس طرح باہر آنا چاہتے ہیں جس طرح وہ بے مثال قرآنی اُمت باہر آگئی تھی تو مزدری ہوگا کہ ہم ہمیشہ اپنے نظام کے مزاج، اپنے موقف کے مزاج، اور اس راستے کے مزاج کا شعور رکھیں، جس پر چلنا ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر مقصد میں کامیابی ناممکن ہے۔

# قرآنی نظام کا مزاج

کھلاٹ اور رسدیں

﴿مکہ میں مکمل تیرہ سال تک قرآن نازل ہوتا رہا۔ اس پورے عرصے میں وہ بس ایک ہی مسئلہ پر زور دیتا رہا۔ ایک ہی عنوان سے بات کرتا رہا۔ ایک ہی قضیہ زیر بحث لاتا رہا۔ لیکن اس میں تکرار کی بد مزگی نہ ہوتی۔ قرآن اسے ہر بار ایک نئے انداز سے پیش کرتا۔ اس وقت ایسا لگتا گویا یہ نعمت سرمدی پہلی بار کانوں میں گونج رہا ہے۔﴾

وہ اس نئے دین کے سب سے عظیم، سب سے اولین اور سب سے بنیادی مسئلے — مسئلہ عقیدہ سے بحث کرتا۔ اس کی سب سے اہم بنیادیں ذہن نشین کراتا۔ بتاتا کہ الہییت کیا ہے؟ عبودیت کیا ہے؟ ان دو ٹولوں کا باہمی تعلق کیا ہے؟ بندے اور رب کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ وہ اس حقیقت کو "انسان" کے سامنے پیش کرتا، بحیثیت انسان کے ہر انسان اس کا مخاطب ہوتا۔ کیونکہ یہ ہر انسان کا اپنا مسئلہ ہے۔ اس اور انسان ہو یا اُس دور کا انسان، عربی انسان ہو یا عجمی انسان ہر انسان اس سے وابستہ ہے۔ یہ "انسان" کا وہ مسئلہ ہے جس کی اہمیت کبھی ختم نہیں ہو سکتی!! کیونکہ یہ اس کی ذات اور اس کے وجود کا مسئلہ ہے، وہ دنیا میں کس طرح آیا؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اہلئے جنس سے اس کا کیا تعلق ہے؟ کائنات کے خالق سے اس کے تعلق کی کیا نوعیت ہے؟ یہ سارے سوالات براہ راست اس کی ذات سے متعلق ہیں اور یہ سب عقیدے کے تحت داخل ہیں۔

مکی دور میں یہ قرآن انسان کو بتاتا تھا کہ وہ کیا ہے؟ یہ چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات کیا ہے؟ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس لیے آیا ہے؟ آخر کار اسے کہاں جانا ہے؟ کون ہے جو اسے پردہ عدم سے دینا ہے وجود میں لایا ہے؟ کون ہے جو اسے اس دنیا سے اٹھالیتا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہ ظاہری وجود جسے وہ محسوس کرتا اور اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، یہ ہے کیا؟ کائنات کے درپر جو ایک غیبی وجود وہ محسوس کرتا ہے جو اس کی نگاہوں سے تو اوجھل ہے، پر اس کی ایک ایک حرکت سے باخبر ہے، اس کی کیا حقیقت ہے؟ کون ہے جس نے یہ پراسرار وجود بنایا؟ کس کا ذہن ہے جو اس کے پیچھے کام کر رہا ہے؟ کون ہے جو اسے لٹو کی طرح گھما رہا ہے؟ کون ہے جو اس میں جیسی چاہتا ہے تبدیلیاں لاتا ہے؟۔ اس کائنات کے خالق اور خود اس کائنات کے ساتھ اس کا انداز کیا ہو؟ بندوں کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہو؟ کتے قد آنے والے سارے مسائل پر روشنی ڈالتا تھا۔ ان تمام پہلوؤں سے وہ انسانی ذہن کو مطمئن کرتا تھا۔ بلاشبہ عقیدے کا یہ مسئلہ ان انسان کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس کے بغیر اس کی شخصیت نامکمل رہتی ہے وہ "انسان" بننے سے محروم رہتا ہے۔ ایک مثالی سیرت اور معیاری شخصیت کی تعمیر اسی پر منحصر ہے، پہلے بھی منحصر تھی۔ آج بھی منحصر ہے۔ اور آئندہ بھی منحصر رہے گی، چاہے زمانہ کتنا ہی آگے نکل جائے۔

اس اہم ترین قضیہ کو ذہن نشین کرانے میں اسی طرح مکمل تیرہ سال بیت گئے۔ وہ قضیہ جس کے بعد انسان کی زندگی میں اگر کچھ ہے تو وہ اسی کے فروغ اور اسی کے تقاضے ہیں۔

مکی سورتیں آخر تک اسی محور پر گھومتی رہیں۔ وہ بار بار یہی مسئلہ چھیڑتی رہیں۔ انہوں نے اس کی فروعات سے۔ ان فروعات سے جن کا نظام

زندگی سے تعلق ہے، کوئی تعرض نہیں کیا، ہاں، یہ فروعات اس وقت تک موضوع بحث نہ بنیں۔ جب تک یہ مسئلہ پوری طرح واضح نہ ہو گیا۔ اس کی تشریح کا حق ادا نہ ہو گیا۔ اور اس گروہ کے دلوں میں وہ اچھی طرح جاگزیں نہ ہو گیا۔ جسے اللہ نے اپنے دین کے لیے منتخب کیا تھا۔ جس سے اقامتِ دین کی عظیم خدمت لینے کا فیصلہ کیا تھا، ایک ایسا عملی نظام رُو بکار لانے کا ارادہ کیا تھا، جس میں اس دین کی جلوہ گری ہو۔

آج جو لوگ دعوتِ دین کا کام کر رہے ہیں، عملی زندگی میں خدائی نظام کو قائم و نافذ کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں، انہیں چاہیے کہ اس اہم حقیقت پر ٹھہر کر غور کریں۔ اس حقیقت پر غور کریں کہ کئی قرآن تیرہ سال تک اسی عقیدے کو ذہن نشین کرتا رہا۔ اس عقیدے کی بنیاد پر جو نظام قائم ہونے والا تھا، مسلم معاشرے پر جن اصول و ضوابط کی حکمرانی ہوئے والی تھی، ان کی تفصیلات میں وہ نہیں پڑا۔

حکومت بربریس۔  
لغز و حقیقت

( حکومتِ الہی کا یہی تقاضا ہوا کہ عقیدے کا مسئلہ ہی فجرِ نبوت سے دعوت کا محور ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راہِ دعوت میں پہلا قدم ہی یہ ہو کہ آپ لوگوں کو لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی دعوت دیں۔ انسانوں کو ان کے حقیقی رب سے روشناس کرائیں، اور صرف اسی کے آگے نذر بندگی پیش کرنے پر اکسائیں۔

مگر کوتاہ بین اور نارسا عقل کا فیصلہ کچھ اور ہوگا۔ اس کے نزدیک یہ کوئی حکیمانہ طریقہ نہ تھا۔ عربی مزاج کو اس طرح ہم آہنگ کر لینا کچھ آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ وہ "الہ" کے معنی جانتے تھے "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ الوہیت کا مفہوم ہے، اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) وہ سمجھتے تھے کہ توحید یا خدائے تعالیٰ کے ساتھ الوہیت کی تخصیص کا مطلب ہے۔ کاہنوں، پر وہنتوں سرداروں

اور حکمرانوں کے ہاتھوں میں جو اقتدار گردش کر رہا ہے، اس سے انہیں بے دخل کر کے ساری بادشاہی اللہ کے لیے تسلیم کی جائے۔ دلوں پر بادشاہی ہو یا رسوم نیاز و بندگی پر، زندگی کی سرگرمیوں پر بادشاہی ہو یا مال و دولت کے خزانوں پر، فصل و قضا پر بادشاہی ہو یا ارواح و اجسام پر، یہ ساری بادشاہیاں براہ راست خدا — اور صرف خدا کے لیے ہوں۔ وہ خوب جانتے تھے کہ "لا الہ الا اللہ" اس دنیوی اقتدار کے خلاف اعلان جنگ ہے، جو الوہیت کی سب سے اولین خصوصیت پر غاصبانہ قبضہ کر لیتا ہے۔ ان اصول و ضوابط پر انتہائی کاری ضرب ہے۔ جن کی بنیاد یہی غاصبیت ہے۔ ان بادشاہتوں کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت ہے جو خدا سے منحرف ہو کر اپنی خانہ ساز شریعت کے مطابق حکمرانی کرتی ہیں — عربوں سے یہ بات پریشہ نہ تھی، وہ اپنی زبان کے خوب مزاج آشنا تھے "لا الہ الا اللہ" کی دعوت کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے تھے وہ جانتے تھے کہ ان کے اقتدار، ان کی سیادت اور ان کے اصولوں کے بالمقابل اس دعوت کے کیا اثرات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس دعوت یا اس تحریک انقلاب — کا اتنی درشت خوئی اور ترش روئی سے استقبال کیا، اور اس سے وہ جنگیں لڑیں جو خاص و عام کسی پر مخفی نہیں۔

پھر اس دعوت کے لیے یہ نقطہ آغاز کیوں ٹھہرا؟ حکمت الہی کا یہ تقاضا کیوں ہوا کہ زحمتوں کے چھتے کو شروع ہی میں چھیر دیا جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دین لے کر مبعوث ہوئے تو سر زمین عرب کا سب سے زرخیز اور مال دار خطہ عربوں کے ہاتھ میں نہ تھا، اخیار کے ہاتھوں میں تھا۔

شمال میں ملک شام پورا کا پورا روم کے زیر نگیں تھا۔ اس پر روم کے ماتحت امرائے عرب کی حکومت تھی۔ جنوب میں یمن کا پورا علاقہ ایران کے زیر اقتدار



تھا۔ اس پر ایرانیوں کے ماتحت امرائے عرب کی حکومت تھی۔ بیرونی اقتدار سے ہر طرح آزاد صرف حجاز، تہامہ اور نجد کے علاقے تھے ان کے علاوہ کچھ بے آب و گیاہ چٹیل بیابان تھے، جن میں کہیں کہیں کچھ زرخیز ٹکڑے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے ”صادق“ اور ”امین“ تھے۔ رسالت سے پندرہ ہی سال قبل اشرف قریش حجر اسود کے معاملہ میں آپ کو ثالث مان چکے تھے، آپ قریش کے سب سے اوسنے خاندان بنی ہاشم سے نسبت رکھتے تھے۔ بنی ہاشم میں بھی سب سے معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے لیے یہ آسان تھا کہ عرب قومیت کا نعرہ بلند کرتے۔ اور ان قبائل عرب کو یکجا کرنے کی سعی کرتے جو آپس کی خانہ جنگی سے بالکل بے دم ہو چکے تھے۔ اور اب قومی زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے۔ آپ ان کے قومی جذبات مشتعل کر کے سامراجی شہنشاہیتوں روم و ایران سے اپنے غضب شدہ علاقے آزاد کرانے کی مہم چلاتے۔ یہ بات کچھ مشکل نہ تھی کہ آپ عرب قومیت کا پرچم فضا میں لہراتے۔ اور جزیرہ عرب کے کونے کونے میں قومی وحدت کا صورت پھونک دیتے۔

اگر آپ اس طرح کے نعرے بلند کرتے تو پورے عرب کے دیدہ و دل فرس راہ ہوتے۔ اور آپ اقتدار وقت کشمکش کے نتیجے میں مکمل تیرہ سال تک ان حوصلہ شکن حالات سے دوچار نہ ہوتے!

اور جب اہل عرب اس طرح دل و جان آپ کے حوالہ کر دیتے، جب آپ کو اپنا سردار اور لیڈر تسلیم کر لیتے۔ اور جب زمام اقتدار آپ کے ہاتھ میں آجاتی اور سرتاج قیادت سے مزین ہو جاتا، تو آپ ان سب چیزوں سے عقیدہ توحید کی جڑیں استوار کرنے کا کام لیتے۔ لوگوں کو اپنا مطیع و منقاد بنانے کے بعد ان کا رخ ان کے رب کی طرف پھیر دیتے!۔

لیکن خدائے تعالیٰ نے — عظیم و حکیم خدائے تعالیٰ نے آپ کی اس

انداز پر رہنمائی نہیں فرمائی بلکہ حکم دیا کہ آپ لا الہ الا اللہ کا انقلاب اگیز  
 لعرہ بلند کریں، اور دعوت کو بالکل واشگاف انداز میں پیش کریں۔ پھر آپ اور  
 آپ کے گئے چنے ساتھی ان سارے زہرہ گداز مصائب کا سامنا کریں!  
 ایسا کیوں ہوا؟ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور مومنین کو خواہ مخواہ تشنگی میں ڈالنا  
 تو پسند نہیں کر سکتا، پھر ایسا کیوں ہوا؟ ایسا اس لیے ہوا کہ اس کام کا یہ طریقہ  
 تھا ہی نہیں۔ یہ بات کبھی مناسب نہیں ہو سکتی تھی کہ زمین رومی یا ایرانی طاغوت  
 سے آزاد ہو کر عربی طاغوت کے پنجے میں آجائے کیونکہ طاغوت تو سب طاغوت  
 ہی ہیں۔ زمین اللہ کی ہے۔ اور یہ اسی کی رہنی چاہیے اور اس کی یہ اسی وقت  
 رہ سکتی ہے جب کہ اس پر لا الہ الا اللہ کا پھر یہ الہرا ہا ہو۔ اس کی یہ  
 صورت ہرگز نہیں کہ اہل زمین رومی یا ایرانی طاغوت سے آزاد ہو کر عربی  
 طاغوت کے پنجے میں آجائیں کہ طاغوت تو جس جامہ میں ہو، طاغوت ہی  
 ہے! سارے انسان اللہ کے بندے ہیں۔ اور اللہ کے بندے وہ اسی  
 وقت رہ سکتے ہیں جب کہ لا الہ الا اللہ کا جھنڈا بلند ہو۔ لا الہ الا اللہ  
 کا مفہوم جیسا کہ ہر عربی واں جانتا ہے — یہ ہے کہ حاکمیت کا تاج  
 صرف اللہ ہے، شریعت بس اسی کی چلے گی۔ کسی کو کسی پر اقتدار نہیں۔ اقتدار  
 صرف خدا کا ہے۔ پھر اس لحاظ سے بھی یہ طریقہ ناموزوں اور بے جوڑ ہوتا کہ  
 اسلام کو جو ”قومیت“ مطلوب ہے وہ عقیدہ کی ”قومیت“ ہے جس میں  
 عربی، رومی، ایرانی، کسی کی تخصیص نہیں کہ یہ ساری قومیتیں، اور سارے رنگ  
 خدا کے جھنڈے تلے بالکل مساوی ہیں۔

اس طرح دعوتِ اسلامی کے مزاج و مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے

یہی طریق کار سب سے زیادہ موزوں اور نتیجہ خیز ہو سکتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو عرب سماج و دولت کی منصفانہ

تقسیم اور عدل و انصاف کے صحت مندانہ نظام سے یکسر بے گانہ تھا۔ کچھ

تھوڑے سے لوگ تھے جو دولت کے خزانوں اور تجارت کی منڈیوں پر قابض تھے اور سودی کاروبار کے ذریعہ اپنی دولت بڑھانے اور تجارت چمکانے میں سرگرم تھے۔ ورنہ بہت عظیم اکثریت ایسی تھی جو دو دو نواکے کو ترستی تھی اور تنگی و فاقہ مستی کے دن کاٹ رہی تھی۔ جن کے ہاتھوں میں دولت تھی وہی رتبہ و شرف کے مالک تھے ورنہ بہت بھاری اکثریت ایسی تھی جو مال و بجد ہر چیز سے محروم تھی!

کہا جاسکتا ہے کہ محمد — صلی اللہ علیہ وسلم — اس وقت چاہتے تو اکثر اکیٹ کا علم بلند کر کے طبقہ 'اشراف' کے خلاف آتش جنگ بھڑکا دیتے اور کوشش کرتے کہ طبقاتی ناہمواری دور ہو۔ مال داروں کی مقفل تجوریاں کھل جائیں، اور ناداروں کے جیب و دامن بھر جائیں!

اس وقت آپ اس قسم کی آواز اٹھاتے تو عرب سماج دو صفوں میں بٹ جاتا۔ عظیم اکثریت اس نئی دعوت کے ساتھ ہوتی جو شرف و جاہ اور دولت و سرمایہ کے خلاف محاذ قائم کرتی اور بہت ہی معمولی اقلیت اس موروثی جاہ و ثروت کی طرف سے صف آرا ہوتی۔ اس وقت یہ نسبت کبھی نہ آتی کہ پورا سماج "لا الہ الا اللہ" کے مد مقابل صف بستہ ہو جائے۔

اس طرح جب اکثریت آپ کی ہمنوا ہو جاتی، اپنی نکیل آپ کے ہاتھ میں دے دیتی، اور اقلیت پر بھی غلبہ حاصل ہو جاتا، اور اس کی زمام آپ کے ہاتھ میں آجاتی تو آپ اس اثر و رسوخ اور اقتدار سے عقیدہ توحید کی جڑیں استوار کرتے۔ شخصی اقتدار کے سامنے سرنگوں کر لینے کے بعد رب کے در پر لے جا کر انہیں جھکا دیتے!

لیکن خدائے تعالیٰ نے — عظیم و حکیم خدائے تعالیٰ نے اس انداز پر آپ کی رہنمائی نہیں فرمائی۔

خدائے تعالیٰ جانتا تھا کہ اصل طریقہ یہ نہیں ہے — وہ جانتا تھا کہ معاشرے میں عدل اجتماعی د

( ایک ہمہ گیر اعتقادی

تصور کے سوتے سے پھوٹنا چاہیے۔ جو سارے اختیارات کا مالک خدائے تعالیٰ کو سمجھے، دولت کی منصفانہ تقسیم اور انسانیت پروری یا اجتماعی کفالت سے متعلق جو بھی حکم اس کی طرف سے آئے۔ اسے معاشرہ کامل رضامندی کے ساتھ قبول کرے۔ ساتھ ہی لینے والے اور دینے والے دونوں کے ذہنوں میں یہ تصور ہو کہ وہ جس نظام سے منسلک ہیں، وہ ان کے مہربان آقا کا بنایا ہوا ہوا نظام ہے۔ اور اس حکیم الہی کی تابعداری ہی انہیں نہ صرف دنیا میں نہال کرے گی، بلکہ آخرت کی کامرانیوں سے بھی مالا مال کرے گی۔ اس وقت ایسا نہ ہوگا کہ کچھ دلوں میں تو حرص و آرزو کی نہ بچھنے والی پیاس ہو، اور کچھ سینے کینہ و حسد سے کھول رہے ہوں۔ اُس وقت کسی معاملے میں تلوار اور ڈنڈے کی محتاجی ہوگی، نہ دھمکی اور دہشت انگیزی کی، اور نہ اس قسم کی فضا ہوگی کہ دل گرٹھ رہے ہوں، اور روئیں گھٹ رہی ہوں۔ جیسا کہ ان سماجوں میں نظر آتا ہے۔ جو عقیدہ "لا الہ الا اللہ" کی برکتوں اور فیصیح بخششوں سے محروم ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت ہوتی تو اس وقت جزیرہ عرب میں گرچہ شہریت اور تمدن سے نا آشنا بدویت کی بہت سی خوبیاں بھی موجود تھیں لیکن اخلاقی سطح وہاں کی مختلف پہلوؤں سے بہت پست تھی۔

اس معاشرے میں ظلم و زیادتی کا بازار گرم تھا۔ اس وقت کے ایک حکیم شاعر "زہیر بن ابی سلمیٰ" کا یہ شعر اس خیال کی پُر زور تائید کر رہا ہے۔

ومن لم یزد عن حوضه بسلاحہ یدہم ومن لا یظلم الناس یظلم

"جو اپنے ہتھیار سے اپنے حوض کا دفاع نہیں کرے گا، اس کا حوض ڈھلایا

جائے گا اور جو دوسروں پر ستم نہیں کرے گا وہ خود مشق ستم بن جائے گا۔"

وہر جاہلیت کا مشہور و متعارف قول :-

انصر احوالک طالما و مظلوماً - "اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا

مظلوم،" بھی اس خیال کی حمایت کر رہا ہے۔

شراب نوشی اور جوئے بازی اس معاشرے کی عام دلچسپیاں تھیں اور ان کو وہ اپنے لیے سرمایہ افتخار سمجھتے تھے! جاہلی اشعار کا پورا دفتر اس تاثر کے حق بجانب ہونے پر گواہ ہے۔ طرفہ ابن العبد کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

فلولا ثلاث من من عيشة الفتى وجدك لما احفل متى قام عودي  
 ”اگر تین چیزیں نہ ہوں جو کہ آدمی کی زندگی کا جزو ہیں، تو تیری خوش نصیبی کی قسم مجھے اس کی پروا نہ ہو کہ (میری زندگی سے یا یوس ہو کر میرے بالیں سے) میرے تیار دار کب اٹھ گئے“

فمنهن سبقتي العاذلات بشرية كصيت متى ما تعل بالماء تزيد  
 ”انہی میں سے ملامت گر عورتوں کی ملامت سے بے پروا ہو کر ایسی شراب اور خوانی کے جام لٹھکانا ہے کہ اسے پانی سے اچھالا جائے، تو وہ جھاگ دے“  
 وما زال تشرابي الخمر و لذتي و بذلي و انفاقي طريفي و تالدي  
 ”میری شراب نوشی اور عیش کوشی جاری رہی اور موردی وغیر موردی دولت میں بے دریغ لٹا تا رہا“

إلى أن تحامتنى العشيّة كلها و افردت أفرادا لبعير المعبد  
 ”یہاں تک کہ پورا خاندان مجھ سے کٹ گیا اور میں خارشنی اونٹ کی طرح الگ ڈال دیا گیا۔“

قسم قسم کی بے حیائیاں اور بدکاریاں اس معاشرے کا طرہ امتیاز تھیں۔ اس کا بالکل وہی حال تھا جو ایک جاہلیت زدہ معاشرے کا ہوتا اور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں:-

جاہلیت میں چار قسم کے نکاح رائج تھے! ایک نکاح تو وہ تھا جو آج کل رائج ہے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کو اس کی بیٹی یا اس کی سرپرستی میں رہنے والی کسی لڑکی کے سلسلے میں پیام نکاح دیتا، پھر مہر دے کر اس سے نکاح کر لیتا۔ دوسرا نکاح یہ تھا کہ آدمی اپنی بیوی سے کہتا—جب وہ حیض

سے پاک ہو جاتی۔۔۔۔۔ فلاں شخص کو بلا بھیجو اور اس سے بیج لے لو اور اس کا شوہر اس سے الگ ہو جاتا۔ اور اس کو اس وقت تک ہاتھ نہ لگاتا جب تک اس بیج دینے والے شخص سے اس کا حمل نہ ظاہر ہو جاتا۔ حمل ظاہر ہو جانے کے بعد اگر اس کا جی چاہتا تو اس سے تعلق قائم کرتا۔ اور ایسا وہ محض اس لیے کرتا کہ بیٹا ہو نہا، ہو یا یہ نکاح نکاح استبضاع کے نام سے متعارف تھا۔ تیسرا نکاح یہ تھا کہ کچھ افراد جو دس سے نیچے ہی ہوتے، کسی عورت کے پاس جاتے اور اس سے مباشرت کرتے۔ چنانچہ حمل قرار پاتا۔ پھر بچہ پیدا ہوتا۔ بچہ کی پیدائش کو جب کسی راتیں گزر جاتیں تو وہ ان سب کو بلا بھیجتی سب اس کے پاس جمع ہوتے۔ کسی کی جرأت نہ ہوتی کہ اُن سے انکار کر دے، پھر وہ ان سے کہتی! جو کچھ ہوا اس کا علم تو تمہیں ہے ہی، میرے بچہ پیدا ہوا ہے اور اے فلاں وہ تیرا بیٹا ہے۔ جس کا چاہتی وہ نام لیتی۔ اور وہ لڑکا اسی کا ہو جاتا۔ وہ شخص اس سے انکار نہ کر سکتا۔ چوتھا نکاح یہ تھا کہ بہت سے لوگ اکٹھا ہوتے اور عورت کے حریم میں داخل ہوتے۔ جو بھی اس کے پاس جاتا وہ انکار نہ کرتی۔۔۔۔۔ یہ طوائفیں ہوتیں۔۔۔۔۔ یہ اپنے دروازوں پر جھنڈے گاڑے ہوتیں جن کی حیثیت سائن بورڈ کی ہوتی۔ جس کا بھی جی چاہتا اس کے لیے ان کا دروازہ کھلا ہوتا اور جب ان میں سے کوئی عورت حاملہ ہوتی اور بچہ جنتی تو وہ ایک تقریب مناتے اور قیافہ شناس بلائے جاتے وہ جس سے چاہتے اس بچے کو منسوب کر دیتے۔ چنانچہ وہ اس کو اپنا بچہ کہتا، اور وہ بچہ اس سے منسوب ہو جاتا۔ وہ اس کو لینے سے انکار نہ کر سکتا، (بخاری کتاب النکاح) کہا جاسکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس وقت ایک اخلاقی دعوت اور اصلاحی تحریک لے کر اٹھتے جس کے پیش نظر اخلاق کی اصلاح، معاشرے کی تطہیر، اور نفوس کا تزکیہ ہوتا تو یہ زیادہ بہتر شکل ہوتی۔

اس وقت آپ کو بہت سے ایسے نیک دل اور نیک نفس افراد مل

جاتے جو ان گندگیوں سے پریشان اور آزدہ تھے۔ جیسا کہ ہر اخلاقی مصلح کو ہر معاشرے میں ایسے لوگ مل جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو اسی دم جوش و حمیت لاحق ہوتی اور اس دعوت اصلاح و تزکیہ پر فوراً لبیک کہتے۔

اس طرح ابتدا ہی میں صلاح پسند، خوش اخلاق اور نیک نفس افراد پر مشتمل ایک اچھی خاصی جماعت آپ کی ہمنوا ہو جاتی جس کے لیے اس عقیدے کو قبول کرنا، اور اس کے مطابق حرکت میں آنا زیادہ آسان ہوتا اس وقت یہ ہرگز نہ ہوتا کہ "لا الہ الا اللہ" کی دعوت پہلے ہی قدم پر اتنی زبردست کشمکش کے شعلے بھڑکا دے۔

لیکن خدائے تعالیٰ جانتا تھا کہ صحیح راہ یہ نہیں ہے! وہ جانتا تھا کہ اخلاق کی بنا پر اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتی، جب تک اسے عقیدے کی اساس نہ حاصل ہو جو رد و قبول کے پیمانے فراہم کرے، قدروں کی تعیین کرے اس اتھارٹی کی تعیین کرے جو ان قدروں اور پیمانوں کا ماخذ ہو۔ پھر جزا و سزا کی بھی تعیین کرے جس کا اختیار اس اتھارٹی کو حاصل ہو جس کے مطابق وہ فرما بر داروں یا نافرمانوں کے ساتھ معاملہ کرے کیونکہ جب تک اس عقیدے کی جڑیں استوار نہ ہوں گی، اور اس اتھارٹی کی تعیین نہ ہوگی اس وقت تک وہ قدریں جھولے کے مثل جھولتی رہیں گی اور ان پر اخلاق کی جو عمارت کھڑی ہوگی اس کی بھی یہی کیفیت ہوگی نہ کوئی ضابطہ اخلاق ہوگا نہ اس پر کوئی احتساب کرنے والا ہوگا اور نہ کوئی جزا و سزا ہوگی۔

تو جب انتہائی جانفشانی کے بعد عقیدہ راسخ ہو گیا، اور وہ اتھارٹی متعین ہو گئی جو اس عقیدے کی اصل اور اس کا مصدر و منبع ہے۔ جب لوگوں نے رب کو پہچان لیا، اور تنہا اسی کو اپنا معبود مان لیا۔ جب دلوں میں "لا الہ الا اللہ" نے پوری طرح گھر کر لیا اور لوگ بندوں کی خدائی اور شہوات کی حکمرانی سے آزاد ہو گئے۔ تو اللہ نے اس کلمہ کے ماننے والوں

کے ہاتھوں وہ سب کچھ کر دکھایا، جو مجوزین اپنی تجویزوں میں پیش کر سکتے ہیں۔ زمین رومی اور ایرانی سامراج سے پاک ہو گئی۔ مگر اس لیے نہیں کہ اس پر عرب سامراج کا تسلط ہو۔ وہ رومی، ایرانی، عربی غرض ہر طاغوت سے آزاد ہو گئی۔ تاکہ اس پر صرف آقائے کائنات کا تخت سلطنت بچھے۔ اور ہر طرف بس اسی کے نام کا پرچم لہرائے۔

اس طرح سوسائٹی ہر قسم کے اجتماعی ظلم سے یکسر پاک ہو گئی اور ”نظام اسلامی“ قائم ہو گیا، جو عدلِ الہی کا نمونہ اور شریعتِ الہی کا پابند تھا، جو ہر چیز کو صرف اللہ کی میزان میں تو لتا تھا اور صرف اللہ کے نام پر عدلِ اجتماعی کا پرچم اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ پرچم جس کا نام تھا ”پرچم اسلام“ اس نام کے علاوہ اس کے یہاں اور کوئی نام نہ تھا اور اس پرچم پر نقش تھا ”لا الہ الا اللہ!“ اسی طرح ذہن و کردار میں پاکیزگی اور قلب و روح میں ستھرائی آگئی اور خدا کی طرف سے جو حدود و تعزیرات مقرر ہیں، ان سے کام لینے کی نوبت تک نہ آئی یا آئی تو بہت کم۔ کیونکہ نگرانی وہاں جسموں کے بجائے دلوں پر ہو رہی تھی۔ وہاں قصبوں اور محلوں میں نہیں، دل کے نہاں خانوں میں پولیس چوکیاں قائم تھیں۔ رضائے الہی اور ثوابِ آخرت کی طلب ان کی مرشد رہنما تھی اور خدا کے قہر و غضب کا خوف ان کا محتب اور نگران تھا۔

اس وقت انسانیت اپنے نظام، اپنے کردار، اور اپنی پوری زندگی میں اتنی بلند چوٹی پر پہنچ گئی کہ اس سے پہلے کبھی نہ پہنچ سکی تھی اور اس کے بعد بھی اگر کبھی پہنچی تو اسلام ہی کے سائے میں۔

یہ سب صرف اس لیے ہوا کہ جن لوگوں نے اس دین کو حکومت، نظام اور شرائع و احکام کی شکل میں قائم کیا، وہ اس سے پہلے اسے عقیدہ و کردار اور عبادات و معاملات کی شکل میں اپنے دلوں اور اپنی نگینوں میں قائم کر چکے تھے۔ اور اس دین کے قائم کرنے پر ان سے صرف ایک وعدہ تھا،



جس میں کسی قسم کا غلبہ و اقتدار شامل نہ تھا حتیٰ کہ خود ان کے ہاتھوں اس دین کے غالب آجانے کا بھی ان سے وعدہ نہ تھا۔ ان سے صرف ایک وعدہ تھا جس میں اس دنیا کی کوئی شے شامل نہ تھی۔ بس ایک وعدہ تھا، جنت — حوصلہ شکن کاوش، کم توڑ آزمائش، دعوت میں سرگرمی اور "لا الہ الا اللہ" کے ذریعہ جاہلیت سے پنجہ آزمائی کے صلہ میں ان سے صرف اسی ایک چیز کا وعدہ تھا! تو جب اللہ نے انہیں آزمایا، اور انہوں نے صبر و استقامت کا ثبوت دیا۔ جب ان کے دل حظِ نفس کی طلب سے خالی ہو گئے اور اللہ نے جان لیا کہ وہ اس دنیا میں کسی صلہ کے خواستگار نہیں، خواہ کوئی بھی صلہ ہو، خواہ یہی ہو کہ یہ دعوت ان کی بدولت غالب آجائے۔ اور ان کی کوششوں سے زمین پر دین قائم ہو جائے اور جب ان کے اندر نسل و نسب، قوم و وطن اور گھر اور خاندان پر فخر و ناز کرنے کی مسموم ذہنیت نہ رہی — تو اس وقت اللہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ اب یہ اس امانت کبریٰ کے امین بن سکتے ہیں۔ اب یہ اس عقیدے کے امین بن سکتے ہیں جس کی رو سے قلب و ضمیر، عبادات و معاملات، جان و مال، عادات و اطوار، غرض ہر شے پر حاکمیت کا حق صرف اللہ کو ہوگا۔ اور اب اگر ان کو اقتدار سونپا جائے تو اس کے ذریعہ شریعت الہی کو نافذ کر کے عدل الہی کی مثال قائم کریں گے۔ اپنی نسل و قوم اور کنبہ و خاندان کے لیے "سنہری" موقع سمجھتے ہوئے اس سے نفع اندوزی کی کوشش نہیں کریں گے۔ ان کے ہاتھ میں جو اقتدار ہوگا وہ بس اللہ کے لیے ہوگا اور اس کے دین و شریعت کی سر بلندی کے لیے ہی استعمال ہوگا۔ کیونکہ اس بات سے وہ غافل نہ ہوں گے کہ یہ اقتدار خدا کا ہے اور اسی کا دیا ہوا ہے۔

اگر دعوت کا آغاز اس انداز پر نہ ہوتا۔ اگر دعوت نے صرف یہی ایک پرچم — لا الہ الا اللہ کا پرچم بلند کر کے بقیہ پرچموں سے اپنا رشتہ نہ توڑ لیا ہوتا۔ اور اگر اس نے اس راہ کو اختیار نہ کیا ہوتا، جو راہ دیکھنے میں تو

بہت ہی ہوشیار اور پُر خار ہے۔ لیکن حقیقت میں بہت ہی آسان اور باعثِ خیر ہے، تو یقین مانئے اس مبارک نظام کا ایک حصہ بھی اتنے بلند پیمانے پر ظہور پذیر نہ ہوتا۔

پھر اس مبارک نظام میں اخلاص و ثقیبیت کی بوجھی نہ ہوتی، اگر یہ دعوت ایک قومی یا اجتماعی یا اخلاقی دعوت کی حیثیت سے اپنے سفر کا آغاز کرتی یا اپنے منفرد شعار لا الہ الا اللہ کے پہلو بہ پہلو کسی دوسرے شعار کا بھی علم اٹھائے ہوتی۔

کئی قرآن نے اگر دلوں اور ذہنوں میں ”لا الہ الا اللہ“ کی جڑیں استوار کرنے کی کوشش کی۔ اگر اس نے بظاہر دشوار ہونے کے باوجود یہ راہ اختیار کی۔ اور دوسرے بگلی راستوں سے علیحدہ رہا۔ آخر تک ان سے کنارہ کش رہا، تو اس کی وجہ یہی تھی۔

یہی بات کہ کئی قرآن نے صرف عقیدہ کے مسئلے کو ہاتھ لگایا اور اس کی اساس پر قائم ہونے والے نظام کی تفصیلات میں نہیں پڑا، نہ ان قوانین کی طرف کوئی توجہ دی جو اس کے معاملات کو سلجھاتے اور درست رکھتے ہیں۔ تو یہ بات بھی ایسی ہے کہ دعوتِ دین کے علمبرداروں کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود اس دین کے مزاج کا یہی تقاضا تھا۔ کیونکہ یہ ایک ایسا دین ہے جو سراسر وحدتِ الہ کی بنیاد پر قائم ہے، یہی وہ بنیاد ہے جو اس کی ساری تشریحات اور سارے احکام کا سرچشمہ ہے۔ جس طرح ایک بھاری بھر کم درخت، جس کی لمبی لمبی شاخیں انتہائی بلندی پر فضا کے کاندھے بوجھل کر رہی ہوں، جس کی موٹی موٹی ڈالیاں جگہ نہ پا کر باہم دست و گریباں ہوں۔ اور جس کا سایہ بہت ہی گنجان اور کافی وسیع رقبہ زمین پر قابض ہو۔ ناگزیر ہے کہ اس کی جڑیں بھی انتہائی گہری، مضبوط اور اسی کے بقدر زمین

میں دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔ بالکل یہی حال اس دین کا ہے۔ اس کا نظام پوری زندگی کو محیط ہے، وہ انسانیت کے سارے چھوٹے بڑے مسائل کو ہاتھ میں لیتا ہے۔ وہ انسان کی پوری زندگی کو منظم کرتا ہے۔ یہ دنیا ہو یا عالم آخرت ہو عالم شہود ہو یا عالم غیب ہو، نظر آنے والے مادی معاملات ہوں یا دل کے مخفی ارادے اور نیتیں ہوں وہ ان سب سے دلچسپی لیتا اور ان سب کے سلسلہ میں روشنی دیتا ہے، اس طرح وہ گویا بہت ہی عالی شان فلک بوس اور وسیع الاطراف قلعہ ہے جس کے لیے تقریباً اسی انداز کی بنیاد بھی لازمی ہے۔ انتہائی وسیع اور گہری محکم اور پائیدار۔

یہ اس دین کے اسرار اور اس کے مزاج کا ایک پہلو ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تعمیر و توسیع کے سلسلہ میں اس کا کیا اصول ہے۔ اس کے نزدیک صحیح اٹھان کے لیے ضروری ہے کہ عقیدے کی تعمیر انتہائی مضبوط و مستحکم ہو، وہ قلب و روح کے تمام گوشوں پر حاوی اور ریشہ ریشہ میں پیوست ہو، یہی چیز اس بات کی اہم ضمانت ہوگی کہ بعد میں آنے والی گونا گوں ذمہ داریوں کو اس کے ماننے والے سہار سکیں گے۔ نیز اسی طرح فضا میں پھیلی ہوئی شاخوں اور گہرائیوں میں اترتی ہوئی جڑوں کے درمیان توافق و ہم آہنگی قائم ہو سکے گی۔

چنانچہ جب عقیدہ "لا الہ الا اللہ" نے انتہائی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جمالیں، تو اسی لمحہ اس نظام نے بھی اپنے لیے جگہ پیدا کر لی جو "لا الہ الا اللہ" کی جلوہ گاہ اور اس کا منظر ہے۔ اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ تنہا یہی ایک نظام ہے جو اس عقیدے کے لذت آشنا دلوں میں باہر پاسکتا ہے۔ ان نفوس نے ابتدا ہی میں اس نظام کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، جب کہ ابھی اس کی تفصیلات بھی نہیں پیش کی گئی تھیں اور اس کی تشریحات بھی سامنے نہ آئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ پہلے ہی سر تسلیم خم کر دینا ایمان کا تقاضا ہے۔ اور اسی جذبہ تسلیم و رضا کے ساتھ ان نفوس نے بعد میں اسلامی احکام و قوانین کو شوق و محبت کے

ہاتھوں سے لیا۔ ان احکام کو سن کر انھوں نے کبھی چون و چرا نہ کیا۔ نیکو جان لینے کے بعد ان کی تنفیذ میں کچھ پس و پیش کیا۔ قرآن پاک کی دو ہی چار آیتوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ہی بولوں سے شراب نوشی، سو درخوار ہی، جوئے بازی وغیرہ ساری جاہلی عادتیں ختم ہو گئیں۔ جب کہ دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں ان میں سے ایک ایک چیز کے انسداد کے لیے اپنے قوانین و احکام، سلطنت و اقتدار، ریڈیو اور پریس، غرض ہر قسم کے دباؤ اور ہر طرح کے وسائل کے ساتھ اپنا سارا زور صرف کر ڈالتی ہیں، پھر بھی ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔ اور اگر کامیاب ہوتی ہیں تو بس اس حد تک کہ کھلم کھلا ان کی خلاف ورزی نہیں ہوتی، جبکہ پوری سوسائٹی اندر ہی اندر قانون شکنی اور آئین کی خلاف ورزی کے ناسور سے پک رہی ہوتی ہے!

اس دین کے مزاج کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، جس کا جلوہ اس بہترین نظام میں نظر آتا ہے۔ یہ دین ایک سنجیدہ حقیقت پسند اور تحریری نظام ہے۔ وہ آیا ہے تاکہ عملی زندگی کے مسائل پر حکمرانی کرے۔ وہ زندگی کے مسائل کا سامنا کرتا ہے تاکہ ان کے بارے میں اپنے فیصلے دے۔ چاہے تو انھیں جوں کا توں باقی رکھے، چاہے تو ان میں کچھ اصلاح و ترمیم کرے، اور چاہے تو سرنے سے بدل کر رکھ دے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ایسی ہی سوسائٹی میں آنے والے عمل کے سلسلہ میں قوانین و احکام دیتا ہے، جو اول روز سے صرف خدا کی جاہلیت کی قائل ہو۔

وہ کوئی "نظریہ" نہیں جس کی بنیاد مفروضات پر ہو۔ وہ ایک دستور ہے جو "واقعات" سے بحث کرتا ہے۔ لہذا سب سے پہلے ضروری ہے کہ ایک ایسا مسلم معاشرہ وجود میں آئے، جس کا عقیدہ ہو کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور جاہلیت کا حق صرف اللہ کو ہے۔ وہ خدا کے سوا ہر ایک کی جاہلیت کو ٹھکرا دے اور ہر ایسے نظام سے دست کش ہو جائے

جو اس کے علاوہ کسی دوسری بنیاد پر قائم ہو — جس وقت عملاً یہ معاشرہ قائم ہو جائے گا، اس کی ایک زندگی ہوگی جو اپنے ساتھ تمدنی مسائل رکھتی ہوگی، اور ان کے سلسلہ میں وہ ایک تنظیم اور دستور کی ضرورت مند ہوگی، بس یہی لمحہ اس دین کے لیے قانون سازی اور شریعت سازی کا ہوگا۔ کیونکہ اس وقت معاشرے کے افراد ان قوانین و احکام کے آگے بخوشی گردنیں خم کر دینے کے لیے تیار اور دوسرے قوانین و احکام سے بالکل بیزار ہوں گے۔

پھر اس عقیدے پر ایمان رکھنے والوں کے لیے ناگزیر یہ ہے کہ ان کو اپنے اوپر نیز سوسائٹی پر ایسا اختیار حاصل ہو جو اس سوسائٹی میں نظام اور قوانین کی تنفیذ کا ضامن ہو سکے، تاکہ اس نظام کا رعب اور ان قوانین کی سنجیدگی برقرار رہے۔ اس کے علاوہ اس سوسائٹی کو عملاً ایسی تمدنی زندگی بھی حاصل ہو جو فوری طور پر نظام اور قوانین کی متقاضی ہو۔

مکہ میں مسلمانوں کو نہ اپنے اوپر اختیار حاصل تھا نہ سوسائٹی پر۔ ان کو آزادی تمدنی زندگی بھی نہ حاصل تھی، جس کو وہ شریعت الہی کے ذریعہ منظم کرتے — یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قوانین و احکام نہیں اتارے۔ بس عقیدہ اتارا، اور وہ نظام اخلاق اتارا جو خود اسی عقیدے سے پھوٹتا ہے۔ جب وہ دل کی گہرائیوں میں جڑ پکڑ لیتا ہے۔ پھر جب مدینہ میں انھیں با اقتدار حکومت حاصل ہو گئی تو احکام اترے، اور وہ نظام آیا جو مسلم معاشرے کی عملی ضروریات سے براہ راست بحث کرتا ہے۔ نیز حکومت اسے اپنے محکم اقتدار کے بل پر نافذ کرنے کی ضامن ہوتی ہے۔

خدا کی مشیت یہ نہ ہوئی کہ مکہ ہی میں اُن پر پورا نظام اتار دے کہ وہ پہلے ہی سے ڈھلا ڈھلا یا تیار رہے، اور مدینہ میں حکومت قائم ہوتے ہی اس کا نفاذ ہو جائے کیونکہ یہ اس دین کے مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ اور اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور حقیقت پسند واقع ہوا ہے۔ اس کا یہ طریقہ نہیں کہ

کہ پہلے فرضی دشواریوں کا ایک پہاڑ کھنڈا کر لے پھر ان کے فرضی حل تلاش کرے۔ وہ تو عملاً درپیش واقعات کا سامنا کرتا ہے۔ ایک ایسے مسلم معاشرے کے واقعات و مسائل کا سامنا کرتا ہے جو شریعت الہی کے سامنے تسلیم خم کر چکا ہو۔ اور اس کے علاوہ ساری شریعتوں سے بالکل بیخبر و سردار ہو۔ وہ واقعات سے بچت کرتے ہوئے معاشرے کے خدوخال، نشیب و فراز اور اندرونی حالات کو سامنے رکھتا ہے تاکہ اسی لحاظ سے وہ احکام و قوانین صادر کرے۔ آج جو لوگ اسلام کی طرف سے اس بات کے آرزو مند ہیں کہ وہ نظریات کا پورا خاکہ تیار کر کے رکھ دے، نظام کا پورا ڈھانچہ بنا کر پیش کر دے اور سارے قوانین زندگی کا نقشہ مرتب کر کے دے دے۔ جب کہ اس وقت روئے زمین پر کسی ایسے معاشرے کا وجود نہیں۔ جس نے عملاً شریعت الہی کو اپنا حاکم تسلیم کر لیا ہو، اور بقیہ ساری شریعتوں سے بے تعلق و بیزار ہو، پھر اس کو وہ اقتدار بھی حاصل ہو جو اس راہ کی ساری چٹانوں کو پاش پاش کر دے۔ جو لوگ اسلام سے اس بات کی توقع اور آرزو رکھتے ہیں وہ اس دین کے مزاج سے ہی نا آشنا ہیں۔ وہ اس بات سے نا آشنا ہیں کہ خدا کے ارادہ و مشیت کے مطابق یہ دین میدان زندگی میں کس طرح برسر عمل ہوتا ہے۔

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مزاج، اپنے اصول اور اپنی تاریخ کو کبیر بدل ڈالے۔ تاکہ وہ انسانی اصولوں اور انسانی نظریات کی صف میں کھڑا ہو سکے۔ ان کی کوشش ہے کہ وہ اسے جلد از جلد اصل شاہراہ سے کنارے ڈال دیں، تاکہ وہ ان کی خواہشوں سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ان خواہشوں سے جو فرد انسانی نظریات کے مقابلے میں ذہنی مرعوبیت اور روحانی شکست کا نتیجہ ہیں۔ ان کی آرزو ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے نظریات و مفروضات کے قالب میں ڈھال لے جن کا عملاً کوئی مستقبل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن مشیت

الہی کا تقاضا ہے کہ یہ دین اس کی مرضی کے تابع رہے ایک ایسے عقیدہ کی شکل میں رہے جو دل کو اپنی تجلیوں سے معمور کر دے، اور ضمیر کو اپنے آگے سرنگوں کر لے، کہ لوگ بس خدا کے آگے جھکیں۔ شریع و احکام صرف اسی سے لیں۔ اور کسی دوسرے کی طرف رخ بھی نہ کریں، اور جب اس عقیدے کو ماننے والے افراد پیدا ہو جائیں، اور معاشرے میں انھیں عملاً اقتدار بھی حاصل ہو جائے، تو ان کی واقعی ضروریات کی تکمیل اور عملی زندگی کی تنظیم کے لیے تشریحی قوانین دیے جائیں۔

یہ ہے وہ بات جو خدا چاہتا ہے۔ اور ہوگا وہی جو خدا چاہتا ہے خواہ لوگوں کے کیسے ہی جذبات ہوں!

دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں کو یہ بات بھی اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیے کہ وہ جب لوگوں کو یہ دین دوبارہ قائم کرنے کی دعوت دیں تو ضروری ہوگا کہ سب سے پہلے انھیں اسی عقیدے کی دعوت دیں۔ خواہ وہ لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہوں، اور حکومت کے رجسٹروں میں ان کا اندراج مسلمانوں ہی نام سے ہو!۔ ضروری ہوگا کہ وہ انھیں بتلائیں کہ اسلام نام سے سب سے پہلے عقیدہ "لا الہ الا اللہ" کو اس کے حقیقی مفہوم کے ساتھ تسلیم کرنے کا اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ وہ سارے معاملات میں حاکم صرف خدا کو مانیں اور جو لوگ اپنے لیے حاکمیت کا دعویٰ کر کے خدا کی خدائی کو چیلنج کرتے ہیں ان کو بری طرح ٹھکرا دیں۔ اس عقیدے کا اقرار جہاں وہ دلوں میں کریں اور عبادات سے اس کا ثبوت دیں، وہیں ان کی سرگرمیوں اور ساری کاوشوں میں بھی اسی کا جلوہ ہو۔

اسی چیز کو دعوتِ اسلامی کی بنیاد ہونا چاہیے، پہلی بار یہی دعوتِ اسلام کی بنیاد تھی۔ یہی دعوت تھی جس کے ذرائع کا مل تیرہ برس تک مکی قرآن سرانجام دیتا رہا۔ تو جب اس دین میں اس کے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے انسانوں





بقیہ ساری شریعتوں اور تمام قوانین سے یکسر دستکش ہو جائیں۔ وہ اس کا انتظار نہ کریں کہ ان کے سامنے تفصیلی شریعت آئے، جو ان کے دلوں کو دین کی طرف راغب کرے! ناگزیر ہے کہ نظام الہی سے رغبت خدائے تعالیٰ کے لیے مکمل حوالگی و سپردگی اور دوسری ساری طاقتوں سے کامل آزادی کے نتیجے میں ظہور میں آئے۔ نہ کہ اس لیے کہ پیش کیا جانے والا نظام فی نفسہ ان کے اپنے آزمودہ نظاموں کے مقابلے میں فلاں فلاں پہلوؤں سے بہتر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نظام الہی فی نفسہ بہتر اور موجب خیر و برکت ہے، کیونکہ وہ خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اور بندوں کا بنایا ہوا قیامت تک خدا کے بنائے ہوئے جیسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ دعوت کی بنیاد نہیں۔ دعوت کی بنیاد ہے صرف حکم الہی کو ماننا، خواہ وہ کوئی بھی ہو، اور دوسرے تمام قوانین و احکام کو مسترد کر دینا، خواہ وہ کیسے ہی ہوں۔ اسی کا نام ہے اسلام۔ اسلام کا اس کے علاوہ اور کوئی مفہوم نہیں۔ توجہ شخص ابتدا ہی میں اسلام کی طرف راغب ہو گیا اُس نے گویا دو ٹوک فیصلہ کر لیا۔ اور اب اس کو اس کی حاجت نہیں رہی کہ نظام اسلامی کی خوبیوں اور رعنائیوں کے ذریعہ اسے راغب کیا جائے۔ یہ ایک انتہائی روشن اور واضح ترین حقیقت ہے جو کسی دلیل و برہان کی محتاج نہیں۔

اب یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ تیرہ سال کے عرصہ میں نئی قرآن نے مسئلہ عقیدہ کی مہم کس طرح سر کی۔ اُس نے عقیدے کو "نظریہ" کی شکل میں پیش کیا، نہ "الہیات" کی شکل میں، اور نہ کلامی بحثوں ہی کی صورت میں، جیسا کہ عقائد اور علم کلام کی کتابوں میں نظر آتا ہے۔

یاد رہے! قرآن کریم انسان کو قدرت الہی کے ان کرشموں کی طرف متوجہ کرتا، جو اس کے گرد و پیش کی دنیا اور خود اس کے اپنے ذاتی وجود کے افق پر نظر آتے ہیں۔ وہ بتاتا کہ آسمان و زمین اور ان کے مابین نیز انسان کی اپنی ذات کے اندر عجائب قدرت و خلقت کی کیسی کیسی عظیم الشان نشانیاں ہیں، جن سے

خدا کی توحید اور اس کی پروردگاری کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ انسانی فطرت کے جمود و تعطل کو دور کرتا، غلط تصورات و عقائد کے شکنجوں سے اسے آزاد کرتا، انسان کے اندر آگے بڑھنے کی جو فطری صلاحیتیں ودیعت ہیں، ان کو صیقل کرتا، وہ اس زندگی کو کھڑپتا جس نے ان کی صلاحیتیں کند کر دی تھیں، اور فطرت کے بند دریچے کھولتا، تاکہ وہ موثر دلائل و حقائق سے اثر پذیر ہو، اور پوری بے تابی شوق کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرے۔ یہ تو اس کا عام انداز تھا۔ ورنہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ عقیدے کی تکرار ہاتھ میں لیے ہوئے زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھتا۔ وہ زندگی کی گریبا گرم واقعاتی رزم گاہ میں اترتا، اور فطرت کو معطل کر دینے والے جمود سے برسرجنگ ہوتا۔ وہ موجودہ ذہنوں کو پوری قوت سے جھنجھوڑتا، اور غلط تصورات و عقائد کی ”بھول بھلیاں“ سے نکال کر انھیں باہر لاتا۔ یہیں سے یہ بات خود بخود بے نقاب ہو جاتی ہے کہ ”نظریہ“ کا ڈھانچہ اس عقیدے سے دور کی بھی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ عملی زندگی میں واقعہ پیش آنے والی مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا کرتا ہے، نظریہ کی طرح محض لفظی اور کاغذی رکاوٹوں سے ہی مقابلے پر اکتفا نہیں کرتا۔ اسی طرح عقلی مجادلہ یا ذہنی جنگ — جس کی بنیاد اس منطقی پر ہے۔ جو بعد کے ادوار میں علم کلام کی بنیاد رہی ہے — اس سے ذرا بھی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ کیونکہ قرآن محض ذہنی معرکہ آرائیوں پر ہی بس نہ کرتا، بلکہ وہ پورے انسانی معاشرے کو سامنے رکھتا۔ وہ عملی طور پر پیش آنے والے سارے مسائل سے بحث کرتا، اور سارے انسانوں کو انہی علائق زندگی کے منجدھار میں خطاب کرتا۔ اسی طرح ”الہیات“ کا مزاج بھی اس سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتا تھا، کیونکہ عقیدہ اسلامی ”گرچہ ایک عقیدہ ہے۔ مگر وہ عملی زندگی کے مسائل سے بحث کرتا ہے۔“ ”نظریہ“ اور ”الہیات“ کی طرح محض تخیلات و مفروضات کے غبارے نہیں اڑاتا۔

قرآن جس وقت مسلم جماعت کے دلوں میں عقیدے کی تعمیر کر رہا تھا، وہ اس

مسلم جماعت کے ساتھ گرد پیش کی جاہلیت سے زوروں کی جنگ بھی لڑ رہا تھا۔ اسی طرح خود اس مسلم جماعت کے ضمیر و اخلاق اور اس کے اپنے معاشرے میں جاگزیں جاہلیت سے بھی وہ جنگ و پیکار میں مصروف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدے کی تعمیر ”نظریہ“ کی شکل میں ہوئی۔ نہ ”الہیات“ کی شکل میں اور نہ ”کلامی بحثوں“ ہی کی شکل میں۔

\_\_\_\_\_ بلکہ ایک منظم اور زندگی سے بھرپور تحریک اور مسائل زندگی سے بحث کرنے والی تنظیم کی صورت میں ہوئی۔ چنانچہ مسلم جماعت نے اعتقادی تصورات کے لحاظ سے جو منزلیں طے کیں، ان کے مطابق اس نے جو عملی سرگرمیاں اختیار کیں اور پھر جاہلیت سے جو منظم کشمکش برپا کی، یہ سب عقیدے ہی کی نشوونما کا زندہ نمونہ یا اس کی عملی تفسیر تھی۔ اور غور کیا جائے تو یہ اسلام کا وہ اصول ہے جو اس کے مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔

کارکنانِ دعوتِ اسلامی کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اس دین کے مزاج اور تحریک کے سلسلہ میں اس کے ان اصولوں سے پوری طرح آگاہ رہیں تاکہ انہیں یہ معلوم رہے کہ تعمیرِ عقیدہ کا مرحلہ جو کئی دور میں اتنا دراز ہو گیا، وہ تحریکِ اسلامی کی عملی تشکیل اور مسلم جماعت کی واقعی تعمیر سے غافل نہ تھا، وہ ”نظریہ“ سے آگہی اور اس پر ریسرچ کا مرحلہ نہ تھا۔ بلکہ بیک وقت عقیدہ، اجتماعات، تحریک اور عملی زندگی کی اساسی تعمیر کا مرحلہ تھا۔ اور جب بھی کبھی دوبارہ یہ تعمیر کرنی ہو تو ضروری ہے کہ بالکل اسی انداز پر ہو۔

تعمیرِ عقیدہ کا مرحلہ اسی طرح دراز ہونا چاہیے۔ اور یہ تعمیر بہت ہی سبر و سکون اور غور و تامل سے ہونی چاہیے کہ اس میں گہرائی بھی ہو اور جہاؤ بھی۔ پھر اس مرحلے میں عقیدہ فکری ریسرچ کا موضوع نہ بنے بلکہ واقعات کی دنیا میں ایک زندہ و تابندہ حقیقت بن کر نظر آئے۔ افراد کے دل اس کی بجلیوں سے معمور اور زندگیاں اس کی فیض بخششوں کی صحیح آیلندہ دار ہوں۔

اس کی تیار کی ہوئی اجتماعی تنظیم درحقیقت عقیدے ہی کا محسوس پیکر اور اس کے نشو و ارتقا کا کامل منظر ہو۔ اور اس کے ہاتھوں جو تحریک وجود میں آئے، وہ لشکرِ باطل کے لیے تیغِ بڑاں اور خرمین جاہلیت کے لیے برقی سوزاں ہو۔ پھر یہ جنگ جہاں ذہن و دماغ میں لڑی جائے وہیں بیرونی دُنیا میں بھی لڑی جائے تاکہ عقیدے کو ایک زندہ پیکر نصیب ہو سکے اور وہ معرکہ کی شور و شوش میں صحت مند پرورش پاسکے۔

اسلامی نقطہ نظر سے یہ بڑی ہی ناش غلطی ہے کہ عقیدہ محض ایک "نظریہ" کی شکل میں سامنے آئے، جو صرف ذہنی ریسرچ یا تقابلی اطلاع و واقفیت کی چیز ہو۔ پھر یہ ایک ناش غلطی ہی نہیں، انتہائی عظیم خطرہ بھی ہے عقیدے کی تعمیر میں قرآن نے کامل تیرہ سال اس لیے نہیں لگا دیے کہ وہ پہلے پہل نازل ہو رہا تھا۔ یہ بات ہرگز نہ تھی؛ اگر خدا چاہتا تو پورا قرآن یکبارگی نازل کر دیتا پھر مسلمانوں کو چھوڑ دیتا کہ وہ تیرہ سال یا اس سے کم یا زائد مدت تک اسے پڑھتے پڑھاتے رہیں، یہاں تک کہ پورے "نظریہ اسلامی" پر حاوی ہو جائیں، اگر خدا ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا اس کے لیے یہ کچھ مشکل نہ تھا۔

مگر اسے کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ ایک خاص اور بالکل ہی نیا طرز اختیار کرنا چاہتا تھا، وہ بیک وقت ایک جماعت، ایک تحریک اور ایک عقیدے کی تشکیل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جماعت اور تحریک کا سرچشمہ عقیدہ ہو، اور عقیدے کا استحکام جماعت اور تحریک سے وابستہ ہو۔ جماعت میں حرکت و سرگرمی عقیدے ہی کی راہ سے ہو اور یہی حرکت و گرمی عقیدہ کا عملی ظہور ہو۔ اور وہ جانتا تھا کہ اشخاص و جماعت کی تعمیر ایک دن رات کا کام نہیں، لہذا ناگزیر تھا کہ عقیدے کی تعمیر میں اتنی ہی مدت صرف ہو جتنی اشخاص و جماعت کی تعمیر کے لیے درکار ہے۔ یہاں تک کہ جب عقیدے میں سنجیدگی

آجائے تو جماعت ہی اس نچنگی کا عملی اور حقیقی مظہر ہو۔

یہ ہے اس دین کا مزاج — جیسا کہ قرآن کئی کے انداز سے صاف واضح ہے — ناگزیر ہے کہ ہمیں اس کے اس مزاج کا صحیح شعور ہو، اور ہم اپنی ان خواہشات کے پیچھے جو محض عاجلہ پسندی اور انسانی نظریات کے مقابلہ میں احساس شکست کا نتیجہ ہیں، اس کے اس مزاج کو بدلنے کی سعی نہ کریں، کیونکہ اسی مزاج کی بدولت اس نے پہلی بار اُمتِ مسلمہ کو وجود بخشا تھا۔ اور اب بھی کبھی اس انداز کی اُمتِ مسلمہ دوبارہ منصفہ شہود پر لانے کی کوشش کی جائے گی تو دین کے اسی مزاج کی رعایت کرنی ہوگی۔

زندہ و تابندہ عقیدہ اسلامی جو فطری طور پر ایک زندہ و متحرک اور نوپنڈیر معاشرے اور ایک فعال و پر جوش اور منظم تحریک کی صورت میں بساط کائنات پر جلوہ افروز ہونا چاہتا ہے، اگر اس کو محض ایک نظریہ کی شکل میں پیش کیا جائے، تاکہ روئے انسانی نظریات کے بالمقابل وہ بھی کھڑا ہو سکے، اور ان کی طرح ذہنی ریسرچ یا ثقافتی اطلاع و واقفیت کا وسیلہ بن سکے، تو یہ کس قدر غلط اور خطرناک اقدام ہوگا! اس کا ہمیں احساس ہونا چاہیے۔

عقیدہ اسلامی چاہتا ہے کہ کچھ زندہ و متحرک افراد اس کی چلتی پھرتی تصویر ہوں، اور پھر وہ ایک عملی تنظیم یا ایک ایسی تحریک کی شکل میں منظر عام پر آئے جو اپنے گرد و پیش کی جاہلیت سے برسرِ پیکار ہو ساتھ ہی وہ خود اپنے افراد کے اندر سرایت کیے ہوئے جاہلی اثرات سے بھی برسرِ جنگ ہو۔ کیونکہ جب تک ان کے دل عقیدے کی ضیا پاشی سے محروم، اور جاہلی ماحول کی مسموم فضاؤں سے مازں تھے، اس وقت تک تو وہ جاہلیت ہی کے علمبردار تھے۔ اور اس صورت میں عقیدہ نظریہ کی بہ نسبت قلب و دماغ — اور خود زندگی — کے زیادہ وسیع دائرے پر حاوی ہوگا۔ اس کے دائرے میں نظریہ اور اس کے اصول تو داخل ہوں گے، لیکن یہی اس کے دائرے کی آخری حد نہ ہوگی۔

اگر ہیت، کائنات، زندگی اور انسان کے سلسلہ میں اسلامی تصور انتہائی مکمل اور جامع تصور ہے، لیکن ساتھ ہی وہ ایک حقیقت پسند اور ایجابی تصور ہے۔ اس کو طبعی طور پر یہ بات انتہائی ناگوار ہے کہ وہ محض ذہنی اور علمی تصور کا ایک تجریدی ڈھانچہ بن کر رہ جائے کیونکہ یہ بات اس کی غایت اور اس کے مزاج کے ہی خلاف ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ افراد حقیقی معنوں میں اس کی عملی تصویر ہوں اور اس طرح وہ ایک زندہ تنظیم اور ایک عملی تحریک کی شکل میں نمودار ہو۔ نشو و ارتقار کے سلسلہ میں اس کا اصول یہی ہے کہ وہ متحرک افراد زندہ تنظیم اور انتہائی فعال تحریک کی آغوش میں پرورش پانا چاہتا ہے، تاکہ عین اس وقت جبکہ وہ نظری طور پر درجہ کمال کو پہنچے، عملی طور پر بھی کمال کی سرحدیں چھو رہا ہو، اور خالص "نظریہ" کی شکل میں نہ رہے، بلکہ ایک زندہ "وجود" کی شکل میں نمودار ہو۔

ہر وہ نظری ارتقار جس کے ساتھ ساتھ عملی اور تحریکی ارتقار نہ ہو وہ غلط ہے اور ساتھ ہی ایک عظیم خطرہ بھی ہے۔ اس دین کے مزاج، اس کی غایت اور اس کی داخلی تنظیم کے اصولوں سے یہی بات مترشح ہوتی ہے۔

خدا نے تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَقْرَانًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَ عَلَى النَّاسِ  
عَلَىٰ مَكَّةَ وَنَزَّلْنَاهُ نَزِيلًا  
د سورہ الاسراء ۱۰۶

اور قرآن کو ہم نے حصے حصے کر کے اتارا تاکہ  
تم ٹھہر ٹھہر کر اسے لوگوں کے سامنے پڑھو، اور  
اسے ہم نے انتہائی بہتر انداز سے اتارا ہے۔

معلوم ہوا کہ قرآن پاک کو حصے حصے کر کے اتارنا بھی پیش نظر تھا، اور اسے  
ٹھہر ٹھہر کر پیش کرنا بھی مطلوب تھا، کہ عقیدے کی اینٹوں سے تیار ہونے والی  
یہ عمارت ایک "زندہ و فعال تنظیم" کی شکل میں تیار ہو، نہ کہ محض ایک "نظریہ"  
کی صورت میں!

اس دین کے علمبرداروں کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ جہاں وہ ایک

خدائی دین اور خدائی نظام ہے، وہیں اس کا طریق کار بھی خدائی طریق کار ہے۔ اور وہ اپنے مزاج سے کبھی الگ نہیں ہو سکتا۔ اس دین کو کبھی اس کے طریق کار سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح یہ جان بھی ضروری ہے کہ یہ دین جس طرح فاسد تصورات و عقائد اور پھر معاشرے کو بدلنے آیا ہے اسی طرح وہ ان اصولوں کو بھی بدلنے آیا ہے جن سے عقائد و تصورات کی تعمیر ہوتی اور پھر نتیجتاً معاشرے میں تبدیلی آتی ہے۔ وہ آیا ہے تاکہ بیک وقت عقیدہ اور امت دونوں کی تعمیر کرے، اور اسی لحاظ سے ایک خاص طرز فکر کی بنا ڈالے۔ اس کے خاص طرز فکر، خاص نظام اعتقاد و عقائد (ہیڈ لائن) مخصوص تعمیر معاشرہ میں کوئی فرق نہیں کہ یہ سب ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ایک ہی پھول کی پنکھڑیاں اور ایک ہی شجر کی ڈالیاں ہیں۔

ہم نے جس انداز سے ابھی وضاحت کی ہے، اس انداز سے اس دین کے طریق کار کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہی اس کا اصل طریق کار ہے۔ گویا ایسا نہیں کہ یہ طریق کار کسی خاص مرحلے، یا خاص ماحول یا مخصوص حالات سے تعلق رکھتا ہو۔ اس پہلے گروہ مسلم کی تشکیل کے وقت جو حالات تھے، ان کے ساتھ کوئی خصوصیت رکھتا ہو۔ بلکہ یہ طریق کار اب بھی اور دائمی ہے۔ زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے۔ یہ وہ طریق کار ہے جسے اپناٹے بغیر کسی بھی دور میں اس دین کا تاج محل نہیں تعمیر ہو سکتا۔

اسلام کا کام صرف یہی نہ تھا کہ وہ انسانوں کے عقائد اور ان کی معاشرت کو بدل دے۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ لوگوں کے طرز فکر پر بھی اپنی چھاپ ڈالے اور اعتقاد و معاشرت کے سلسلہ میں ان کے نقطہ نظر کو بدل کر رکھ دے۔ کیونکہ وہ خدائی طریق کار ہے جو اپنے مزاج میں بودے اور نیم جاں انسانی نظریات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ دور کی بھی مناسبت نہیں رکھتا۔

یاد رہے! خدائی تصور اور خدائی طرز زندگی تک ہماری انسانی ممکن نہیں جب

ہم خدائی طرز فکر نہ اپنائیں، وہ طرز فکر کہ خدائے تعالیٰ انسانی طرز فکر کی بنیاد بنانا چاہتا ہے تاکہ ہمارے تصور و اعتقاد، اور معاشرتی تعمیر میں کسی بھی قسم کا فتور یا ناہمواری راہ نہ پاسکے۔

جس وقت ہمارے اندر یہ ہو کہ اٹھتی ہے کہ ہم اسلام کو ایک ”نظریہ“ بنا کر پیش کریں جو تحقیق و ریسرچ کا موضوع بن سکے۔ اس وقت ہم الہی طرز تشکیل اور خدائی انداز فکر سے اس کا رشتہ کاٹ کر انسانی طرز ہائے فکر کے سامنے اسے سرنگوں کر دیتے ہیں! گویا خدائی طریقہ انسانی طریقوں سے کمتر اور حقیر ہے! اور گویا ہم تصویب اور تحریک کے سلسلہ میں خدائی نظام کو اونچا اٹھا کر انسانی نظاموں کے بالمقابل کھڑا کرنا چاہتے ہیں!

اس پہلو سے یہ بات کتنی خطرناک اور یہ مرعوبیت کس قدر مہلک ہے! نظام الہی ہم تحریک اسلامی کے علمبرداروں کو ایک خاص طرز فکر عطا کرتا ہے تاکہ ہم ان جاہلی طرز ہائے فکر کے اثرات سے محفوظ رہ سکیں، جن کی آج ساری زمین پر حکمرانی ہے، ہماری عقلیں جن سے بری طرح مرعوب ہیں، جن کے جراثیم سے ہماری تہذیب تک محفوظ نہیں۔ اب اگر ہم اس دین کو ایک ایسے طرز فکر کی رہنمائی میں اپنانے لگیں جو وقت کے حکمراں جاہلی طرز ہائے فکر سے ماخوذ اور خود اس دین کے مزاج کے لیے بالکل ہی نامانوس ہو تو گویا ہم اس دین کا وہ مقصد ہی فوت کر دیں گے جس سے وہ انسانیت کو ہمکنار کرنے آیا تھا۔ ساتھ ہی ہم اس دور کے سربرآوردہ جاہلی نظاموں کے دباؤ سے اپنے کو آزاد بھی نہ کر سکیں گے اور ذہن و دماغ اور قلب و روح کی گہرائیوں میں اترے ہوئے جاہلی اثرات سے گلو خلاصی حاصل کرنے کا یہ سنہری موقع کھو بیٹھیں گے۔

اس پہلو سے بھی یہ بات کتنی خطرناک اور یہ خسارہ کس درجہ مہلک ہے! بلاشبہ قصر اسلام کی تعمیر میں خدائی طرز فکر اور خدائی طریق کار کو بالکل وہی اہمیت حاصل ہے جو خود عقیدہ اور نظام زندگی کو حاصل ہے۔ دونوں ایک دوسرے



سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اب اگر ہمارے اندر یہ خواہش ابھرتی ہے کہ اس تصور اور اس نظام کو لوگوں کے سامنے مجرد علمی بحثوں کے انداز میں پیش کریں تو ہم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہنی چاہیے کہ اس سے "اسلام" زمین پر ایک عملی تحریک کی شکل میں قائم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ حقیقت بھی ہم سے اوجھل نہیں رہنی چاہیے کہ اس صورت میں اسلام کو پیش کرنے سے بس وہی لوگ نائدہ اٹھا سکیں گے جو عملاً تحریک اسلامی سے وابستہ ہوں گے اور وہ فائدہ بھی بس اتنا ہوگا کہ عملاً تحریک سے وابستہ رہ کر وہ جس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں، بس اسی حد تک وہ اس سے اپنی عملی زندگی میں کچھ رہنمائی حاصل کر سکیں گے۔

میں دوبارہ کہتا ہوں یہ بات انتہائی ناگزیر ہے کہ تصور و اعتقاد فوراً بغیر کسی تاخیر کے ایک تحریک کی شکل اختیار کریں۔ ساتھ ہی وہ تحریک عقیدے کی صحیح نمائندہ اور اس کی سچی تصویر ہو۔

میں پھر کہتا ہوں کہ خدا کے پسندیدہ دین اسلام کا یہی فطری انداز ہے اور یہی انداز زیادہ بلند، زیادہ درست، زیادہ مؤثر اور انسانی فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے، اس کے برعکس یہ انداز انتہائی غلط اور بالکل ہی خلاف فطرت ہوگا کہ ابتدا ہی میں تمام نظریات مرتب کر کے لوگوں کے سامنے خشک علمی انداز میں پیش کر دیے جائیں، اور اس کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ بالفعل کسی عملی تحریک سے وابستہ ہو کر خود ان کی زندہ تصویر بنیں۔ اور ان کی نمایندگی کے لیے ایک ایک تمام آگے بڑھیں۔ پھر یہ انداز نہ صرف غلط اور خلاف فطرت ہوگا، بلکہ قطعاً بے سود اور باعث صدمت ہوگا۔

جب یہ بات اصل نظریہ اسلامی کے سلسلے میں صحیح ہے جو نظام تصور اسلامی کا آئینہ دار ہے، اس نظام کی بنیادیں یا اس کے تفصیلی احکام پیش کرنے کے سلسلہ میں بدرجہ اولیٰ صحیح ہوگی۔

ہمارے گرد و پیش کی جاہلیت جس طرح دعوت اسلامی کے بعض مخلص کارکنوں

کے اعصاب پر کبھی اثر انداز ہوتی ہے اور وہ دعوتِ اسلامی کے درمیانی مراحل کو پھلانگ کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں اسی طرح وہ کبھی انھیں تنگ کرنے پر اتر آتی ہے اور ان سے پوچھتی ہے کہاں ہیں اس نظام کی تفصیلات جس کی تم دعوت دیتے ہو؟ کہاں ہیں وہ علوم و فنون کہاں ہیں وہ تحقیقاتی ذخیرے کہاں ہیں جدید اصولوں کی روشنی میں مرتب کیے ہوئے وہ فقہی قوانین جو تم نے اس نظام کو نافذ کرنے کے لیے فراہم کیے ہیں؟ گویا اس زلزلے میں شریعتِ اسلامی کو نافذ کرنے کے لیے اگر افراد کی کمی ہے تو صرف اس وجہ سے کہ فقہی احکام اور فقہ اسلامی کے مباحث ان کے سامنے نہیں، گویا وہ حاکمیتِ الہی کے سامنے گردن تسلیم خم کر چکے ہیں، اور شریعتِ الہی کی حکمرانی پر پوری طرح رضامند اور مطیعین ہیں۔ کرسی اتنی ہے کہ ”مجتہدین“ کی طرف سے جدید اصولوں کی روشنی میں مرتب کی ہوئی فقہ ان کو نہیں مل رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک انتہائی بودا اور غیر سنجیدہ مذاق ہے جس سے ہر غیر رو باجمیت مسلم کو چوگٹا رہنا چاہیئے!

اس طرح تنگ کرنے سے جاہلیت کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ شریعتِ الہی کو پس پشت ڈال دینے اور انسان کے لیے انسان کی غلامی باقی رکھنے کا ایک حسین حیلہ فراہم کر لے۔ اس کا مقصد ہے کہ قافلہ حق کا ربانی طریقہ دعوت سے رخ پھیر دے۔ ایک تحریکی شکل میں عقیدے کی تعبیر سے اسے غافل کر دے وہ کارکنانِ دعوتِ اسلامی کے دستور العمل کے اس مزاج کو بدل کر رکھ دے جس کی رو سے عقیدہ تحریک کے درپچوں سے نمودار ہوتا، اور نظام کے خدوخال عمل کے آئینہ میں نظر آتے ہیں، نیز قوانین و احکام اسلامی زندگی کی حقیقی مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے بناٹے جاتے ہیں۔

کارکنانِ دعوتِ اسلامی کا فرض ہے کہ وہ اس دامِ تزییر سے ہوشیار رہیں! وہ اس نقشہ کار کو پوری جرات سے ٹھکرا دیں، جو ان کے دین اور ان کی تحریک کے لیے یکسر اجنبی ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ بے یقینی کے مریضوں سے

متاثر نہ ہوں اور جو دشمنانِ اسلام ان کو صحیح طریقِ کار سے ہٹا دینے کے واسطے ہیں، ان کی کوششوں کو بری طرح ناکام کریں! ان کا فرض ہے کہ پریشان کرنے کی ان ذلیل تدبیروں کو سر بازار رسوا کریں، ان کے سارے تار و پود بکھیر کر رکھ دیں۔ ایک ایسا معاشرہ جو شریعتِ الہی کی پابندی اور دوسری شریعتوں سے بیزاری کا اعلان نہیں کرتا، ایک ایسے معاشرے میں ”قانونِ اسلامی کی تجدید“ کے عنوان سے جو مذاق کا کھیل کھیلا جا رہا ہے اس کو پوری سختی سے ٹھکرا دیں۔ ان کا فرض ہے سنجیدہ و مٹھ سرگرمیوں کی طرف سے غافل کر دینے والی اس اسکیم — فضا میں تخم پڑی اور سطح آب پر گل کاری کرنے کی پرفیو اسکیم — کو اپنے قریب بھنگے نہ دیں۔ اس مفسدانہ اور پڑے از جہانت چال کو پیروں سے روند دیں۔

ان کا فرض ہے کہ دین نے تحریک کا جو طریق کار پیش کیا ہے، اس کے مطابق حرکت میں آئیں کہ اس کی قوت کا یہ بھی ایک راز ہے۔ اور ان کی بھی قوت کا یہی راز چھمٹا ہے۔ یاد رہے! اسلام میں طریقِ کار کی وہی حیثیت ہے جو ”اصل دین“ کی ان دوزخوں کا یہ باہمی رشتہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اور کوئی بھی دوسرا اجنبی طریقِ کار اسلام کی سچائی کو نہیں بکھا سکتا۔ دوسرے نقشہائے کار اپنے انسانی نظاموں کو تو برپا کر سکتے ہیں، لیکن ہمارے نظام کو برپا نہیں کر سکتے، لہذا ہر اسلامی تحریک میں طریقِ کار کی رعایت اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی عقیدے اور نظام کی۔

إِنَّا هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ

## مسلم معاشرے کا پیام اور اس کی خصوصیات

رسول خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس طویل سلسلہ دعوت اسلامی کی آخری کڑی ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کی قیادت و رہنمائی میں سرانجام پاتی رہی۔ اس دعوت کے پیش نظر ایک ہی کام رہا، خواہ تاریخ انسانی کا کوئی بھی دور رہا ہو۔ وہ کام تھا انسانوں کو ان کے الہ واحد اور رب حقیقی سے روشناس کرانا، انہیں تنہا رب کائنات کا غلام بنانا اور مخلوقات کے پیشہ ربوبیت کو چکنا چور کر دینا۔ پھر ایسا کبھی نہ ہو کہ لوگ سر سے چشمہ الٰہیت کے ہی منکر ہے خدا کے وجود کے ہی قائل نہ رہے ہوں۔ تاریخ انسانی میں اس طرح کے معدودے چند ہی افراد گزرے ہیں، جن کے نظریات ان کے ساتھ ہی صفحہ ہستی سے مٹ گئے ورنہ ہوتا یہ تھا کہ انہیں اپنے رب کی حقیقت کا صحیح علم نہ ہوتا، وہ دوسرے خداؤں کو بھی اس کا شریک ٹھہرا لیتے، معبود و مسجود سمجھ کر ان کے آستانوں پر عقیدت و بندگی کے نذرانے پیش کرتے، یا ان کی آقائی و حاکمیت تسلیم کر کے بے چون و چرا ان کی اطاعت کرتے۔ اور یہ دونوں ہی باتیں یکساں طور پر شریک ہیں، جن سے انسان کا رشتہ اس دین الٰہی سے ٹوٹ جاتا ہے، جس کا علم رسولوں کے ذریعہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہا، مگر کچھ عرصہ بعد لوگ اس کا انکار کر دیتے رہے۔ اور جس جاہلیت سے نکلے ہوتے اسی جاہلیت میں پھر پلٹتے رہے۔ اور پھر شرک کی غلاظت میں آلودہ ہوتے رہے۔ خواہ یہ شرک عقیدت و بندگی کی شکل میں رہا ہو یا غیر مشروط طاعت و انقیاد کی صورت میں، یا دونوں ہی صورتوں میں۔ تاریخ انسانی کے ہر دور میں دعوت الی اللہ کا یہی مزاج رہا ہے۔

اس کا نصب العین تھا "طاعت و حواگی" بالفاظ دیگر سارے انسانوں کو بندوں کی پرستش سے نکال کر خدائے واحد کی پرستاری میں داخل کرنا بندوں کی حاکمیت، ان کی من گھڑت شریعت، اور خانہ ساز اقدار و روایات کی غلامی سے نکال کر تنہا خدا کی حاکمیت، اس کی شریعت اور اس کی مقرر کردہ اقدار و روایات کا پابند بنانا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت آنے والے اسلام کا یہی مقصد تھا، آپ سے پہلے دوسرے انبیائے کرام کے ذریعہ جو اسلام آیا اس کا بھی یہی مقصد تھا۔ وہ آیا تھا تاکہ انسانوں کو حاکمیت اللہ کے دائرے میں داخل کرے، جس طرح گرد و پیش کی یہ ساری دنیا داخل ہے اور اس طرح کائنات کا سررشتہ تنظیم جس طاقت کے ہاتھ میں ہے، اسی سے ان کی زندگی کی تنظیم بھی وابستہ ہو۔ وہ کسی ایسے اصول، کسی ایسی طاقت، کسی ایسے نظام کی طرف نہ پکیں، جو اس اصول، اس طاقت اور اس نظام سے متصادم ہو، جس کی پوری کائنات میں عملداری ہے، نہ صرف کائنات بلکہ انسان بھی زندگی کے غیر ارادی شعبوں میں جس کا تابع و محکوم ہے۔ کیونکہ سارے انسان اپنی نشوونما، صحت و علالت اور موت و حیات میں خدا کے بنائے ہوئے کچھ فطری قوانین کے تابع ہیں، اسی طرح اجتماعی تنگ و دو اور خود اختیاری سرگرمیوں کے ثمرات و نتائج کے سلسلہ میں بھی وہ انہی قوانین کے پابند ہیں۔ وہ اس عالم پر حکمرانی کرنے والے تکوینی قوانین کے سلسلے میں سنتِ الہی کو بدلنے پر قادر نہیں ہیں۔ یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ انہیں زندگی کے ارادی شعبوں میں بھی اسلام ہی کی طرف پلٹنا چاہیے۔ اور زندگی کے سارے معاملات میں شریعتِ الہی کی ہی حاکمیت تسلیم کرنی چاہیے۔ تاکہ زندگی کے ارادی و غیر ارادی شعبوں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ اور اس طرح زندگی کے ان دونوں شعبوں اور اس کائنات کے درمیان کامل توافق و ہم آہنگی کی شان نمایاں ہو سکے۔

لیکن وہ جاہلیت جو زمین پر انسان کی حاکمیت اور اس طرح کائنات کے ساتھ عدم توافق اور انسانی زندگی کے ارادی و غیر ارادی شعبوں میں تصادم کی بنیاد

پر قائم ہوتی ہے۔ وہ جاہلیت جس سے ہر رسول کو واسطہ پڑا۔ ہر رسول نے دعوتِ اسلامی کے اسلحے سے جس کا مقابلہ کیا۔ اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی گداز سے جس کا سر توڑا۔ وہ جاہلیت محض "نظریہ" کی شکل میں کبھی نہ رہی، بلکہ بیا اوقات اس کے پیچھے کوئی "نظریہ" ہی نہ رہا۔ وہ ہمیشہ ایک تحریکی تنظیم کی شکل میں رہی۔ ایک ایسے معاشرے کی شکل میں رہی جس کی اپنی قیادت ہوتی۔ اپنے تصورات و اقدار، اپنی روایات و عادات، اور اپنے جذبات و احساسات ہوتے۔ وہ ایک منظم معاشرہ ہوتا۔ اس کے افراد میں اتحاد و یکجہتی، اتفاق و ہم آہنگی اور نہایت منظم تعاون ہوتا۔ اس میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے وجود کے تحفظ، اپنے مرکز کے دفاع اور مخالف عناصر کی سرکوبی کے لیے ایک حرکت اور سرگرمی ہوتی۔

چونکہ جاہلیت مطلق "نظریہ" کی شکل میں نہیں ہوتی، بلکہ اس انداز کی ایک تحریکی تنظیم کی شکل میں ہوتی ہے۔ لہذا اس جاہلیت کو کائنات سے بے دخل کرنے اور خدا کے در سے پد کے ہوئے انسانوں کو پھر خدا کے در پر اکٹھا کرنے کی کوشش محض ایک "نظریہ" کی شکل میں ہو، نہ یہ درست ہے نہ کسی بھی درجہ میں سود مند ہے۔ کیونکہ اس شکل میں وہ عملاً قائم اور ایک منظم تحریک کی شکل میں پائی جانے والی جاہلیت کی ہمسر بھی نہ ہو سکے گی، چہ جائے کہ اس سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ حالانکہ ایک بالفعل قائم وجود کو بے دخل کرنے اور ایک دوسرے وجود کو اس کی جگہ پر لانے کی جدوجہد کرتے وقت ہونا یہی چاہیے خصوصاً جبکہ وہ اپنے مزاج، اصول اور کلی وجوہی امور میں اس سے بنیادی طور پر اختلاف بھی رکھتا ہو، ناگزیر ہے کہ وہ نئی جدوجہد ایک منظم تحریک کی شکل میں ہو جو اپنی نظری و تنظیمی بنیادوں اور اپنے تعلقات و روابط میں اس عملاً قائم جاہلی معاشرے سے زیادہ مضبوط و مستحکم ہو۔

وہ نظری بنیاد جس پر اسلام تاریخِ انسانی کے ہر دور میں قائم رہا، وہ "لا الہ الا اللہ" کی گواہی ہے۔ جس کا مطلب ہے خدا کی الوہیت و ربوبیت اور اقتدار

وحاکیت کے آگے اس طرح سرنگوں ہو جانا کہ ساری عقیدتوں کا مرکز اور عبادتوں کا قبلہ وہی ہو۔ اور زندگی کی عملی سرگرمیاں اسی کی طاعت میں ڈھلی ہوئی اور اسی کے پائے حاکیت پر سجدہ ریز ہوں۔ گویا "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" کی گواہی اس وقت تک نہیں پائی جائے گی، اور شریعت کی نگاہ میں اس وقت تک اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ جب تک وہ اس مکمل شکل میں نہ ہو۔ کیونکہ اسی طرح اس کو ایک بنجیدہ اور حقیقی وجود حاصل ہو سکے گا۔ جس پر ایک کلمہ گو کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کا فیصلہ ہوگا۔

نظری پہلو سے اس بنیاد کو استوار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی رضائے الہی کے تابع ہو، وہ زندگی کے کسی بھی معاملہ میں اپنے دل سے کوئی فیصلہ نہ کرے۔ وہ ہر معاملے میں فیصلہ الہی کی طرف رجوع کرے اور اسی کی پیروی کرے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ فیصلہ الہی وہ سرف ایک ہی سرچشمہ سے معلوم کرے اور وہ ہے خد اکا رسول۔ کلمہ شہادت کے دوسرے جزو "مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللَّهِ" کی گواہی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

یہی وہ نظری بنیاد ہے جس کے اندر سے اسلام کا چہرہ نمودار ہوتا اور جس پر نظام اسلامی کا قیام عمل میں آتا ہے۔ جب زندگی کے سارے معاملات پر اس کو منطبق کیا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں ایک کامل دستور حیات وجود میں آتا ہے۔ جس سے ایک مسلم اجتماعی و انفرادی زندگی کی ساری فروعیات میں روشنی حاصل کر سکتا ہے، کہ دارالاسلام کے اندر وہ کیسے رہے اور باہر اس کا کیا اندازہ ہو؟ مسلم معاشرے سے اس کے کیا تعلقات ہوں، اور دوسرے معاشروں سے ربط و تعلق کی کیا بنیادیں ہوں؟

لیکن اسلام — جیسا کہ ہم پہلے کہ چکے ہیں — محض ایک "نظریہ" کی شکل میں نہیں رہ سکتا کہ جو چاہے عقیدے کے طور پر اسے اپنائے، عبادات کی شکل میں اس کا عملی مظاہرہ کرے اور پھر اس کے یہ نام لیوا عملاً جاہلی تنظیم کے کل پڑزہ بنے رہیں۔ کیونکہ اس طرح اسلام عملاً برپا نہیں ہو سکتا۔ چاہے ان کی تعداد

تنتی ہی زیادہ ہو۔ اس لیے کہ محض نظری مسلمان جو جاہلی معاشرے کی میکانکی تنظیم کا جزو ہوں، لازمی طور پر اس معاشرے کے مقاصد و مطالبات پورے کرنے پر مجبور ہوں گے اور ضرور بالضرور ان بنیادی ضرورتوں کے لیے حرکت میں آئیں گے جو اس معاشرے کی زندگی و پائیدگی کے لیے ناگزیر ہوں گی۔ خواہ ان کا یہ حرکت میں آنا برضا و رغبت ہو یا بادل ناخواستہ، شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر۔ چاروناچار انہیں اس کا دفاع کرنا ہوگا اور ان اسباب و عوامل کے قلع و قمع میں حصہ لینا ہوگا جو اس کے وجود و بقا کے لیے خطرے کی حیثیت رکھتے ہوں گے۔ کیونکہ جاہلی مشنیری ان مقاصد کے لیے اپنے سارے ہی پزروں کو استعمال کرے گی، خواہ انہیں یہ گوارا ہو یا ناگوار۔ گویا یہ ”نظری مسلمان“ عملاً اس جاہلی معاشرے کی تقویت و استحکام میں مُمد و معاون ثابت ہوں گے، جسے نظری طور پر وہ مٹا دینے کا عزم رکھتے ہوں گے۔ جاہلیت کے جسم میں وہ گویا ایسے زندہ خلیے ہوں گے جو اس میں حیات و بقا کی لہریں دوڑا رہے ہوں گے! اور اپنی صلاحیتوں، توانائیوں اور تجربات سے اسے پوری طرح کمک پہنچا رہے ہوں گے، کہ وہ خوب قوت سے بھرپور ہو جائے، ہمیشہ زندہ و پابندہ رہے جبکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ان کی ساری قوتیں اور تمام تر سرگرمیاں جاہلی معاشرے کو منہدم کرنے اور اسلامی معاشرے کو قائم و مستحکم کرنے کے لیے وقف ہوتیں!

اس طرح یہ بات ناگزیر ہو جاتی ہے کہ اسلام کی نظری بنیاد (یعنی عقیدہ) پہلی ہی فرصت میں ایک منظم تحریک کی شکل میں نمودار ہو۔ ناگزیر ہے کہ تحریک جاہلیت سے الگ ایک منظم تحریک وجود میں آئے، جو اس تحریک جاہلیت سے یکسر مختلف اور بالکل ممتاز ہو جسے اسلام کلی طور پر ناپسند کر دینے کا عزم رکھتا ہے اور اس جدید تنظیم کا محور وہ نئی قیادت ہو جس کی سب سے زیادہ حسین و جمیل اور کامل تجلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دلاویز پیکر میں ظاہر ہوئی، اور پھر آپ کے بعد کی ہر وہ اسلامی قیادت اس کا محور ہوگی جو



انسانوں کو صرف خدا کی الوہیت و ربوبیت، اس کے اقتدار و حاکمیت اور اس کی شریعت کی طرف لوٹانے کا عزم رکھتی ہو۔ نیز ضروری ہے کہ ہر وہ فرد جو خدا کی الوہیت اور محمد کی رسالت کی شہادت دیتا ہو، وہ منظم تحریک جاہلیت سے جس سے نکل کر وہ آیا ہے، اپنا رشتہ اخوت منقطع کر لے اور اس تحریک کی قیادت سے بالکل بے تعلق ہو، خواہ یہ قیادت مذہبی انداز کی ہو جیسے کاہنوں، جادوگروں، جوشیوں اور پرہتوں کی قیادت، یا سیاسی، اجتماعی اور معاشی قیادت ہو۔ جو قریش کو حاصل تھی، مختصر یہ کہ اس کے اخلاص و محبت اور تعاون کا دائرہ صرف جدید تحریک اسلامی اور اس کی مسلم قیادت تک ہی محدود ہو۔

ضروری ہے کہ مسلمان حلقہ بگوش اسلام ہونے اور "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ" کی شہادت دینے کے بعد پہلی فرست میں ایسا کر ڈالے کیونکہ مسلم معاشرے کا صحیح معنوں میں وجود اس کے بغیر ممکن نہیں۔ محض قلب و ذہن کے طاقوں میں عقیدے کو سجالینے سے مسلم معاشرہ نہیں قائم ہو سکتا، خواہ تعداد و شمار کے لحاظ سے وہ افراد ایک ایسی میکانیکی تنظیم کی شکل میں نہ ہوں، جو باہمی اخلاص و تعاون کا نمونہ ہو، جس کا ایک مستقل اور جداگانہ تشخص ہو، جس کے اراکین ایک زندہ متحرک اور منظم ٹیم کی مانند اس کے پیرجمانے اور گھرانوں میں اس کی جڑیں استوار کرنے کے لیے کوشاں ہوں، اس کے دائرے کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کے آرزو مند اور ان اسباب و عوامل کے سبب کے لیے سرگرم ہوں، جو مستقل اس کے وجود سے برسر پیکار ہوں۔ اور یہ سب جاہلی معاشرے سے الگ ایک ایسی مستقل قیادت کے زیر سرپرستی کریں، جو ان کی تحریک کو پوری طرح منظم رکھے، انہیں اپنے اسلامی وجود کو زیادہ سے زیادہ مستحکم اور استوار کرنے میں مدد دے، نیز جاہلیت کے خلاف جو ابی کارروائی کرنے اور بالآخر مکمل طور سے اُسے سفیر ہستی سے مٹانے میں دلیری و مستعدی کا ثبوت دے۔

اسلام اسی طرح قائم ہوا ہے۔ اسی طرح قائم ہوا، ایک عقیدے کی صورت میں ایک مجمل مگر جامع اور ہمہ گیر نظریہ کی صورت میں۔ جس نے ٹھیک اسی لمحے ایک ایسی ٹھوس، جاندار اور منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی، جو جاہلی معاشرے سے بالکل ممتاز تھی۔ اپنا ایک مستقل اور بے گناہ تشخص رکھتی تھی۔ اور اس جاہلی معاشرے سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتی تھی۔ البتہ وہ ایک ایسے ”نظریے“ کی شکل میں کبھی نہیں قائم ہوا جو عملی وجود سے محروم رہا ہو۔ اور دوبارہ بھی اسلام اسی طرح قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن جاہلی معاشرہ کے زیر سایہ رہتے ہوئے اس کو دوبارہ قائم کرنا کسی بھی زمانہ میں اور کسی بھی جگہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کی منظم تحریکی اٹھان کے سلسلے میں چند ضروری باتیں نہ سمجھ لی جائیں۔

ہاں، تو اسلام جس وقت اس انداز سے اُمت مسلمہ کی تشکیل کر رہا تھا، ایک ٹھوس، جاندار اور منظم تحریک کی صورت میں اس کی داغ بیل ڈال رہا تھا۔ عقیدے کے سنہری تاروں سے اس کی شیرازہ بندی کر رہا تھا، اس وقت اس کا نصب العین تھا ”انسان کی انسانیت“ کو ابھارنا اور اسے راسخ اور مستحکم کرنا، انسانی زندگی کے سارے ہی شعبوں میں اسے نمایاں اور ممتاز کرنا، اور یہاں بھی اس کا وہی اصول اور وہی طرز تھا جو اس کی ساری بنیادوں، ساری تعلیمات اور سارے شرائع و احکام میں نظر آتا ہے۔

چند صفات ہیں جو انسان و حیوان بلکہ تمام مادّی وجودوں میں مشترک ہیں، جن کی وجہ سے ”جہل علمی“ کے متوالوں کو کبھی تو یہ گمان ہوتا ہے کہ انسان بقیہ سارے حیوانوں کی طرح ایک حیوان ہے۔ اور کبھی یہ وہم ہوتا ہے کہ وہ بقیہ سارے مادّوں کی طرح ایک مادّہ ہے! حالانکہ انسان میں، گہرے وہ ان ”صفات“ میں مادّے اور حیوان کا شریک ہے، کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو اسے بالکل منفرد اور ممتاز کر دیتی ہیں، ایک بالکل بے مثل وجود قرار دیتی ہیں جیسا کہ ”جہل علمی!“ کے متوالوں کو بالآخر ماننا پڑا۔ ناقابل تردید حقائق انہیں مجبور

کر دیتے ہیں۔ چاروں چار انہیں اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، گرچہ اخلاص اور  
صراحت کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ

اس سلسلے میں اسلامی اصولوں کا لحاظ رکھنے، تنظیم اسلامی کو زبان و وطن،  
رنگ و نسل، نظر قریب ملکی مصالح اور نامعقولی جغرافیائی حد بندیوں سے اُپنچا اٹھ کر  
محض عقیدے کی بنیاد پر قائم کرنے اور اس میں انسان و حیوان کی مشترک صفات کے  
بجائے "انسانی خصوصیات کو ابھارنے، پر دان چڑھانے اور غالب کرنے کی  
وجہ سے انتہائی روشن اور واضح نتائج یہ سامنے آئے کہ مسلم معاشرے کا دروازہ  
ساری نسلوں، ساری قوموں، سارے رنگوں اور ساری زبانوں کے لیے یکساں کھل  
گیا۔ بیچ میں ان ذلیل حیوانی دیواروں میں سے کوئی بھی دیوار حائل نہ رہی! دوسرا  
عظیم فائدہ یہ ہوا کہ معاشرہ اسلامی کی کٹھالی میں مختلف انسانی نسلوں کی خصوصیات  
اور صلاحیتیں اکٹری جمع ہو گئیں۔ اور نسبتاً انتہائی قلیل مدت میں ایک نہایت  
اعلیٰ اور نفیس قسم کا آمیزہ تیار ہو گیا۔ اس عجیب و غریب، منظم اور متحدہ بلاک  
نے اتنی حسین و جمیل اور عظیم الشان تہذیب کو جنم دیا کہ اس نے دوری مسافت  
اور وسائل آمدورفت کی دشواری کے باوجود اپنے دور کے پورے انسانی سرمایہ  
کا عطر جمع کر لیا۔

اس اعلیٰ معاشرہ اسلامی میں عربی، ایرانی، شامی، مصری، چینی، ہندی، ترکی،  
مغربی، رومی، یونانی، انڈونیشیائی، افریقی، غرض تمام ہی قوموں اور نسلوں کے  
نمائندے شامل تھے۔ ان کی ساری خصوصیات جمع ہو گئی تھیں تاکہ باہمی اختلاف و  
تعاون سے معاشرہ اسلامی اور تہذیب اسلامی کی تعمیر کریں۔ یہ عظیم الشان تہذیب

لے وہ جہل جو علم و ثقافت کے حسین لباس میں ہو

(ہے جو جدید

لے ان میں سرفہرست جو بیان ہا کسلے)

(کا علمبردار تھا۔

ڈاؤن ازم)

کبھی ”عربی“ نہ رہی ہمیشہ ”اسلامی“ رہی۔ کبھی ”قومی“ نہ رہی ہمیشہ ”عقائدی“  
 و مبنی بر عقیدہ رہی۔

ان سب کو یکجا کر دینے والی چیز باہمی جذبہ مساوات، آپس کا رشتہ اخوت  
 اور ایک ہی مقصد کی لگن تھی۔ چنانچہ ان تمام نے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر  
 دیں۔ تمام نسلی اور جنسی خصوصیات پیش کر دیں۔ اور اس ایک معاشرے کی تعمیر  
 میں اپنے شخصی، قومی، اور تاریخی تجربات کا عطر لا کر اٹھیل دیا جو مساوی طور پر ان  
 سب کا اپنا معاشرہ تھا، ایک ہی خدائی رشتہ تھا جو ان سب کو اس گلہ سستے  
 سے وابستہ کیے ہوئے تھا۔ اور اس گلہ سستے میں بس ان کی ”انسانیت“ کی کلیاں  
 کھلتی اور اسی کی نکلتیں پھیلتی تھیں۔ اسی کے جلوے عام ہوتے اور اسی  
 کے غنچے مسکراتے تھے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو پوری تاریخ انسانی میں کسی بھی  
 دوسری تنظیم کو نہ حاصل ہو سکی! —

تاریخ قدیم میں سب سے مشہور انسانی تنظیم رومن شہنشاہیت

تھی، بلاشبہ اس میں عملاً مختلف نسلیں،  
 متعدد زبانیں، متعدد رنگ اور متعدد مزاج یکجا ہو گئے تھے۔ لیکن یہ یکجا فی رشتہ  
 انسانیت کی بنیاد پر نہ تھی، وہاں عقیدے جیسی کوئی اعلیٰ قدر جلوہ گر نہ تھی۔ بلکہ ایک  
 خشیت سے پوری شہنشاہیت میں غلام طبقے اور طبقہ اشراف کی بنیاد پر طبقاتی  
 تنظیم قائم تھی، وہ ایک نسلی تنظیم تھی، جس میں حق حکمرانی صرف رومن نسل کے  
 لیے تھا، اور بقیہ دوسری نسلوں کی قسمت میں غلامی اور محکومی تھی۔ یہی وجہ ہے  
 کہ وہ کبھی تنظیم اسلامی کے اوج کمال کو نہ چھو سکی۔ انسانیت نے اس شجر سے  
 ویسے شیریں پھل کبھی نہ توڑے، جیسے اُسے تنظیم اسلامی کے شجر طیب سے  
 حاصل ہوئے۔

اسی طرح تاریخ جدید میں دوسری تنظیمیں نمودار ہوئیں — مثلاً برطانوی

شہنشاہیت — لیکن وہ صحیح معنوں میں اپنے مورث اعلیٰ رومن تنظیم کا ہی

عکس اور اسی کا چہرہ تھی! ایک قومی اور استحصالی تنظیم، جس کی بنیاد تھی انگریز قوم کے حکمرانی اور انگریزی شہنشاہیت کے دائرے میں داخل نوآبادیات سے استحصال بالکل یہی کیفیت ساری یورپین شہنشاہیتوں کی ہے۔ اسپینی اور پرتگالی شہنشاہیتوں کی بھی، اور فرانسیسی شہنشاہیت کی بھی۔ یہ سب کی سب اسی پست اور لائق نفیس سطح پر کھڑی ہیں، اشتراکیت نے چاہا تھا کہ ایک دوسرے طرز کی تنظیم قائم کرے۔ جو نسل و قوم، زمین و زمان اور رنگ کی سرحدیں عبور کر جائے۔ لیکن اس کے لیے بنیاد اس نے عام "انسانیت" کو نہ بنایا۔ بلکہ اسے "طبقاتی" بنیاد پر قائم کیا۔ اس طرح یہ تنظیم، قدیم رومن تنظیم کی ہی بدلی ہوئی صورت یا اسی کا دوسرا رخ ہے۔ وہ طبقہ "اشرف" کی بنیاد پر قائم تھی اور یہ طبقہ "صعائیک" پر دتا ہی طبقہ کی بنیاد پر قائم ہوئی وہ طبقہ "اشرف" کی خیر خواہ تھی اور یہ طبقہ "صعائیک" کی بھی خواہ ہے۔ وہ طبقہ "اشرف" کو سر پر چڑھاتی تھی، اور یہ طبقہ "عمال" کو نظروں میں بٹھاتی ہے۔ اور جو جذبہ اس پر حکمرانی کر رہا ہے، وہ دوسرے سارے طبقات کے خلاف شدید کینہ و حسد کا جذبہ ہے! ظاہر ہے اس طرح کی گھٹیا اور نامحود تنظیم سے اسی بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ انسانی وجود کے بدترین رجحانات کو پروانے چڑھائے۔ کیونکہ وہ شروع سے ہی محض حیوانی صفات کو ابھارنے، پروانے چڑھانے اور زیادہ سے زیادہ راسخ کرنے کا عزم لے کر اٹھی ہے۔ اس کے ہاں انسان کی "بنیادی ضرورتیں" وہی ہیں جو حیوان کی ہیں۔ "کھانا، گھر اور جنسی تسکین" نیز اس کے نزدیک انسانیت کی تاریخ سراسر تلاش آب و دانہ کی تاریخ ہے!! اسلام انسان کی مخصوص ترین خصوصیات کو ابھارنے، پروانے چڑھانے اور معاشرہ انسانی کی تعمیر میں انھیں غالب کرنے میں منفرد ہے، کیونکہ اس کے پاس خدائی نظام اور خدائی طریق کار ہے۔ اور اس کی یہ انفرادی نشان ہمیشہ باقی رہے گی۔ جو لوگ اسے چھوڑ کر دوسرے پست اور گھٹیا نظاموں کی طرف بے تابانہ پلکتے ہیں۔ خواہ وہ نظام ہوں جو قوم پرستی کی بنیاد پر قائم ہوں یا وہ نظام ہوں جو

نسل پرستی کے علمبردار ہوں، وہ نظام ہوں جو وطنیت کا راگ الاپتے ہوں یا وہ نظام ہوں جو طبقاتی کشمکش کی آگ بھڑکاتے ہوں، جو لوگ بھی اس طرح کے نظاموں پر فریفتہ اور ان کے تناخراں ہیں، وہ حقیقت میں انسانیت کے دشمن ہیں، ان کو یہ پسند نہیں کہ اس دنیا میں انسان جن بلند اور اعلیٰ خصوصیات سے نوازا گیا ہے، انہیں جلا دے کر وہ انفرادی شان کا مالک بنے۔ انہیں یہ گوارا نہیں کہ انسانی معاشرہ اپنی نسلوں کی زیادہ سے زیادہ صلاحیتوں، تجربوں اور خصوصیات سے باہمی اتحاد و تعاون کی فضا میں فائدہ اٹھائے۔ اسی قسم کے لوگ ہیں جن کے سلسلہ میں خدائے تعالیٰ کی یہ تہنید موجود ہے:

کہو: کیا ہم تمہیں ایسے لوگوں کی خبر دیں جو اپنے (کیسے دھرے میں سب سے بڑھ کر گھانا اٹھانے والے ہیں؟ وہ لوگ کہ جن کی جدوجہد دنیوی زندگی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا اور اس سے ملنے کا انکار کیا، تو ان کا کیا دھرا اکارت گیا۔ ہم قیامت کے دن ان کو کوئی دزن نہ دیں گے۔ یہ ہے ان کا بدلہ و دوزخ، کیونکہ انہوں نے کفر کیا۔ اور میری آیتوں اور میرے رسولوں کی ہنسی اڑائی۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ  
أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيَهُمْ  
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ  
أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۚ أُولَٰئِكَ  
الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ  
وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا  
نَقِيمَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَرَنًا ۚ  
ذَٰلِكَ جَزَاءُ لَّهُمْ جَهَنَّمَ بِمَا  
كَفَرُوا وَآذَانَهُمْ وَالْآيَاتِ  
وَرَسُولِي هُنَّزُوا ۚ

(د الکہف)

سچ فرمایا خدائے برتر نے سچ فرمایا۔

## جہاد فی سبیل اللہ

امام ابن قیم نے ”زاد المعاد“ میں ”بعثت سے رحلت تک کفار و منافقین کے ساتھ آپ کے طرز عمل کی ترتیب“ کے عنوان سے جو فصل قائم کی ہے اس میں وہ جہاد اسلامی کے پس منظر کی تلخیص کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

رسول خدا پر سب سے پہلی وحی یہ ہوئی کہ آپ اپنے رب کے نام سے پڑھیں جس نے پیدا کیا۔ یہ نبوت کا آغاز تھا۔ اس لیے حکم ہوا کہ خود پڑھیں۔ اور تبلیغ کا حکم نہیں ہوا۔ پھر وحی ہوئی:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ ” اے چادر لپٹنے والے! اٹھو اور لوگوں کو آگاہ کرو“

پھر حکم ہوا کہ آپ قریبی اعزہ و اقرباء کو آگاہ کریں۔ پھر آپ نے قوم کو خطاب کیا۔ پھر قریب کے دوسرے عرب قبیلوں کو خطاب کیا۔ پھر سارے عرب کو اور پھر سارے انسانوں کو خطاب کیا۔ اس طرح نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد کم و بیش دس برس تک آپ یوں ہی دعوت دیتے رہے۔ اس عرصہ میں یہ جنگ تھی نہ جزیہ۔ بلکہ خدا کی طرف سے مکمل صبر و استقامت اور درگزر کی تلقین ہوتی رہی۔ پھر ہجرت کا اذن ملا۔ ساتھ ہی جنگ کی بھی اجازت ملی۔ پھر حکم ہوا کہ جو جنگ کریں ان سے آپ جنگ کریں۔ اور جو الگ رہیں ان سے کوئی تعرض نہ کریں۔ پھر حکم ہوا کہ مشرکین سے آپ جہاد کریں، یہاں تک کہ ہر جگہ طاعت و حکمرانی صرف اللہ کی ہونے لگے۔ حکم جہاد آنے پر کفار کی تین قسمیں ہو گئیں۔ صلح جو، جنگ جو اور ذمی۔ اس وقت حکم ہوا کہ جن لوگوں سے معاہدہ صلح ہو ان کے

معاہدے کا پورا خیال رکھا جائے۔ جب تک وہ عہد پر برقرار رہیں، ان سے کوئی  
 تعرض نہ کیا جائے۔ اور اگر خیانت اور بد عہدی کا اندیشہ ہو تو معاہدہ صلح ان کے منہ پر  
 پھینک دیا جائے، لیکن جنگ اس وقت تک نہ کی جائے جب تک شکست عہد  
 سے انھیں آگاہ نہ کر دیا جائے۔ اور جو لوگ عہد شکنی کریں ان سے جنگ کی جائے۔  
 پھر سورہ توبہ نازل ہوئی تو ان سارے لوگوں کے سلسلے میں واضح احکام آگئے، حکم  
 ہوا کہ دشمن اہل کتاب سے جنگ کی جائے، یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں یا اسلام میں  
 آجائیں۔ اور کفار و منافقین سے بھی جہاد کیا جائے، اور ان کے سلسلے میں پوری  
 سختی کی جائے۔ چنانچہ آپ نے کفار سے تیر و تفتنگ کے ذریعہ جہاد کیا، اور منافقین  
 سے دلیل و برہان کے ذریعہ اسی سورہ میں یہ حکم بھی آیا کہ آپ کفار کے معاہدوں  
 سے دست بردار ہو جائیں اور ان سے اظہارِ برأت کر دیں۔ اس موقع پر  
 ارباب صلح و معاہدہ کی تین قسمیں قرار دیں: ایک قسم ان لوگوں کی جن سے جنگ  
 کا حکم دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عہد شکنی کی، اور بیجان صلح پر قائم نہ رہے چنانچہ  
 آپ نے جنگ کی اور ان پر غالب آگئے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی جن سے متعینہ  
 مدت تک کے لیے معاہدہ ہوا، اور انہوں نے عہد شکنی نہ کی نہ آپ کے خلاف  
 کسی کی حمایت کی۔ ان کے سلسلے میں حکم ہوا کہ مدت معاہدہ تک ان کے معاہدہ کو  
 نباہ جائے۔ تیسری قسم ان لوگوں کی جن سے نہ کوئی معاہدہ ہوا، نہ انہوں نے  
 جنگ کی۔ یا جن سے غیر متعینہ مدت تک کے لیے معاہدہ تھا۔ حکم ہوا کہ انھیں  
 چار ماہ کی مہلت دی جائے۔ چار ماہ گزر جائیں تو ان سے جنگ کی جائے۔  
 چنانچہ عہد شکنی کرنے والوں سے آپ نے جنگ کی۔ جن سے کوئی معاہدہ نہ  
 تھا، یا تھا تو غیر متعینہ مدت تک کے لیے، ان کو چار ماہ کی مہلت دی۔ اور جن  
 سے متعینہ مدت تک کے لیے معاہدہ تھا اور انہوں نے اس معاہدہ کا احترام  
 کیا، آپ نے بھی اتنی مدت تک ان کے معاہدے کو برقرار رکھا۔ نتیجہ یہ  
 ہوا کہ یہ سب کے سب اسلام لے آئے۔ اور مدت معاہدہ ختم ہونے سے



پہلے کفر سے تائب ہو گئے۔ اور ذمیوں پر آپس نے جزیہ مقرر فرمایا۔ گویا سورہ توبہ نازل ہونے کے بعد کفار کی تین قسمیں ہو گئیں: اہل حرب، اہل عہد، اور اہل ذمہ۔ پھر اہل صلح و عہد تو اسلام میں آگئے اور اب دو قسمیں بچیں، اہل حرب اور اہل ذمہ۔ اہل حرب ہمیشہ اسلام سے خائف رہتے۔ اس طرح اہل زمین تین قسموں میں بٹ گئے: مومنین مخلصین، پُر امن اہل صلح۔ خائف اہل حرب۔ رہا منافقین کے سلسلہ میں آپ کا طرز عمل، تو خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ ان کے ظاہر کو مان لیں اور باطن کو خدا کے حوالہ کریں۔ نیز انھیں دلیل و حجت سے قائل کرنے کی کوشش کریں پھر حکم ہوا کہ ان سے اعراض فرمائیں اور ان کے سلسلہ میں سختی کریں، نہ ان کی نماز جنازہ پڑھیں نہ ان کی قبروں پر کھڑے ہوں۔ کیونکہ اب اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرنے والا نہیں، چاہے آپ کتنا ہی استغفار کریں۔ یہ تھا دشمن کفار و منافقین کے سلسلہ میں آپ کا طرز عمل۔

یہ ایک عمدہ تلخیص ہے، جہاد اسلامی کے مختلف مراحل کی۔ اس تلخیص سے دین کے تحریکی نقشہ کار کی چند نہایت گہری اور بنیادی خصوصیات سامنے آتی ہیں جو اس قابل ہیں کہ ان پر ٹھہر کر غور کیا جائے۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، اس لیے ہم چند اشارات پر ہی اکتفا کریں گے۔

۱۔ پہلی خصوصیت: پہلی خصوصیت اس کی حقیقت پسندی ہے۔ یہ دین ایک ایسی تحریک ہے جس کے سامنے ایک انسانی معاشرہ ہے۔ وہ اس معاشرے کا مقابلہ ایسے وسائل سے کرتا ہے جو اسی کی سطح کے ہوں۔ اس کا واسطہ ایک ایسی اعتقادی اور نظری جاہلیت سے ہے، جس کی بنیاد پر عملاً کتنے ہی نظام قائم ہیں، اور ان کی پشت پناہی مادی طاقتوں سے مسلح حکومتیں کر رہی ہیں۔ چنانچہ تحریک اسلامی ان کے مقابلے میں اسی درجہ کے ہتھیار لے کر آتی ہے۔ وہ عقائد و تصورات کی اصلاح کے لیے دعوت و تبلیغ سے کام لیتی ہے۔ اور باطل نظاموں اور ان نظاموں کی بنیاد پر قائم سلطنتوں

کی سرکوبی کے لیے زور و قوت استعمال کرتی ہے۔ وہ عوامل جو انسانی عقائد و تصورات کی اصلاح میں روک ثابت ہوتے ہیں جو افراد کو جبر و استبداد کی سنگینوں سے دباتے اور رب کے بجائے غیر اللہ کی پرستش پر مجبور کرتے ہیں، ان کے تلع قمع کے لیے وہ تیغ بکف، میدان میں نکلتی ہے۔ وہ ایک ایسی تحریک ہے جو مادہی اقتدار کے مقابلہ میں افہام و تفہیم پر اکتفا نہیں کرتی، نہ افراد کے دلوں کے لیے مادہی دباؤ سے کام لیتی ہے۔ یہ دین انسانوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر خدا کے واحد کی بندگی میں داخل کرنے کی مہم چلاتے ہوئے یہ دونوں طریقے استعمال کرتا ہے، جس کی مزید تشریح آگے آئے گی۔

۲۔ دوسری خصوصیت: اس کی دوسری خصوصیت اس کا خاص تحریکی انداز ہے۔ وہ ایک بتدریج آگے بڑھنے والی تحریک ہے جو اپنے طویل سفر میں پیش آنے والے تمام مراحل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتی اور ان کی واقعی ضرورتوں کے لحاظ سے وسائل اختیار کرتی ہے، اس کا ہر مرحلہ اپنے بعد والے مرحلے میں لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ دین زندہ و متحرک انسانی معاشرے کے مقابلے میں خالی خالی نظریات لے کر نہیں آتا اور نہ پیش آنے والے مراحل کے لیے ایسے وسائل کا سہارا دیتا، جو اس کے مناسب حال نہ ہوں۔ جو لوگ اس دین کے طرزِ جہاد یا نظامِ جہاد پر استدلال کے لیے قرآنی نصوص پیش کرتے ہیں اور اس کی یہ خصوصیت ملحوظ نہیں رکھتے، وہ جن جن مدارج سے گزرا ہے ان کے مزاج کا ادراک نہیں کرتے، نیز ہر مرحلے سے مختلف قرآنی نصوص کا جو تعلق ہے، اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، ایسے لوگ اس دین کے طریق کار کو گمراہ کن حد تک گڈنڈ کر دیتے ہیں۔ اور آیات الہی کو وہ معنی پہنابنے اور ان سے ایسے اصول و مبادی اخذ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں جن کی ان کے اندر کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ وہ ہر وحی قرآنی کو آخری وحی سمجھ بیٹھتے ہیں۔ گویا ہر آیت ان کے نزدیک اس

دین کے آخری احکام کی آئینہ دار ہے۔ وہ کہتے ہیں! اسلام صرف دفاع کے لیے جہاد کرتا ہے اور حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ذہنی اور عقلی طور پر بڑی طرح مرعوب اور ان تجدید پسندوں کے دباؤ سے حد درجہ متاثر ہوتے ہیں، جن کا نام کے علاوہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر ستم یہ کہ وہ اس خام خیالی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اس طرح وہ دین کی کوئی اہم خدمت انجام دے رہے ہیں، حالانکہ اس کی ضرب براہ راست دین پر پڑ رہی ہوتی ہے، ہاں اس دین پر پڑ رہی ہوتی ہے جس کا نصب العین ہے زمین سے ہر طرح کے طاغوتوں کو بے دخل کرنا، انسانوں کو خدا کا پرستار بنانا، بندوں کی غلامی سے نکال کر انھیں صرف رب کی بندگی میں داخل کرنا! مگر اسلام عقیدے کو انسانوں پر بالبحر مسلط نہیں کرتا، بلکہ عقیدے اور ان کے درمیان حائل دیواروں کو منہدم کرتا ہے۔ وہ حکمراں سیاسی نظاموں کو پارہ پارہ کر دیتا ہے یا ان کو اس طرح زیر نگین کر لیتا ہے کہ وہ جزیہ دیں اور طاعت و تابعداری کا اعلان کریں۔ اور رعایا کو اس عقیدے کے سلسلہ میں پوری آزادی دینے کا وعدہ کریں، کہ بغیر کسی دباؤ کے وہ چاہے تو اسے قبول کرے اور چاہے تو اس سے دستکش رہے۔

۳۔ تیسری خصوصیت: تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ مسلسل تگ و تازا اور یہ نئے نئے وسائل و ذرائع کا استعمال اس دین کو اس کی اصولی بنیادوں اور متعینہ مقاصد سے باہر نہیں ہونے دیتا۔ وہ پہلے ہی دن سے، خواہ نبی کے قریبی اعزہ کو خطاب کر رہا ہو یا قریش کو، پورے عرب کو خطاب کر رہا ہو یا ساری دنیا کو، سب کے سامنے ایک ہی بنیاد رکھتا ہے اور سب سے ایک ہی مقصد کے حصول کی اپیل کرتا ہے۔ وہ مقصد ہے خالص خدا کی بندگی، بندوں کی غلامی سے کامل آزادی۔ اس میں نہ کسی سودے بازی کی گنجائش ہے نہ کسی نرمی و روداری کی۔ پھر وہ اسی ایک مقصد کے حصول کے لیے متعینہ خطوط پر مختلف مراحل سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا ہے، جن میں سے ہر مرحلے کے

یہ اس کے حسب حال وسائل ہوتے ہیں، جیسا کہ ہم گزشتہ پیراگراف میں بیان کر آئے ہیں۔

۴۔ چوتھی خصوصیت: چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ باقاعدہ اس بات کی تعیین کر دیتا ہے کہ مسلم معاشرہ کن لوگوں سے کس قسم کے تعلقات رکھے، ان تعلقات کی کیا نوعیت اور اس کے کیا حدود ہوں۔ جیسا کہ ”زاد المعاد“ کی مذکورہ فصل میں تم نے دیکھا۔ اور اس کی اساس وہ خدا کی کامل اطاعت کو قرار دیتا ہے کہ یہی وہ عالمی بنیاد یا وہ عالم گیر حقیقت ہے جس کا احترام سب پر فرض ہے۔ سارے انسانوں کا فرض ہے کہ وہ اسے تسلیم کریں، یا کم از کم مکمل طور سے اس سے صلح کریں اور دعوت حق کی راہ میں کسی قسم کی دیوار نہ کھڑی کریں، نہ سیاسی نظام کی دیوار، نہ مادی قوت کی۔ وہ ہر فرد کو مکمل آزادی دیں کہ اپنی مرضی سے چاہے تو اسے اپنائے اور چاہے تو اس سے الگ رہے وہ اس سے کسی قسم کے مزاحمت یا جنگ نہ کریں۔ اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اسلام کا فرض ہوگا کہ اس سے جنگ کرے، یہاں تک کہ اس کی قوت کہ پارہ پارہ کر دے، یا وہ اپنے طاعت و تالعبداری کا اعلان کر دے۔

وہ ذہنی اور عقلی طور پر شکست خوردہ افراد جو جہاد اسلامی کے موضوع پر تلم اٹھاتے ہیں تاکہ دامن اسلام سے اس ”تہمت“ کو دھو دیں، وہ جب دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو اس دین نے عقیدے کے سلسلہ میں جہاد اکراہ کو ناپسند کیا ہے اور دوسری طرف وہ ان مادی اور سیاسی قوتوں کی سرکوبی سے بھی کوئی دریغ نہیں کرتا جو اس کے اور انسانوں کے درمیان حجاب بنی ہوتی ہیں اور جو انسان کو انسان کا غلام بناتی اور اس کو بندگی رب سے روکتی ہیں، تو وہ ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے سے گٹھ ملد کر دیتے ہیں حالانکہ ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں، ان میں اشتباہ و التباس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان دونوں باتوں میں فرق نہ کرنے اور بالخصوص اس طرح مرغوبیت

کا شکار ہونے کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ اسلامی جہاد کو آج کل کی "دفاعی جنگوں" میں محصور کر دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ جہاد اسلامی ایک دوسری ہی چیز ہے جس کو آج کل کی جنگوں اور ان کے محرکات و کیفیات سے کیا واسطہ ہے جہاد اسلامی کے اصل اسباب کا سراغ لگانا ہو، تو خود "اسلام" کے مزاج کو سامنے رکھنا چاہیے۔ دنیا میں اس نے جو کردار پیش کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو بلند مقاصد متعین کیے ہیں اور جن کے لیے اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت سے سرفراز فرمایا، پھر آپ کو خاتم الانبیاء اور آپ کی رسالت کو سلسلہ رسالت کی آخری کڑی قرار دیا، اسباب جہاد کا سراغ لگاتے وقت ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

یہ دین دراصل مخلوق کی بندگی سے "انسان" کی آزادی کا اعلان ہے۔ یہ بندگی نفس کے خلاف بھی ایک کھلا ہوا احتجاج ہے کیونکہ بندگی نفس بھی بندگی خلق کی ہی ایک شاخ ہے اور یہ بس اسی طرح ممکن ہے کہ خالص اللہ کی الوہیت و حاکمیت کا اعلان ہو پھر یہ بات ذہن میں رہے کہ تنہا اللہ کی الوہیت و حاکمیت کے اعلان کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے انسان کی حاکمیت پر ہمہ جہتی یورش اور ہر اس نظام سے مکمل بغاوت جس میں کسی بھی پہلو سے انسان کی حاکمیت یا دوسرے لفظوں میں اس کی الوہیت کی ہو۔ کیونکہ ایسی حکومت جس میں سارے اختیارات کے مالک بندے ہوں اور قوت و اقتدار کا سرچشمہ بھی بندے ہوں، ایسی حکومت دراصل بندوں کو منصب الوہیت پر فائز کرنے کے مترادف اور اللہ کے بجائے کچھ انسانوں کو رب بنانے کے ہم معنی ہے۔ اس اعلان کا مطلب ہے: اللہ کے اقتدار کو پھر اللہ کی طرف لوٹانا، اور ان ستم پیشہ غاصبوں کو ملک بدر کرنا جو ناجائز طور پر اقتدار الہی پر قابض ہیں۔ اور اپنے خود ساختہ آئین و قوانین کے ذریعے انسانوں پر اس طرح فرماں برداری کر رہے ہیں، گویا وہ رب ہوں، اور لوگ ان کے بندے۔ اس اعلان کا مطلب ہے: انسانی حاکمیت کے بت کو

چو چو کر کے زمین پر حاکمیت الہ کا پرچم لہرانا، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے :  
 ”وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهُ الْوَالِدِينَ وَالَّذِي فِي الْأَرْضِ نَازِلٌ“  
 اور وہی آسمان میں الہ ہے اور وہی زمین میں بھی الہ ہے۔

اقتدار تو بس اللہ کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی صحیح اور سیدھا دین ہے۔

کہو، اسے اہل کتاب! اڈ ایک ایسی سیدھی بات پر، جو ہمارے اور تمہارے درمیان کی ہے: یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ کسی چیز کو اس کا شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا رب بنائے۔ پھر اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم ہیں۔

”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَدْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ“

”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَدْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ“

زمین پر خدا کی حکومت اس طرح نہیں قائم ہو سکتی کہ حاکمیت کے مالک خود کچھ افراد ہو جائیں۔ خواہ وہ مذہبی افراد ہوں۔ جیسا کہ چرچ کی مذہبی حکومت میں تھا یا ایسے افراد جو دیوتاؤں کے نمائندے اور خداؤں کے ترجمان ہوں، جیسا کہ اس نظام میں تھا جسے لوگ ”تھیو کریسی“ یا مقدس حکومت الہیہ! کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کا قیام تو بس اسی طرح ممکن ہے کہ حاکم صرف شریعت الہی ہو۔ قوانین کے سلسلہ میں مرجع کل بس خدا ہو۔ اور اس نے جو ایک واضح شریعت بھیجی ہے اسی پر عملدرآمد ہو۔

زمین پر حاکمیت الہ کی نوبت بجے، حاکمیت انسان کا بت پاش پاش ہو جائے، ہر طرف شریعت الہی کا پرچم لہرائے، اور انسانی قوانین کا کوئی اعتبار نہ رہ جائے، یہ ساری باتیں محض دعوت و تبلیغ سے حاصل ہونے والی نہیں۔ بندوں کی گردنوں

پر تخت شاہی پچھانے والے اور مسند اقتدار پر قبضہ کر لینے والے محض تبلیغ و گفتگو سے رام ہونے والے نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو رسولوں کے لیے زمین پر دین قائم کرنا کتنا آسان ہوتا! جب کہ نہ صرف انبیاء علیہم السلام کی تاریخ بلکہ تحریک اسلامی کے ہر دور کی تاریخ کا تجربہ کچھ اور ہی رہا ہے۔!

صرف اللہ کی العیبت و ربوبیت کا اعلان اقتدارِ الہی کے علاوہ ہر اقتدار سے "انسان" کی آزادی کا یہ اعلان کوئی نظریاتی، فلسفیانہ اور سلبی اعلان نہ تھا۔ وہ ایک تحریکی، واقعاتی اور ایجابی اعلان تھا۔ ایسا اعلان جس سے مقصود تھا ایک ایسے نظام کا قیام جو انسان پر شریعتِ الہی کی روشنی میں حکمرانی کرے۔ اور عملاً انھیں بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں داخل کرے۔ یہیں سے یہ بات لازمی ٹھہری کہ "تبلیغ" کے پہلو پہلو تحریک، کی بھی تشکیل ہو۔ تاکہ وہ عملی صورت حال کے سارے ہی پہلوؤں کا انہی جیسے وسائل سے مقابلہ کر سکے۔

معاشرہ انسانی پہلے بھی اس دین کی راہ روکتا رہا ہے۔ آج بھی روک رہا ہے اور آئندہ بھی روکے گا۔ کیونکہ یہ دین "زمین" پر اقتدارِ الہی کے علاوہ ہر اقتدار سے "انسان" کی آزادی کا اعلان ہے۔ چنانچہ معاشرہ انسانی اس کی راہ میں تصور و اعتقاد کی چٹانیں بھی حائل کرے گا اور محسوس مادی دیواریں بھی، سیاسی اور اجتماعی رکاوٹیں بھی حائل کرے گا اور نسلی، اقتصادی اور طبقاتی خندقیں بھی۔ اور ان کے جلو میں باطل تصورات اور گمراہ عقائد کا بھی لشکر ہوگا۔ یہ ساری قوتیں پوری مضبوطی سے باہم پیوست ہوں گی اور ایک ساتھ مل کر اس کا مقابلہ کریں گی۔

اگر "تبلیغ" عقائد و تصورات کے مقابلے میں ہوگی تو "تحریک" مادی قوتوں سے برسرِ پیکار ہوگی۔ مادی قوتوں میں پیش پیش وہ سیاسی اقتدار ہوگا جو تصوری و اعتقادی، قومی اور طبقاتی، اجتماعی اور اقتصادی بنیادوں۔۔۔ باہم

مربوط و پیوست بنیادوں پر قائم ہوگا اس طرح تبلیغ و تحریک دونوں بیک وقت پورے انسانی ماحول سے پنچہ آزما ہوں ہوگی اور یہ جنگ اسی وجہ کے وسائل کے ساتھ ہوگی۔ "زمین" پر بسنے والے تمام "انسانوں" کو سامنے رکھنے والی تحریک آزادی کے لیے ان دونوں کا ایک ساتھ ہونا ناگزیر ہے۔ یہ نہایت اہم نکتہ ہے جسے ایک بار پھر ذہن نشین کرنا ضروری ہے!

یہ دین صرف عربی انسانوں کی آزادی کا اعلان نہیں! یہ عرب کے ساتھ خصوصیت رکھنے والا کوئی پیام نہیں!۔ اس کا موضوع ہے "انسان" "نوع انسان"۔ اس کی جولا نگاہ ہے "زمین"۔ پوری "زمین" اللہ تعالیٰ صرف عرب کا رب نہیں۔ تنہا عقیدہ اسلامی کے فرزندوں کا بھی رب نہیں۔ وہ تو "رب العالمین" ہے۔ اور یہ دین چاہتا ہے کہ سارے "اہل عالم" کو پھر ان کے رب کے آستانے پر لا جھکائے۔ اور اس طرح انہیں غیروں کے دائم عبودیت سے رہائی دے اور سب سے بڑی عبودیت اسلام کی نگاہ میں یہ ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے آگے گردن تسلیم خم کر دے۔ یہ وہ "عبادت" ہے جس کے سلسلہ میں دین کا مطالبہ ہے کہ وہ صرف اللہ کے لیے خاص ہو۔ اور جو اس عبادت کو غیر اللہ کے آستانے پر انجام دیتا ہے، یا اس کے لیے غیر اللہ کو قبلہ قرار دیتا ہے اس کا اسی لہجہ دین سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، چاہے وہ زبان سے اس دین میں ہونے کے کتنے ہی بلند بانگ دعوے کرتا ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت کی ہے کہ قوانین و احکام کے سلسلہ میں "پیرومی" ہی وہ "عبادت" ہے، جس کی وجہ سے یہود و نصاریٰ "مشرک" قرار پائے۔ اور جس عبادتِ الہی کا انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی خلاف ورزی کے مجرم گردانے گئے۔

ترمذی شریف کی روایت ہے کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کو جب رسول اللہ



صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچی تو وہ شام بھاگ گئے۔ دو درجاہلیت میں یہ نصرانی ہو گئے تھے۔ پھر ان کی بہن اور قوم کے کچھ افراد گرفتار ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہن پر کرم فرمایا اور رہا کر دیا۔ وہ اپنے بھائی کے پاس لوٹ کر آئیں اور اسلام لانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق دلایا۔ ادھر لوگوں میں ان کی آمد کا چرچا ہو گیا۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت ان کی گردن میں چاندی کی صلیب تھی اور زبان مبارک پر یہ آیت تھی:

اتَّخَذُوا آجْبَارَهُمْ وَرَضُوا إِلَيْهِمْ  
 أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ۔  
 انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے اجبار و  
 رہبان کو رب بنا لیا۔

حضرت عدی نے یہ آیت سنی تو عرض کیا: انہوں نے ان کی عبادت تو کی نہیں۔ آپ نے فرمایا: ”کیوں نہیں! انہوں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا۔ اور لوگوں نے دیدہ و دانستہ ان کی پیروی کی۔ بس یہی ان کی عبادت ہوئی“

زبان مبارک سے آیت کی یہ تفسیر اس بات کے لیے نص قطعاً ہے کہ شرائع و احکام کے سلسلہ میں غیر اللہ کی پیروی وہ عبادت ہے جو آدمی کو دین سے خارج کر دیتی ہے۔ اور اسی کا دوسرا نام ہے کچھ انسانوں کو رب بنا لینا۔ یہ دین آیا تھا تاکہ اسی چیز کو ختم کرے اور ”زمین“ پر غیر اللہ کی بندگی سے ”انسان“ کی آزادی کا اعلان کرے۔

اس طرح اسلام کے لیے یہ بات ناگزیر ہو گئی کہ اس اعلان عام کی راہ میں مزاحم ہونے والے ”معاشرے“ کو مٹا دینے کے لیے وہ تبلیغ و تحریک دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلے۔ اور ان سیاسی طاقتوں پر بہم ضرر نہیں لگائے جو انسانوں سے غیر اللہ کی بندگی کو اتنی یا شریعت الہی سے بے گانہ ہو کر ان پر حکمرانی کرتی ہیں۔ اور پوری آزادی کے ساتھ دعوت سننے اور

”عقیدے“ کو اپنانے کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو جاتی ہیں تاکہ اس کے بعد وہ ایک ایسا اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی نظام قائم کر سکے جو اس تحریک آزادی کے لیے راہیں کشادہ کر دے۔ اور ایسا ممکن نہیں جب تک اقتدار وقت کو خواہ وہ اقتدار خالص سیاسی ہو، یا قومیت کے رنگ میں ہو یا طبقاتی بنیاد پر ہو۔ بیخ و بن سے نہ اکھاڑ پھینکا جائے۔

اسلام کے پیش نظر یہ بات کبھی نہ رہی کہ وہ لوگوں کو اپنا عقیدہ قبول کرنے پر مجبور کرے۔ — البتہ اسلام صرف ”عقیدہ“ ہی نہیں ہے۔ اسلام جیسا کہ ہم پہلے کہ چکے ہیں، بندوں کی بندگی سے انسان کی آزادی کا اعلان ہے۔ وہ اول روز سے ہی ایسے نظاموں اور ایسی حکومتوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتا ہے جن کی بنیاد ہے، انسان پر انسان کی حاکمیت اور انسان کے لیے انسان کی عبودیت۔ — پھر وہ افراد پر سے سیاسی دباؤ اٹھالینے اور تفہیم و تبلیغ سے عقل و روح میں روشنی پہنچانے کے بعد انھیں عملاً آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ اپنی مرضی سے جو عقیدہ چاہیں اختیار کریں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ خواہشات نفس کو اپنا الہ بنا لیں یا خود اپنی پسند سے بندوں کی بندگی اختیار کر لیں! یا اللہ کے بجائے اپنے ہی اندر کے کچھ افراد کو اپنا رب بنا لیں! — ایسا نظام جو دنیا میں انسانوں پر حکمرانی کرے، ایسے نظام کے لیے صرف اللہ کی عبودیت پر قائم ہونا شرط ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب شرائع و احکام صرف بارگاہ ایزدی سے حاصل کیے جائیں۔ اور اس عالمگیر نظام کے سایہ میں رہتے ہوئے ہی ہر فرد جو عقیدہ چاہے اپنائے! اسی طرح ”دین“ یعنی کامل تسلیم و رضا اور مکمل پیروی و بندگی اللہ تعالیٰ کے لیے ہو سکے گی ”دین“ کا مفہوم ”عقیدے“ کے مفہوم سے زیادہ وسیع ہے۔ دین وہ طریق کار اور وہ نظام ہے جو زندگی پر حکمرانی کرے۔ اور اسلام میں عقیدہ ہی اس کی بنیاد

اور اس کا ستون ہوگا۔ لیکن وہ اپنے عموم میں عقیدے سے زیادہ وسیع اور جامع ہے۔ پھر اسلام کے اندر اس کا پورا امکان ہے کہ مختلف جماعتیں اس کے عام نظام کی پابند ہوں، جو صرف بندگی رب کی بنیاد پر قائم ہوگا، اگرچہ وہ سب عقیدہ اسلام سے وابستہ نہ ہوں۔

جو شخص دین کے مزاج کو اس انداز سے سمجھ لیتا ہے اس کو جہاد باللسان کے دوش بدوش جہاد باسیف کی صورت میں اسلام کی تحریکی سرگرمیوں کی ناگزیری کا احساس ہو جاتا ہے۔ نیز اسے پوری طرح اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی دفاعی تحریک نہ تھی۔ دفاعی تحریک اس تنگ مفہوم میں جس سے آج کا ذہن مانوس ہے۔ جیسا کہ موجودہ معاشرے سے مرعوب اور مستشرقین کے پُر فریب حملوں سے متاثر حضرات کا دعویٰ ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ اسلام کی تحریک جہاد کو بھی اسی لباس اور اسی رنگ میں پیش کریں، حالانکہ وہ تو ”زمین“ پر آزادی ”انسان“ کی منادی تھی۔ وہ آزادی انسان کے لیے جدوجہد کرتے والی ایک تحریک تھی جو مخالف ماحول کے سارے پہلوؤں کے لحاظ سے جو وسائل درکار ہوتے، ان کو استعمال کرتی اور تدریجی طور پر ہر مرحلے کے لیے نئے نئے وسائل سے کام لیتی۔ اور اگر یہی ضروری ہے کہ اسلام کی تحریک جہاد کو ہم دفاعی تحریک کا نام دیں، تو ضروری ہوگا کہ لفظ ”دفاع“ کے مفہوم میں تھوڑی سی ترمیم کر لیں۔ اور اسے خود ”انسانیت کا دفاع“ سمجھیں۔ ان تمام عوامل کے خلاف جدوجہد سمجھیں جو انسان کی حریت کو پامال کرتے اور اس کی آزادی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ یہ عوامل کبھی عقائد و تصورات کے روپ میں ہو سکتے ہیں، اور کبھی ان سیاسی نظاموں کی صورت میں جو اقتصادی، طبقاتی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں۔ یہی عوامل ہیں جن کی اس روز پورے عالم پر نگرانی تھی جس روز اسلام کی صبح سعادت طلوع ہوئی تھی۔ اور جو مختلف شکلوں

میں اس دور کی موجودہ جاہلیت میں بھی راج و کار فرمائیں !

لفظ ”دفاع“ کے مفہوم میں یہ وسعت پیدا کر لینے کے بعد ہم اسلام کی جہادی سرگرمیوں کی حقیقت تک باسانی پہنچ سکتے ہیں۔ اور صحیح طور پر اسلام کی اس حیثیت کا ادراک کر سکتے ہیں، کہ وہ بندوں کی بندگی سے انسان کی آزادی کا کھلا ہوا اعلان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس زمین پر صرف اللہ کی الوہیت و ربوبیت کا پرچم لہرائے۔ دُنیا کے کسی کونے میں لادینی حکومت کا وجود نہ رہ جائے۔ ہر طرف بس شریعت الہیہ کی مقدس حکومت کا سکہ چلے۔

یہی یہ ذہنیت کہ جہادِ اسلامی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے دفاعی اسباب کا سراغ لگایا جائے۔ اسلامی جنگیں خالص دفاعی جنگیں قرار دی جائیں۔ دفاعی جنگیں اس تنگ مفہوم میں، جس سے آج کا ذہن مانوس ہے۔ اور اس عرصے کے دلائل مہیا کرنے کی کوشش کی جائے کہ جہادِ اسلامی کے معرکے محض ہمسایہ ظالم قوتوں کی طرف سے ”وطنِ اسلامی“ یا بعض لوگوں کی زبان میں جزیرہ عرب کی طرف بڑھتے ہوئے سیلِ عدوان کو روکنے کے لیے ظہور میں آئے، تو جہاں یہ بات اس دین کے مزاج سے ناواقفیت اور دُنیا میں جو کہ دارِ وہ ادا کرنے آیا تھا اس سے بے خبری کی غماز ہے، وہیں یہ موجودہ معاشرے سے شکست اور جہادِ اسلامی پر متشرقین کے عیارانہ حملوں سے مرعوبیت کی دلیل ہے !

تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم جزیرہ عرب پر روم و ایران کی دست درازیوں سے مطمئن ہو گئے ہوتے تو کیا وہ اکنافِ عالم کو سیلِ اسلام کی لقرنی موجوں سے سیراب نہ کرتے۔ کیا اس اوقیانوسِ تجلی کی جاں نواز لہریں وہ زمین کے گوشے گوشے میں نہ پہنچاتے؟ پھر بتاؤ، وہ یہ لہریں اکنافِ عالم میں کیونکر پہنچاتے جب کہ دعوت کی راہ میں نسلی، طبقاتی اور اقتصادی نظاروں کی مضبوط چٹانیں اور سیاسی نظامہائے حکومت کی آہنی دیواریں حائل تھیں، اور حکومت کی مادہی قوتیں بھی ان کی حمایت میں تھیں؟!



اسلام سے خائف رہتے۔ اس طرح اہل زمین تین قسموں میں بٹ گئے: مومنین، مخلصین، پُر امن اہل صلح (اور یہی اہل ذمہ ہیں جیسا کہ سابق جملے سے پتہ چلتا ہے) اور خائف اہل حرب۔

یہ وہ مراحل ہیں جن کا منطقی طور پر پیش آنا ناگزیر ہے۔ دین کے مزاج اور اس کے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ رہی وہ بات جو موجودہ معاشرے سے مرعوب اور مستشرقین کے شاطرانہ حملوں سے شکست خوردہ حضرات سمجھتے ہیں، تو اسے دین کے مزاج اور اس کے مقاصد سے کوئی واسطہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مکہ میں مسلمانوں کو جنگ سے باز رکھا۔ اور مدینہ کی ابتدائی زندگی میں بھی جنگ کی اجازت نہ دی۔ ان سے کہا گیا:

كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ  
وَآتُوا الزَّكَاةَ

اپنے ہاتھ (لڑائی سے) روکے رکھو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے ہو۔

پھر اجازت مل گئی۔ ارشاد ہوا:

أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ  
ظَلَمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ  
لَقَدِيرٌ۔ الَّذِينَ أَخْرَجُوا مِنْ  
دِيَارِهِمْ بغيرِ حَقِّ إِلَّا أَن يَقُولُوا  
رَبُّنَا اللَّهُ وَلَوْ لَدَفَعَ اللَّهُ النَّاسَ  
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهَادَّتِ  
صَوَامِعُ وَبَعُصَلَاتٍ وَ  
مَسَاجِدُ يُذَكَّرُ فِيهَا اسْمُ  
اللَّهِ كَثِيرًا۔ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ  
مَنْ يَنْصُرُهُ۔ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ  
عَزِيزٌ۔ الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّا

اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔ اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے وہ لوگ ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، محض اس تصور میں کہ وہ کہتے ہیں، "ہمارا رب اللہ ہے" اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو درویشوں کے غلوت خانے اور گریبے اور یتیموں کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا بہت نام لیا جاتا ہے سب ڈھادی جاتیں، اور یقیناً اللہ اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرے گا بلاشبہ اللہ

توت وراور بے پناہ طاقت کا مالک ہے۔ وہ لوگ  
کہ اگر ہم زمین پر انھیں اقتدار عطا کریں تو وہ  
نماز قائم رکھیں، اور زکوٰۃ دیں اور بھلائی کا حکم  
دیں اور برائی سے روکیں اور سارے معاملات  
کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

هُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا  
الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ  
وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا  
عَنِ الْمُنْكَرِ وَرَبُّهُمُ  
الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ

پھر جو لوگ خود جنگ میں پہل کریں، ان سے جنگ فرض کی گئی۔ ارشاد ہوا:  
وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ  
الَّذِينَ يُقَاتِلُوا نَفْسَكُمْ

اور خدا کی راہ میں ان سے جنگ کر دو جو تم  
سے جنگ کریں۔

پھر سارے ہی مشرکین سے جنگ فرض کر دی گئی، حکم ہوا:  
وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَمَا  
يُقَاتِلُونَكُمْ كَمَا  
لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ  
اللَّهُ وَالرَّسُولُ وَلَا يَدِينُونَ  
دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا  
الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ  
عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ

اور تم سب مل کر مشرکوں سے جنگ کرو جس  
طرح وہ سب مل کر تم سے جنگ کرتے ہیں۔  
جنگ کرو ان اہل کتاب سے جو نہ اللہ پر  
ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخرت پر۔ اور نہ  
اسے حرام کرتے ہیں جسے اللہ اور اس کے  
رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام ٹھہرایا ہے۔ اور  
نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ  
ہر طرح کے اقتدار سے دست کش ہو کر اور چھوٹے  
بن کر جزیہ دینے لگیں۔

گویا جنگ — جیسا کہ امام ابن قیم کا کہنا ہے — پہلے حرام تھی پھر  
اس کی اجازت دی گئی۔ پھر جو لوگ پہل کریں ان سے فرض کر دی گئی پھر سارے  
ہی مشرکین سے جنگ کا حکم دیا گیا۔

جہاد کے سلسلے میں آئے ہوئے قرآنی نصوص، ان پر ابھارنے والی احادیث  
رسول اور آغاز اسلام، پھر پوری تاریخ اسلام میں پیش آنے والے جہادی معرکے:

ان واضح ترین حقائق کو سامنے رکھو، پھر بتاؤ، کیا اب بھی اس تاویل و تفسیر کے لیے کوئی گنجائش رہ گئی جو دین کے ان نادان دوستوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے، جو ماحول کے دباؤ سے بری طرح مرعوب اور جہادِ اسلامی پر مستشرقین کے عیارانہ حملوں سے حد درجہ حیران و سرسیمہ ہیں!

کون ہوگا جو اس سلسلہ میں خدا کی طرف سے آئے ہوئے احکام اور اس کے رسول سے ملی ہوئی ہدایات سنے اور جہادِ اسلامی کے بہرہ ہونے والے معرکوں کا متبع کرے، پھر اسے وہ ایک عارضی چیز سمجھے جو انہی بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ خاص تھی۔ اور اس طرح وہ سرحدوں کی حفاظت کے لیے محض دفاع پر ہی اکتفا کر لے؟!

جن ابتدائی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو قتال کی اجازت دی ہے۔ ان میں واضح طور پر بتا دیا ہے کہ زمین سے فساد و بد امنی مٹانے کے لیے ہمیشہ کچھ عناصر کو کچھ حق پرست ہاتھوں سے بے دخل کیا جاتا رہے گا:

اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جاتی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے وہ لوگ کہ ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے محض اس لیے کہ وہ کہتے ہیں "ہمارا رب اللہ ہے" اور اگر

أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ - الَّذِينَ أَخْرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ بغيرِ حَقِّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ وَكَوَدَّ فَعُ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّمَّا دَمَّتْ سَوَاقِعٌ مَّعَ وَبِيعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا -

اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے ہٹاتا رہتا تو درویشوں کے خلوت خانے اور گرجے اور منور دیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا بہت نام لیا جاتا ہے، سب ڈھادی جائیں۔

گویا یہ ایک دائمی حقیقت ہے، عارضی حالت نہیں۔ یہ ایک دائمی حقیقت ہے کہ اس زمین پر حق اور باطل ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اسلام جب بھی روبرویت



الہی اور بندوں کی بندگی سے انسان کی آزادی کا اعلان کرے گا، وقت کی باطل طاقتیں پورے ظنطنہ کے ساتھ آگے بڑھیں گی۔ اور صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح اسے مٹا دینا چاہیں گی۔ ادھر اسلام بھی انھیں نیست و نابود کر دینے کے لیے پورا زور صرف کرے گا، تاکہ انسانوں کو ان کے پنجہ استبداد سے رہائی دے۔ اور مظلوم انسانیت کو اس کا حق آزادی واپس دلائے۔ اس طرح یہ ایک دائمی حالت ہے جس کے ہوتے ہوئے تحریک جہاد کی سرگرمیاں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں۔ یہاں تک کہ ہر جگہ طاعتِ الہی کا جاہاں نرا زجلوہ نظر آنے لگے۔

مکہ میں قتال سے باز رہنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس طویل نقشہ کار کی ایک جزئیہ اس لیے سفر کی ایک منزل تھی۔ یہی بات مدینہ کی ابتدائی زندگی کے سلسلہ میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ پھر مدینہ میں تحریکی زندگی کا پہلا مرحلہ گزر جانے کے بعد جس چیز نے مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا وہ صرف مدینہ کے دفاع اور اس کو پر امن بنانے کا مسئلہ نہ تھا۔ بلاشبہ یہ بھی ایک اہم مقصد تھا جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ لیکن یہی اصل مقصد نہ تھا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ تحریک کے آگے بڑھنے کے لیے جو وسائل و ذرائع درکار ہیں، ان کی فراہمی نیز مرکز تحریک کا تحفظ ہو، تاکہ وہ تحریک انسان کو اس کی کھوئی ہوئی آزادی واپس دلا سکے۔ اور جو چٹانیں راہ میں حائل ہو کر اس کو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں، ان کو پاش پاش کر سکے۔

مکہ میں اسلام کے بزور نہ بولنے یا قتال سے باز رکھنے کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ وہاں دعوت و تبلیغ کی ماکمل آزادی تھی۔ رسالت مآب ﷺ علیہ وسلم کے ساتھ بنی ہاشم کی تلواریں تھیں، آپ پوری آزادی کے ساتھ دعوت کا اعلان کر سکتے تھے۔ افراد سے براہ راست خطاب کر سکتے تھے۔ کانوں، اور کانوں سے بڑھ کر دعوں کو اپنی آواز بنا سکتے تھے۔ وہاں کوئی منظم سیاسی قوت بھی نہ تھی۔ جو دعوت کی راہ میں مانع ہوتی، یا اس کی آواز کانوں

تک نہ پہنچنے دیتی! لہذا اس مرحلہ میں قوت سے کام لینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد اسباب تھے، جو ہم نے ”فی ظلال القرآن“ میں سورہ نساء کی آیت ”أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ“ کی تفسیر کرتے ہوئے مختصراً بیان کیے ہیں۔ ان کا کچھ حصہ یہاں نقل کر دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا:

اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مکی دور دراصل ایک تربیتی دور تھا۔ ایک خاص ماحول میں ایک خاص قسم کی تربیت کا مرحلہ تھا۔ اس جیسے ماحول میں تربیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ آدمی ایسی باتوں پر صبر کرنے کا عادی ہو جائے جن پر صبر کرنے کا اس ماحول میں تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مثلاً اپنے ساتھ یا عزیزوں کے ساتھ ظلم ہوتا دیکھ کر خاموش رہ جانا ایک عربی شخص کے لیے ناقابل تصورات تھی۔ اس انداز کی تربیت سے مقصود یہ تھا کہ آدمی اپنی شخصیت سے بلند اور اپنی ذات سے یکسر آزاد ہو جائے۔ خود اپنی ذات اور اپنے افراد اس کی نگاہ میں زندگی کا محور اور پلچسپیوں کا محرک نہ رہ جائیں۔ وہ اعصاب پر پوری طرح قابو رکھ سکے طبیعت کے خلاف کوئی بات دیکھتے ہی طیش میں نہ آجائے کسی اشتعال انگیز حرکت پر فوراً آستینیں نہ پھڑکھالے۔ اس کے مزاج میں اعتدال اور عام سرگرمیوں میں توازن پیدا ہو سکے۔ وہ ایک منظم معاشرے کے آداب و اصول کا پاس و لحاظ رکھ سکے۔ زندگی کے سارے امور میں وہاں کی قیادت کی طرف رجوع کرے۔ اور اپنے تصرفات میں اس کی منشاء و مصلحت کو کبھی نظر انداز نہ کرے، گریہ وہ اس کی طبیعت اور عادت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ایک مہذب اور ترقی یافتہ اسلامی معاشرہ جو ایک منظم قیادت کا تابع ہو، وحشی اور قبائلی نہ ہو! ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کے لیے اس انداز کی تربیت انتہائی ناگزیر تھی!

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صلح پسند دعوت قریش جیسے معاشرے

میں زیادہ موثر اور کارگر ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ معاشرہ غرور و نخوت کا اسیر اور جاہ و شرف کا دلدادہ تھا۔ اس وقت اگر جنگ کی جاتی تو اس کی نخوت کی آگ اور بھرپک اٹھتی پھر خونیں انتقامات کا ایک نیا سلسلہ چل پڑتا، جب کہ عرب کا وہ مشہور خونیں سلسلہ ختم ہوئے ابھی زیادہ دن نہ ہوئے تھے جس کی کوکھ سے وحس و غبار اور بسوس کے قیامت خیز معرکوں نے جنم لیا۔ جو سالہا سال تک جاری رہے اور قبائل کے قبائل ان میں فنا کی نظر ہو گئے۔ بتاؤ، اگر خونیں معرکوں کا وہی لامحدود سلسلہ پھر چل پڑتا تو یہ دعوت اسلامی کے حق میں کتنا برا ہوتا۔ یہ خونیں معرکے ان کے ذہنوں پر انتہائی گہرے نقوش چھوڑ جاتے جو کبھی مٹنے کا نام نہ لیتے۔ اسلام کا نام آتا، اور گزری ہوئی ساری تلخیاں ذہنوں میں تازہ ہو جاتیں۔ اس وقت اسلام ایک دعوت اور ایک مذہب ہونے کے بجائے انہی خونیں انتقامات کا دلزد مرقع بن کر رہ جاتا۔ اس کا بنیادی رُخ ابتدا میں ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور پھر کبھی بھول کر بھی نہ یاد آتا!

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جنگ سے وہاں کا ہر گھر قتل و خون کی بھیانک رزم گاہ میں تبدیل ہو جاتا۔ کیونکہ وہاں کوئی منظم اور ہمہ گیر نظام حکومت نہ تھا، جو مومنین کو تاتا اور آزمائشوں میں ڈالتا۔ یہ بس۔ قید کے اویانر کے ذمہ تھا، کہ اس کو تائیں، آزمائشوں کی بھٹی میں تپائیں اور اسے ”راہ راست“ پر لانے کی کوشش کریں! ایک ایسے معاشرے میں قتال کی اجازت دینے کا مطلب یہ تھا کہ گھر گھر جنگ کے خونیں شعاع بھرپک اٹھتے۔ اس وقت کہا جاتا، یہ ہے اسلام! چنانچہ کہنے والوں نے کہا بھی۔ جب کہ اسلام کی طرف سے جنگ کی شدید ممانعت تھی! حج کے موقعوں پر آنے والے قافلوں میں قریش کی طرف سے یہی پروپیگنڈا ہوتا کہ: محمد کنبہ و خاندان ہی میں نہیں، باپ بیٹوں میں پھوٹ ڈال رہے

میں! پھر گھر گھر اور محلے محلے کا کیا حال ہوتا اگر وہ بیٹے کو باپ کے قتل کرنے اور غلام کو آقا کا خون بہانے کی اجازت دے دیتا۔ ہے“

”ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہی دشمنانِ اسلام جو آج مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں انھیں بے پناہ مظالم اور شرمناک ایذا رسانیوں کا تختہ مشق بنانے میں کل یہی اسلام کے مخلص سپاہی اور تحریکِ اسلامی کے قائد ہوں گے۔ کیا عمر بن خطاب انہی لوگوں میں نہ تھے؟“

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قبائلی ماحولِ عربی سختی کے نشے میں چور تھا ایسے مظلوم کو دیکھ کر اس کی آتشِ حمیت بھر پک اٹھتی، جو اذیتیں تو سہتا، پر کوئی جو اپنی کارروائی نہ کرتا! خصوصاً جب کہ ان کے شرفار کے ساتھ یہ صورتِ حال پیش آجائے۔ چنانچہ اس قسم کے بہت سے واقعات ہوئے جو اس ماحول کے سلسلہ میں ہمارے اس خیال کی تائید کرتے۔ ابنِ وہب نے کہا کہ یہ بات گوارا نہ ہوتی کہ ابوبکرؓ جیسا شریف انسان مکہ سے ہجرت کر جائے کہ اس کے نزدیک یہ سب کے لیے ڈوب مرنے کی بات تھی! چنانچہ اس نے خود ہی امان دینے کی پیش کش کی۔ شعب ابی طالب میں بنی ہاشم محصور کر دیئے گئے۔ مدتِ حصار کافی دراز ہو گئی۔ فقر و فاقہ اور بے کسی عروج کو پہنچ گئی۔ یہ کرب ناک اور رقت انگیز منظر دیکھ کر کچھ افراد کا بے قابو ہو جانا اور صحیفۂ حصار کو پارہ پارہ کر ڈالنے کا عزم کر لینا اس دعوے کی روشن دلیل ہے۔ جب کہ ”تہذیب“ قدیم کی آغوش میں پلنے والے ایک معاشرے میں، جو بیستیِ فطرت کا شکار ہوتا ہے، اذیتوں پر آف نہ کرنا، معاشرے کو استہزار و تمسخر کی دعوت دینا اور بے رحم ظالم کی تعظیم و تکریم پر افسانا ہوتا ہے!“

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت مسلمان بہت تھوڑے تھے، انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ اور جو کچھ تھے، وہ مکہ ہی کے اندر محصور تھے۔ کیونکہ دعوتِ اسلام ابھی مکہ سے باہر نہ پہنچ سکی تھی۔ یا پہنچی تھی تو اڑتی پڑتی خبروں کی شکل

میں نیزا بنائے قریش کے درمیان ہونے والی اس داخلی کشمکش کے سلسلہ میں دوسرے قبائل کا رویہ بالکل غیر جانبدارانہ تھا وہ انتظار میں تھے کہ دیکھیں، فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ محدود جنگ اس چھوٹی سی مسلم جماعت کو مٹا کر رکھ دیتی۔ اگرچہ وہ اپنے سے کئی گنا افراد کو مٹا کر ٹلتی۔ اس طرح شرک تو باقی رہتا اور مسلم جماعت ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ جاتی۔ پھر زمین پر نہ اسلامی نظام کا قیام ہوتا نہ کہیں اس کا عملی وجود ہوتا۔ جب کہ یہ دین آیا اس لیے ہے تاکہ وہ زندگی کا دستور العمل بنے۔ اور ایک واقعی اور عملی نظامِ زندگی کی شکل میں نظر آئے۔“

ربا مدینہ کا ابتدائی دور، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے یہودیوں نیز مدینہ اور قریب مدینہ کے مشرکوں سے جو معاہدہ کیا تھا، وہ بھی حالات کے عین مطابق تھا۔

اولاً: اس لیے کہ وہاں دعوت و تبلیغ کا ایک وسیع میدان تھا۔ کوئی ایسی سیاسی قوت نہ تھی جو آپ کے لیے سید راہ ہوتی، اور لوگوں میں کام کرنے سے روکتی۔ تمام لوگوں نے نئی مسلم ریاست کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور خوشی خوشی وہاں کے سیاسی معاملات کی نگیل آپ کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ معاہدہ میں باقاعدہ صراحت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر نہ کوئی کسی سے صلح کرے گا، نہ جنگ۔ نہ کہیں باہر سے کوئی ربط قائم کرے گا۔ اور یہ بات پوری طرح عیاں تھی، کہ مدینہ کی حقیقی قوت مسلم قیادت کے ہاتھ میں ہے۔ اس طرح دعوت کے لیے رات نہ کھلا ہوا تھا۔ اور لوگوں کو نظریہ و اعتقاد کی پوری آزادی بھی حاصل تھی۔

ثانیاً: اس وقت آپ اپنی تمام تر جہات قریش کی طرف یکسو کر دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کی طرف سے دین کی مخالفت ان قبائل کے لیے سدا رہا بنی ہوئی

تھی جو ابنائے قریش کے درمیان ہونے والی اس کشمکش کے سلسلہ میں یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اونٹ کس کر دٹ بیٹھتا ہے اور زمانے کا فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے! یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت جلد ہی ”سریئے (فوجی دستے) بھیجنے شروع کر دیے۔ چنانچہ ہجرت کے ساتویں ہی ماہ رمضان کے مہینے میں حضرت حمزہؓ کی سرکردگی میں آپ کے پہلا سر یہ روانہ کیا۔

پھر یہ سر یہ مسلسل جلتے رہے۔ نویں ماہ، پھر تیرھویں ماہ، پھر سوٹھویں ماہ، پھر سترھویں مہینے ماہ رجب میں سر یہ عبد اللہ بن جحش روانہ ہوا۔ یہ پہلا غزوہ تھا جس میں جنگ کی نوبت آئی اور چونکہ یہ غزوہ ماہ حرام میں پیش آیا، اس لیے اس سے متعلق سورہ بقرہ کی یہ آیتیں نازل ہوئیں:

اد لوگ تم سے ماہ حرام میں جنگ کے بارے میں پرچھتے ہیں۔ کہہ دو، اس میں جنگ کرنا بہت سنگین ہے۔ مگر اللہ کی راہ سے روکنا اس کے ساتھ کفر کرنا، مسجد حرام سے روکنا، اور اس کے لوگوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ سنگین ہے اور یہ فتنہ خوں ریزی سے زیادہ سنگین ہے۔ یہ لوگ تم سے لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اگر بس چلے تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ  
 قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ  
 وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ  
 وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ  
 أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ  
 وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ  
 وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ  
 يُرَدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِن  
 اسْتَطَاعُوا

پھر اسی سال ماہ رمضان میں بدر کا معرکہ پیش آیا جس کے سلسلہ میں سورہ انفال نازل ہوئی۔

اگر اصل واقعات کے درپچوں سے صحیح صورت حال کا مشاہدہ کیا جائے، تو یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ ”دفاع“ اپنے تنگ مفہوم میں —————  
 تحریک اسلامی کی بنیاد تھا۔ جیسا کہ موجودہ ماحول سے متاثر اور مستشرقین کے

عیار از حملوں سے مرعوب دوستوں کا دعویٰ ہے !  
 جو لوگ اسلامی قلمرو کی توسیع کے لیے جدوجہد کرنے والی تحریک کے واسطے  
 خالص اسباب تلاش کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں، وہ دراصل مستشرقین کی منظم  
 تحریک یلغار سے بڑی طرح مرعوب ہیں، کیونکہ آج مسلمانوں کی کوئی شوکت نہ رہی  
 بلکہ سچ پوچھو، تو اسلام سے ہی انھیں کوئی واسطہ نہ رہا! بس تھوڑے سے نفوس  
 قدسیہ ہیں جو اس آفت سے محفوظ ہیں۔ اور وہ ”زمین“ پر اقتدار الہی کے علاوہ  
 ہر اقتدار سے ”انسان“ کی آزادی کا اسلامی اعلان کرنے پر مصر ہیں، تاکہ ہر جگہ صرف  
 طاعت الہی کا جان نواز منظر دیکھ سکیں، ورنہ اکثر لوگ تو بڑی طرح مرعوب اور  
 احساس کہتری کا شکار ہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ جہاد اسلامی کے لیے کوئی اخلاقی  
 جواز تلاش کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں!

حالانکہ جہاد اسلامی کو اس طرح کی خوشنما توجیہات کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس  
 کے لیے تو وہی توجیہات کافی ہیں جو قرآنی نصوص میں موجود ہیں:

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ  
 يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ  
 وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ  
 فَيُتْلَفْ أَوْ يُغْلَبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ  
 أَجْرًا عَظِيمًا - وَمَا لَكُمْ تَقَاتِلُونَ  
 فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ  
 مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ  
 الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا  
 مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ  
 أَهْلُهَا فَأَجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ  
 وِلْيَاءً وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ

سورجورگ دینا کی زندگی کے بدلے آخرت  
 کا سودا کریں۔ اور انھیں چاہیے کہ اللہ کی  
 راہ میں لڑیں۔ اور جو اللہ کی راہ میں لڑے  
 گا۔ تو چاہے وہ مارا جائے یا غالب ہو، اسے  
 جلد ہم بڑا بدلہ دیں گے۔ اور تم اللہ کی راہ میں  
 ان کمزوروں اور بے بس (مردوں، عورتوں  
 اور بچوں کے لیے کیوں نہ لڑو، جو دعائیں  
 کر رہے ہیں کہ ہمارے رب! تو ہمیں اس  
 بستی سے نکال جہاں کے لوگ ظالم ہیں! اور  
 تو ہمارا حملہ تیری دوست ہو جا! اور تو ہمارا  
 مددگار بن جا۔ جو لوگ ایمان لائے وہ

اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ تو تم شیطان کے ساتھیوں سے رطو بلاشبہ شیطان کی چال بہت کمزور ہے۔  
(سورہ النساء)

داسے نبی! جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان سے کہہ دو کہ اگر وہ شرک سے باز آجائیں تو جو پچھلے گناہ ہو چکے ہیں وہ معاف کر دیے جائیں گے اور اگر وہ شرک پر مصر ہوں تو جان لیں کہ ان لوگوں کے سلسلہ میں سنت الہی نافذ ہو چکی ہے اور تم ان سے جنگ کرو۔ یہاں تک کہ فتنہ و شرک باقی نہ رہے اور اطاعت پوری کی پوری اللہ کے لیے ہو جائے۔ اگر وہ باز آجائیں تو جو کچھ وہ کہتے ہیں، اللہ اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر وہ منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا ولی ہے۔ کیا ہی اچھا ولی ہے۔ اور کیا اچھا مددگار ہے۔

جنگ کرو ان اہل کتاب سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روز آخرت پر اور نہ اسے حرام کہتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے۔ اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ہر طرح کے افسوس سے دست کش ہو کر اور چھوٹے بن کر جزیرہ دینے لگیں یہودیوں

تَصِيْرًا ۙ الَّذِينَ اٰمَنُوْا يٰقَاتِلُوْنَ  
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا  
يٰقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ  
فَقَاتِلُوْنَ اَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ ط  
اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا  
قُلْ لِلّٰذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ يَنْتَهُوْا  
يَغْفِرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ وَاِنْ  
يُعُوْذُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّةُ  
الْاَوَّلِيْنَ. وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا  
تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ  
كُلُّهُ لِلّٰهِ اِنْ اَنْتُمْ اِنَّا لِلّٰهِ  
بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا وَاِنْ  
تَوَلَّوْا فَاَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰكُمْ  
نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ  
: : : : :  
: : : : :  
: : : : :

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ  
بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا  
يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ  
وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنََ الْحَقِّ مِنْ  
الَّذِيْنَ اُوْتُوْا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوْا  
الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ



نے کہا: سرور اللہ کا بیٹا ہے۔ اور نصاریٰ نے کہا: مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی خود ساختہ اور من گھڑت باتیں ہیں۔ یہ بالکل ویسی ہی باتیں کہتے ہیں جیسی ان لوگوں نے کہیں جو دانستہ پہلے کفر میں پڑ چکے ہیں۔ اللہ انہیں ہلاک کرے یہ کہاں بھٹکے جا رہے ہیں؟ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے اہبار و رہبان کو رب بنا لیا۔ اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ انہیں بس یہی حکم دیا گیا تھا کہ اکیلے الہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں۔ اس کے سوا اور کوئی الہ نہیں اس کی شان اور عظمت کے منافی ہے وہ شرک جو یہ لوگ کر رہے ہیں یہ لوگ چاہتے ہیں کہ نور الہی کو اپنی افراتفریوں سے بچھادیں۔ مگر اللہ اپنے نور کو پورا کیسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چلے یہ کافر کتنے ہی جزبہ سہوں

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عَزِيزُ ابْنِ  
اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ  
ابْنُ اللَّهِ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ  
يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا  
مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَتَى يَوْمَهُمُ  
الْمَخْذُومُ وَالْحِيَادَهُمْ وَمَرْهَبَانَهُمْ  
أَرَبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحُ  
ابْنُ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا  
لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا لَا  
إِلَهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَ عَمَّا  
يُشْرِكُونَ - يُرِيدُونَ أَنْ  
يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ  
وَيَأْتِيَ اللَّهُ إِلَّا أَنْ تَنْتُمْ نُورَهُ  
وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ -  
(التوبة ۲۹-۳۲)

زمین پر خدا کی الوہیت و حاکمیت قائم کرنا، نظام الہی کو انسانی زندگیوں میں نافذ کرنا، شیاطین اور شیطانی نظاموں کو ملک بدر کرنا، اور اس انسانی اقتدار کو پاش پاش کر دینا جو انسانوں سے اپنی بندگی کرتا ہے، یہ وہ مقاصد و اسباب ہیں جو "لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اسلام کے موقف کو یقیناً ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ لوگ صرف اللہ کے بند ہیں، اور یہ بات کسی طرح صحیح نہیں کہ اس کے بندوں میں سے کوئی ان پر حکمرانی کرے۔ اور خود اپنی رائے اور خواہشات کا انہیں پابند کرے!

ہاں بندوں کے پنجہ اقتدار سے نکل جانے، اور یہ حقیقت تسلیم کر لینے کے بعد کہ سارا اقتدار صرف اللہ کے لیے ہے اور ساری بندگی اور طاعت کا مستحق صرف اللہ ہے، عقیدہ اپنانے کے سلسلہ میں کوئی زبردستی نہیں۔

زمین پر انسان کو مکمل آزادی دلانا، دوسرے لفظوں میں بندوں کی بندگی سے نکال کر اسے صرف ایک خدا کی بندگی میں داخل کرنا یہ وہ بلند مقصد ہے جو تنہا جہاد اسلامی کو صحیح اور سچی بجانب ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ باتیں غازیان اسلام کے ذہن و دماغ میں پوری وضاحت سے موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کسی کے ذہن میں کبھی یہ سوال نہیں اُبھر آ کہ وہ جہاد کے لیے کیوں نکلا ہے، نہ کسی کی زبان پر اس انداز کی باتیں آئیں: ہم اپنے وطن کی مدافعت میں نکلے ہیں، کیونکہ وہ پیہم خطرے کی زد میں ہے یا ہماری طرف رومی یا ایرانی سیلاب بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ ہم آگے بڑھ کر اس پر بند لگائیں گے۔ یا ہم اپنی قلم رو کی ترویج کریں گے، اور زیادہ سے زیادہ مال غنیمت حاصل کریں گے۔

ان لوگوں کی زبانوں پر وہی باتیں ہوتیں جو ربیع بن عامرؓ، حذیفہ بن محسن اور مغیرہ بن شعبہؓ کی زبانوں سے ادا ہوئیں۔ قادسیہ کے میدان میں ایرانی کمانڈر رستم جنگ سے پہلے مسلسل تین دن تک ان میں سے ایک ایک کو بلا کر پوچھتا رہا: تم کس لیے آئے ہو؟ اور ان سب کی طرف سے ایک ہی جواب ملتا رہا:

اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة  
العباد الى عبادة الله وحده. ومن  
ضيق الدنيا الى سعتها ومن  
جور الاديان الى عدل الاسلام  
فارسل رسولاً بين يديه  
الى خلقه فمن قبلنا من  
قبلنا منه ورجعنا عنه

اللہ نے ہمیں بھیجا ہے، تاکہ جسے وہ توفیق دے اُسے بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں داخل کریں دُنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعتوں میں پہنچائیں۔ اور دوسرے مذاہب کی نیادیتوں سے نکال کر عدل اسلام سے ہمکنار کریں۔ اسی لیے اس نے مخلوق کے پاس اپنا دین دے کر ایک رسول بھیجا اگر کوئی اس دین

وترکنا رصنه ومن ابی  
قاتلنا حتی نقضی الح  
الجنة أو الظفر۔

کو قبول کر لے تو یہ ہمارے لیے خوشی کی بات  
ہوگی، اور ہم لوٹ جائیں گے۔ اس کی سر زمین  
سے، کوئی تعرض نہیں کریں گے، مگر جو انکار  
کرے گا اس سے جنگ کریں گے، یہاں تک  
کہ ہم جنت میں پہنچ جائیں یا نصرت سے ہٹنا  
ہو جائیں۔

وقتی اور محدود دفاعی حالات کا سہارا لینے کی کوئی ضرورت نہیں جہاد کے  
لیے وجہ جواز تو خود اس دین کی طبیعت میں موجود ہے، اس کے پروگرام اور اس  
کے نصب العین میں موجود ہے۔ یہ دین خالص حاکمیت الہ کی بنیاد پر قائم ہے۔  
یہ تمام جھوٹی حاکمیتوں کے خلاف ایک کھلا ہوا اعلان جنگ ہے۔ پھر شروع  
سے ہی یہ انتہائی حقیقت پسند واقع ہوا ہے۔ یہ نہایت باریک بینی سے  
جاہلیت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر اس کے حسب حال وسائل اختیار  
کرتا، اور اس جاہلیت سے مقابلے کا عملی پروگرام بناتا ہے۔ جس مرحلے میں جن وسائل  
کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے لحاظ سے وہ نئے نئے وسائل کا استعمال کرتا ہے۔  
یہ ساری چیزیں جہاد اسلامی کے صحیح اور حق بجانب ہونے کے لیے بالکل کافی  
ہیں۔ اور یہ چیزیں سونائزل سے موجود ہیں، اگرچہ مقبوضہ اسلامی اور وطن کے  
مسلمانوں پر دست درازی کا کوئی اندیشہ نہ ہو، یہ الہی نظام، اس نظام کے  
واقعیات پسندی اور معاشرہ انسانی کی عملی رکاوٹیں یہ نہایت واضح دلیلیں ہیں جہاد  
اسلامی کے صحیح اور حق بجانب ہونے کے لیے۔

یہ اس بات کے لیے قطعاً کافی ہیں کہ مسلمان "خدا کی راہ" میں جان و مال  
سے جہاد کے لیے نکل کھڑا ہو، اور ان قدروں کے لیے مرٹن سے دریغ نہ کرے  
جن کے پیچھے اسے کسی ذاتی منفعت کی توقع نہیں۔ اور نہ ذاتی منفعت کی امید  
لے کر وہ نکلتا ہے۔

مسلمان جہاد کے لیے میدان جنگ میں اترنے سے پہلے اپنے اندرون میں جہاد اکبر کا عظیم نعرہ سر کر چکا ہے۔ یہ جہاد اکبر شیطان سے ہوتا ہے۔ نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات سے ہوتا ہے۔ بڑے تصورات اور غلط افکار سے ہوتا ہے۔ ذاتی اغراض اور قومی مصالح سے ہوتا ہے۔ خدا کی عبادت کرنا، زمین پر اقتدار الہی کا پریم لہرانا، اور جن طاغوتوں نے اقتدار الہی پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے ان کے ہاتھوں سے اقتدار کو چھیننا، صرف یہی جذبات اور یہی محرکات ہیں جن کو مومن دل میں پالتا اور پروان چڑھاتا ہے، ورنہ وہ سارے جذبات اور سارے محرکات سے لڑتا ہے۔

جہاد اسلامی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے جو لوگ "وطن اسلامی" کے تحفظ کی اڑتے ہیں، وہ نظام الہی کی شان و عظمت گھٹا دیتے ہیں، وہ اسے وطن سے بھی فروتر چیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ زمین و وطن کے سلسلہ میں اسلام کا یہ نقطہ نظر کبھی نہیں رہا۔ یہ نقطہ نظر بالکل ہی نیا، اور مزاج اسلامی کے لیے یکسر اجنبی ہے۔ کیونکہ عقیدہ، اسلامی نظام اور مسلم معاشرہ ہی وہ چیزیں ہیں جو اسلام کے نزدیک حیثیت کی مالک اور قدر و منزلت کی حامل ہیں۔ رہی زمین تو خود اس کا کوئی وزن اور کوئی اعتبار نہیں! اسلام کی نگاہ میں اس کو با وزن اور قابل اعتبار بنانے والی چیز صرف یہ ہے کہ اس پر نظام الہی کی حکمرانی اور شریعت اسلامی کا نفاذ ہو کہ اسی طرح وہ عقیدے کا گہوارہ نظام الہی کا منارہ، تحریک آزادی "انسان" کا مرکز اور "دارالاسلام" ہو سکتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ "دارالاسلام" کا تحفظ دراصل عقیدے اور اسلامی نظام کا تحفظ ہے اس نظام کی بنیاد پر قائم ہونے والے معاشرے کا تحفظ ہے۔ لیکن پھر بھی وہی اصل مقصد نہیں اور اس کا تحفظ اسلام کی تحریک جہاد کی آخری غایت نہیں۔ وہ تو دراصل ایک وسیلہ ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ میں حکومت الہی کا قیام ہو، پھر وہ ساری زمین میں پھیلنے اور تمام نوع انسانی کو دعوت اسلامی

سے روشناس کرنے کا نقطہ آغاز ہو، نوع انسانی اس دین کا موضوع اور ساری  
زمین اس کا میدانِ کار ہے!

جیسا کہ ہم پہلے کہ چکے ہیں، دین الہی کو لے کر جب ہم آگے بڑھنا چاہیں گے  
تو راہ میں بہت سی مادی چٹانیں حائل ہوں گی، حکومت کا اقتدار، معاشرے کا  
نظام اور ماحول کے تقاضے مضبوط چٹانوں کی شکل میں ہماری راہ روک کر کھڑے  
ہو جائیں گے۔ اسلام انہی چٹانوں کو پاش پاش کر دینے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔  
تاکہ اس کے اور انسانوں کے درمیان کوئی چیز روک نہ بن سکے۔ وہ چاہتا ہے کہ مادی  
شکنجوں سے انھیں مکمل طور پر آزاد کرالینے کے بعد ان کے فکر و ضمیر کو اپنی بات  
سنائے، پھر انھیں انتخاب کے لیے آزاد چھوڑ دے۔

ہمارا فرض ہے کہ "جہاد" پر مستشرقین کے حملوں سے دھوکہ نہ کھائیں اور  
نہ سراسیمہ ہوں۔ ماحول کا دباؤ جہادِ اسلامی کے خلاف عالمی پروپیگنڈہ ہمارے  
ذہن و دماغ پر اس طرح اثر انداز نہ ہو جائے کہ ہم جہادِ اسلامی کے لیے ایسی توجیہات  
کے سراغ میں لگ جائیں، جنھیں اس دین کے مزاج سے کوئی مناسبت نہ ہو،  
اور جو سراسر وقتی اور دفاعی حالات سے تعلق رکھتی ہوں کہ جہاد کا سلسلہ تو جاری  
رہے گا، خواہ یہ حالات پلٹے جائیں یا نہ پائے جائیں!

ہمارا فرض ہے کہ تاریخی حقائق کا جائزہ لیتے وقت اس دین کے مزاج سے  
غافل نہ ہو جائیں، اس کے اعلانِ عام اور عملی پروگرام میں جو چیزیں ذاتی طور پر  
اپنا اعتبار رکھتی ہیں، ان سے آنکھیں نہ موند لیں کہ اس طرح انھیں وقتی اور  
دفاعی تقاضوں سے گٹھ ملنے کی غلطی نہ بلٹیٹھیں۔

اس حقیقت سے ہمیں انکار نہیں کہ حملہ آوروں کے حملوں کا جواب دینا  
اس دین کے لیے ناکزیر ہے۔ کیونکہ یہ دین صرف بندگی رب کی دعوت دیتا، اور  
غیر اللہ کی طرف بڑھنے سے انسان کو روکتا ہے۔ یہ جاہلی قیادتوں سے بغاوت کا  
اعلان کرتا اور اپنی ایک الگ تبلیغ بناتا ہے۔ یہ ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کرتا

ہے جو انسان کی حاکمیت کو چیلنج کرتا اور اس کے اقتدار کی بنیادوں پر تیشے چلاتا ہے۔ ظاہر ہے دین کی یہ سرگرمیاں گروپش کے جاہلی معاشروں کو حرکت میں لانے، اور ان کے جذبات کو براگنچیتہ کر دینے کے لیے کافی ہیں یہ اس بات کے لیے کافی ہیں کہ وہ اس کے خلاف حرکت میں آئیں، اور اسے مٹا دینے کی راہ میں اپنی ساری قوتیں جھونک دیں۔ اس وقت نئے اسلامی معاشرے کے لیے بھی ناگزیر یہ ہوگا کہ اپنے بقا و تحفظ اور اپنی سالمیت کے لیے کھل کر مقابلے میں آجائے۔

یہ وہ صورت حال ہے جس کا پیش آنا ناگزیر ہے۔ اسلام کے وجود کے ساتھ ہی اس کا بھی ظہور ہوگا۔ یہ وہ معرکہ ہے جس میں حصّہ لینے پر اسلام کو مجبور کیا جائے گا۔ اس میں اترے بغیر اس کے لیے کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ دو ایسے وجود جن کا ایک ساتھ رہنا ناممکن ہو، ان میں باہم تصادم نہ ہونا کیونکر ممکن ہے؟

یہ سب صحیح ہے۔ اور یہیں سے اسلام کے لیے اپنا دفاع ناگزیر ہوگا۔ ایسی جنگ جو بالآخر اس کے سر تھوپی جائے اس میں حصّہ لینے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ مگر ایک بات اور ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم اور بنیادی ہے۔ خود اسلام کے مزاج کا یہ تقاضا ہے کہ آگے بڑھتے ہیں وہ پہل کرے تاکہ "انسان" کو غیر اللہ کے چنگل سے رہائی دے۔ اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ جغرافیائی سرحدوں پر آکر رک جائے، یا نسلی حدود کے اندر محصور ہو کر رہے۔ اور زمین پر رہنے والی ساری فروع انسانی کو شر و فساد کی طرف بڑھتے اور غیر اللہ کی بندگی کرتے ہوئے چھوڑ دے۔

اسلام دشمن طاقتوں پر کبھی وہ دور بھی آسکتا ہے کہ اگر اسلام انہیں ملکی حدود کے اندر اپنی خدائی کاسکے چلانے کی اجازت دے دے، ان کے معاملات میں کوئی مداخلت نہ کرے اور اپنی دعوت اور نعرہ حریت کا رخ ان کی طرف سے پھیر لے، تو وہ اسلام سے جنگ نہ مول لینے ہی میں عافیت

سمجھیں۔

لیکن اسلام ان سے مصالحت پر آمادہ نہ ہوگا، وہ اس وقت تک ان سے صلح نہیں کرے گا، جب تک ادا شدہ چیز کی صورت میں وہ اپنی طاعت و تابعداری کا اعلان نہ کر دیں۔ یہ گویا اس بات کی ضمانت ہوگی کہ تحریک اسلامی پر ان کے یہاں کوئی قدغن نہ ہوگا، بلکہ وہاں کی فضا اس کے لیے سازگار دعوت کے لیے بالکل ہموار ہوگی۔

یہ ہے اس دین کا مزاج، اور اس کا لصب یعنی۔ کیونکہ وہ ربوبیت الہی کی "اذان" اور بقیہ سارے خداؤں کی بندگی سے انسان کی مکمل آزادی کا اعلان ہے! ایک طرف اسلام کا یہ تصور ہے جو خود اس کے مزاج سے مترشح ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ تصور کہ وہ نسلی اور اقلیتی سرحدوں کے اندر محصور ہو کر رہ جائے۔ اختیار کی طرف سے دست درازی خطہ محسوس کیے بغیر حرکت میں نہ آئے! ان دونوں تصورات کو سامنے رکھو۔ اور ان کے فرق پر غور کرو۔ آخری صورت میں خود اس کے اندر ان سرگرمیوں کے لیے جو بنیادیں موجود ہیں ان سے وہ ہاتھ دھو بیٹھے گا! اسلام کی ان سرگرمیوں کو حق بجانب ثابت کرنے والے دلائل پوری وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں، اگر یہ بات یاد رکھی جائے کہ یہ دین انسانی زندگی کے لیے خدائی دستور ہے، کوئی انسانی دستور نہیں، نہ کسی خاص گروہ انسانی کا مذہب یا کسی مخصوص نسل و قوم کا نظام ہے۔ — خارجی دلائل کی جستجو اسی وقت ہوتی ہے جب ہمارے ذہنوں میں اس اہم اور روشن ترین حقیقت کا احساس دھندلا پڑ جاتا ہے۔ — جب ہم یہ فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ معاملہ خدا کی الوہیت اور بندوں کی بندگی کا ہے۔ — یہ کبھی ممکن نہیں کہ کسی انسان کے سامنے یہ روشن ترین حقیقت ہو، اور پھر وہ جہادِ اسلامی کے لیے دوسرے دلائل کا سہارا ڈھونڈے! یہ تصور کہ اسلام میدان کارزار میں اترنے پر مجبور تھا اس کے لیے اس سے صفر نہ تھا، کیونکہ اس کے چاروں طرف جاہلی معاشرہ کا ہجوم تھا، جن کی طرف سے اس

پر چڑھائی ہونی ناگزیر تھی، اور یہ تصور کہ اس کے لیے خود پیش قدمی کرنے اور میدان میں پہلے اترنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا، ابتداءً ان دونوں تصورات کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہیں نظر آتا۔

ابتداءً زیادہ فاصلہ نظر نہیں آتا، کیونکہ وہ دونوں ہی حالتوں میں لازمی طور پر معرکہ کارزار میں نظر آتا ہے۔ لیکن رات کے آخری سرے تک پہنچتے پہنچتے یہ فرق بہت زیادہ گہرا اور نمایاں ہو جاتا ہے جو اسلامی تصورات و احساسات کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔

اسلام ایک خدائی نظام ہے۔ وہ آیا ہے تاکہ زمین پر خدا کی الوہیت کی اذان دے، وہ آیا ہے تاکہ سارے انسانوں کو اسی ایک خدا کے حلقہ بندگی میں داخل کرے اور اس طرح ایک ایسا انسانی معاشرہ تیار کرے جو بندوں کی بندگی سے آزاد ہو، جو اپنی زمام کار شریعت الہی کے ہاتھوں میں دے چکا ہو کہ یہ شریعت ہی اس زمین پر اقتدار الہی کا منظر اور خدا کی الوہیت و حاکمیت کی آئینہ دار ہے۔ یہ ہے وہ عظیم مقصد جسے کہ اسلام اس دنیا میں آیا ہے۔ لہذا اسے بجا طور پر یہ حق ہے کہ راستے کے سارے عوائق کو دور و چھکیل دے۔ تاکہ انسانوں کے اجتماعی افکار اور حکومت کے سیاسی نظام راہ میں حائل نہ ہو سکیں، اور وہ براہ راست افراد کے ضمیر اور قوموں کے وجدان کو خطاب کر سکے۔ ایک طرف اسلام کا یہ تصور ہے، اور دوسری طرف یہ تصور کہ وہ کسی خاص وطن سے تعلق رکھنے والا ایک نظام ہے، جس کا کام صرف یہ ہے کہ اپنی اقلیمی حدود کے اندر ہی رہتے ہوئے باہری حملوں کو روکے، غور کرو تو ان دونوں تصورات میں زمین و آسمان کا فرق ہے!

یہ تصور اور ہے۔۔۔۔۔ وہ تصور اور ہے۔۔۔۔۔ اگرچہ اسلام دونوں ہی صورتوں میں جہاد کرے گا۔۔۔۔۔ لیکن اس جہاد کے اسباب و مقاصد اور نتائج کا مجموعی تصور بالکل ہی مختلف ہوگا، جس کا اثر نظریہ و اعتقاد پر ہی نہیں۔ طریق کار اور عملی سرگرمیوں



پر بھی پڑے گا۔

اسلام کو بجا طور پر اس کا حق ہے کہ وہ خود پہل کرے اور جہاد کے لیے خود حرکت میں آئے۔ اس لیے کہ وہ کسی خاص قوم کا دین یا کسی مخصوص وطن کا نظام نہیں، وہ تو خدا کا دستور اور سارے عالم کا نظام ہے۔ اس کو پورا حق ہے کہ خود آگے بڑھ کر ان نظاموں اور انسانی طریقوں کی دیواریں منہدم کر دے جو "انسان" کو آزادی انتخاب کا حق دینے کے لیے تیار نہیں، اس کے لیے بس اتنی بات کافی ہے کہ وہ افراد کے مفاد میں محاذ نہیں قائم کرتا کہ انہیں اپنا عقیدہ اپنانے پر مجبور کرے۔ وہ نظام و قوانین سے برسرِ جنگ ہوتا ہے تاکہ ان شکنجوں سے افراد کو آزاد کر لے جو فطرت کے دشمن اور حریت کے رہزن ہیں۔

اسلام بجا طور پر یہ حق رکھتا ہے کہ "انسانوں" کو مخلوق کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی میں داخل کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ تاکہ اس کی طرف سے خدا کی آقائی اور سارے انسانوں کی حریت و آزادی کا جو اعلان ہے، اس کو عملی شکل دے سکے۔ اور یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ تنہا اللہ کی بندگی صحیح معنوں میں نظامِ الہی کے ہی سایہ میں ممکن ہے، خواہ اس بندگی کا تعلق تصور و اعتقاد سے ہو، یا حرکت و عمل سے۔ کیونکہ تنہا یہی ایسا نظام ہے جس میں اللہ تعالیٰ ہی سارے بندوں کے لیے قانون بناتا ہے۔ حاکم کے لیے بھی، محکوم کے لیے بھی، کالے کے لیے بھی، گورے کے لیے بھی، دور کے لیے بھی، نزدیک کے لیے بھی، فقیر کے لیے بھی، غنی کے لیے بھی۔ ایک ہی قانون جس کے سامنے یکساں طور پر سب کی گردنیں جھکتی ہیں۔ رہے بقیہ دوسرے نظام، تو ان میں بندگی انسان کی ہوتی ہے، کیونکہ وہاں قانون سازی کی کرسی پر انسان ہوتے ہیں۔ جب کہ یہ کرسی الوہیت کا نشان اور تنہا اللہ کا مقام ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُسے انسانوں کے لیے خود قانون بنانے کا حق ہے، تو وہ عملاً الوہیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ خواہ زبان سے اس کا اعلان کیے یا نہ کرے۔ اور اگر کوئی اس شخص

کے لیے یہ حق تسلیم کرتا ہے تو وہ گویا اس کے عقیدہ اور الوہیت ہونے کا اعتراف کر رہا ہے۔ خواہ وہ اسے الوہیت کا نام دے یا نہ دے!

اسلام محض عقیدہ نہیں، کہ عقیدہ اسلامی کی زبانی تبلیغ پر ہی اکتفا کر لے۔ وہ تو ایک دستور اور ایک نظام ہے، جو ایک تنظیم کی صورت میں سارے انسانوں کی آزادی کے لیے ماریج کرتا ہے۔ دوسری تنظیمیں یہ سمجھتی نہیں کہ ارہ کر سکتیں کہ اسلام ان کی رعایا کی زندگیوں کو اپنے دستور و نظام کے سانچوں میں ڈھالے۔ بس یہیں سے اسلام کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان سارے نظاموں کو ختم کرے جو آزادی عام کی راہ کا روٹا ہیں۔ یہی مفہوم ہے مکمل طور پر اطاعت خدا کے لیے ہونے کا، جیسا کہ ہم پہلے بھی کہ چکے ہیں۔ چنانچہ یہاں اصلاً کسی بھی بندے کی اطاعت و حکمرانی نہ ہوگی، جیسا کہ ان نظاموں میں ہوتا ہے جن کی بنیاد بندگی رب نہیں ہوتی۔

ہمعصر اسلامی محققین، جو موجودہ ماحول اور موجودہ معاشرے کے دباؤ سے متاثر، اور مستشرقین کے شاطرانہ حملوں سے مرعوبیت کا شکار ہیں، وہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ کیونکہ مستشرقین نے اسلام کی تصویر کچھ اس انداز سے پیش کی ہے گویا وہ تلوار کے زور سے عقیدہ قبول کرانے کی تحریک ہے۔ یہ بدباطن مستشرقین اچھی طرح جانتے ہیں کہ اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ لیکن وہ جہاں اسلامی کے اسباب و علل کو اس انداز سے گھناؤنی شکل دینا چاہتے ہیں اور یہیں سے نیک نامی اسلام کے مرعوب و شکست خوردہ پاسباں اس تہمت کو دھونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ ایسے ایسے دفاعی اسباب کا سراغ لگانے پر مجبور ہوتے ہیں جن کا اسلام کے مزاج اور اس کے نصب العین سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ حالانکہ اسلام کو اس قسم کی مدافعت کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تو روزافز سے ہی "آزادی انسان" کی منادی کرتے اور آزادی کی یہ تحریک چلانے کا فطری طور پر حق رکھتا ہے۔

ہمعصر مرعوب ————— محققین کے افکار و ضمیر پر "دین" کا مغربی تصور

بری طرح چھا گیا ہے۔۔۔ یہ تخیل ذہن کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکا ہے کہ  
دین تو محض قلب سے تعلق رکھنے والا ایک "عقیدہ" ہے۔ زندگی کے عملی نظاموں  
سے اسے کیا سروکار۔۔۔ نہیں سے دین کے لیے جہاد کرنا دراصل ضمیر پر عقیدے  
کو بالبحر مسلط کرنے کے ہم معنی ہوگا!

لیکن اسلام میں صحیح صورت حال کچھ اور ہے۔ اسلام ایک خدائی نظام ہے  
ایسا نظام، جو صرف حاکمیت الہ کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور وہ پوری انسانی زندگی  
کی تنظیم کرتا اور تمام مسائل زندگی سے بحث کرتا ہے۔ زندگی کا کوئی ایک گوشہ بھی  
اس کے دائرے سے خارج نہیں رہتا! لہذا اسلام کے لیے جہاد دراصل اس  
نظام کے قیام، اور اس دستور کے نفاذ کے لیے جہاد ہوگا۔ رہا عقیدہ، تو وہ  
سارے ماویٰ حجابات اٹھا دینے کے بعد انسان کے ارادہ و انتخاب اور  
اطمینانِ قلب پر موقوف ہوگا۔ یہیں سے بنیادی طور پر معاملے کی نوعیت بدل جاتی  
ہے۔ اور ایک بالکل ہی نئی دل پذیر شکل سامنے آجاتی ہے۔

جہاں کہیں بھی کوئی ایسی اسلامی تنظیم پائی جائے، جو خدائی نظام کا نمونہ اور  
اس کی عملی تصویر ہو، اسے خدا کی طرف سے اقتدار کو ہاتھ میں لینے اور اس  
نظام کے قیام کے لیے حرکت میں آنے کا پورا حق حاصل ہوگا۔ لیکن عقیدہ، جو  
ایک وجدانی چیز ہے آزادری وجدان پر ہی چھوڑ دیا جائے گا۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو اگر ایک مدت تک جہاد سے روکے  
رکھا تو اس کا تعلق اصول سے نہیں۔ طریق کار سے تھا۔ مسئلہ عقیدہ سے نہیں،  
تحریکی تقاضوں سے تھا۔

اگر یہ واضح اور روشن بنیاد سامنے رہے تو سمجھ و شعور نہیں کہ ہم مختلف اوقات  
اور مختلف ادوار میں نازل ہونے والی قرآنی آیات کو سمجھ سکیں۔ اور تحریک اسلامی  
کی طویل اور مستقل سرگرمیوں سے متعلق ان کی جو ہنگامی ہدایات تھیں، انھیں اصولی  
ہدایات سے گڈ مڈ نہ ہوتے دیں۔

# لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

## ایک نظام زندگی

عقیدہ اسلام کا پہلا ستون ہے تنہا اللہ کی بندگی۔ اور اس بندگی کی کیفیات و تفصیلات صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی جائیں یہ ہے اس کا دوسرا ستون۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ کی شہادت و راصل اسی عہد کا اعلان اور اسی عزم کا اظہار ہے۔

مسلم و مومن شخص وہی ہے، جس کے دل میں یہ عقیدہ اپنے ان دونوں اجزاء کے ساتھ راسخ ہو۔ کیونکہ جتنے بھی اسلامی ارکان اور ایمانی بنیادیں ہیں وہ حقیقت میں انہی کا لازمی تقاضا ہیں۔ فرشتوں پر ایمان، آسمانی کتابوں پر ایمان، اللہ کے رسولوں

پر ایمان، اچھی اور بری تقدیروں پر ایمان اور روزِ آخرت پر ایمان، اسی طرح نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، پھر حدود و تعزیرات، حلت و حرمت، احکام و معاملات اور بقیہ دوسری اسلامی ہدایات۔۔۔ ان سب کی بنیاد ہے۔ تنہا اللہ کی بندگی

اور ان تمام کا سرچشمہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی۔

اسلامی معاشرہ وہ معاشرہ ہے جو اس عقیدے کا عملی پیکر اور اس کے تمام تقاضوں کی سچی تصویر ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی اسلامی معاشرہ نہیں ہو سکتا۔

یہیں سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ کی گواہی اس دستورِ کامل کی اساس

قرار پاتی ہے، جس پر امت مسلمہ کی زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی۔ گویا اس زندگی کا

وجود اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک یہ بنیاد نہ پائی جائے، نہ کوئی زندگی

اسلامی زندگی ہو سکتی ہے جب تک وہ اس کے علاوہ کسی اور بنیاد پر قائم ہو یا

اسی کے ساتھ ساتھ ایک یا متعدد ایسی بنیادیں بھی موجود ہوں جو اس کے لیے بالکل نامانوس اور اجنبی ہوں۔

اقتدار تو بس اللہ کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی صحیح اور

سیدھا دین ہے۔ جس نے رسول کا حکم مانا حقیقت میں اُس نے اللہ کا حکم مانا۔

إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ - أَمْرٌ إِلَّا  
تَعْدُوهُ إِلَّا آيَاتُ ذَلِكَ  
الَّذِينَ أَنْقَمَ رِيسْف. هِيَ  
مَنْ يَطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ  
اللَّهَ - ر. النساء - ۸۰

اس مختصر اور دو ٹوک فرمان الہی سے دین کی حقیقت اور اس کی عملی سرگرمیوں سے متعلق متعین طور پر کچھ بنیادی باتیں سامنے آتی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

- (۱) مسلم معاشرے کا مزاج
  - (۲) مسلم معاشرے کے نشوونما و ارتقاء کا اندازہ
  - (۳) جاہلی معیاریوں کے مقابلے میں اسلام کا موقف
  - (۴) زندگی کی موجودہ صورت حال کے سلسلے میں اسلام کا طرز عمل
- یہ ساری باتیں بالکل قطعی انداز میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اور یہ وہ بنیادی باتیں ہیں جو تحریک اسلامی کے طریق کار کے سلسلہ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلے بھی رکھتی تھیں، اور آج بھی رکھتی ہیں۔

سب سے پہلی چیز جو ”مسلم معاشرے“ کے مزاج کو ممتاز کرتی ہے وہ ہے اس کی عبودیت۔ کہ اس کے سارے معاملات میں تنہا عبودیت الہی کی شان نمایاں ہوگی: لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ کی گواہی ہم سے اسی عبودیت کا مطالبہ کرتی ہے۔

تصورات کی دنیا ہو، عبادت کی محفل ہو یا قوانین کی بارگاہ ہو، ہر جگہ اسی عبودیت کی نکلتیں اور اسی کی تجلیاں ہوں۔

چنانچہ وہ خدا کے واحد کا بندہ نہیں، جس کا دل خدا کی وحدانیت پر مطمئن رہے:

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا لِلْهَدْيِ  
اِثْنَيْنِ اِثْمًا هُوَ الْكُفْرُ وَاحِدٌ  
فَاَيُّهَا فَارِ هَبُونِ. وَلَكِنَّمَا  
فِي السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ مِنْ وَاٰلِهٍ  
الَّذِيْنَ وَاٰصِبًا اَفْخِرَ اللَّهُ  
تَتَّقُوْنَ ۚ - (النحل ۵۱ - ۵۲)

اور اللہ نے کہا ہے: دو دو الہ نہ  
بناؤ۔ وہ تو بس اکیلا الہ ہے۔ اس  
لیے مجھ سے ہی ڈرو۔ جو کچھ آسمانوں اور  
زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ اطاعت  
اسی کا حق ہے ہمیشہ۔ پھر کیا اللہ کے علاوہ  
کسی اور سے ڈرو گے؟

وہ بھی خدائے واحد کا بندہ نہیں جو عبادت کے نذرانے بغیر اللہ کے قدموں

پر ڈالتا ہو۔ خواہ اس میں اللہ تعالیٰ شریک ہو یا نہ ہو۔

قُلْ اِنْ صَلَوَتِيْ وَنَسْكَى وَمَحْيَاىِ  
وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا  
شَرِيْكَ لَهٗ وَبِنِ اٰلِهَةٍ اَمْرَتٍ  
وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

کہو: میری نماز، اور میری قربانی، میرا جینا  
اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے،  
جو سارے جہان کا رب ہے۔ اس کا کوئی  
شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم ہے اور میں  
سب سے پہلا مسلم ہوں۔

(الانعام ۱۶۲ - ۱۶۳)

اور وہ بھی خدائے واحد کا بندہ نہیں جو زندگی کے نظام اور زندگی کے قوانین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی خدائی ہدایات سے حاصل کرنے کے بجائے

غیر اللہ کے دروں پر دستک دیتا ہو۔

اَمْ لَكُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا  
لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَأْتِكُمْ

کیا ان لوگوں کے پاس کچھ شرکاء ہیں جنہوں  
نے ان کے لیے کوئی ایسا دین مقرر کر دیا ہے  
جس کا اذن اللہ نے نہیں دیا۔؟

بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ (الشوریٰ ۲۱)

اور رسول تمہیں جو کچھ دے اُسے لے

وَمَا اَنْتُمْ بِالرُّسُوْلِ فَاخَذُوْهُ  
وَمَا نَهَكُمُّ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

لو اور جس سے روک دے اس سے

رُكَّ جَاؤْ۔

(الحشر ۷۷)

یہ ہے مسلم معاشرہ۔ وہ معاشرہ جس کے تصورِ اعتقادی میں بھی تنہا بندگیِ رب

کی شان نمایاں ہوگی۔ شعائر و عبادات میں بھی اسی شانِ عبودیت کی جھلک ہوگی اور اجتماعی نظام اور اجتماعی قوانین و احکام میں بھی اسی کی بوٹے جاں نواز ہوگی، کیونکہ ان گوشوں میں سے کوئی ایک گوشہ بھی غائب ہو تو خود اسلام کا بھی وجود باقی نہ رہے گا کہ اس کے رکنِ اول ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“ کی شہادت کا ہی وجود نہ رہا۔

ابھی اوپر ہم کہہ آئے ہیں کہ: عبودیت الہی کی جھلک ”تصورِ اعتقاد ہی“ میں بھی ہوگی۔ اب یہاں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ اسلام کا تصورِ اعتقاد ہی ہے کیا ہے یہ ایک تصور ہے جو انسان کے ذہن میں ابھرتا ہے جب وہ براہِ راست سرچشمہٴ بانی یعنی کتابِ الہی سے فیضیاب ہوتا اور عقیدے کی حقیقتیں رگ و پے میں جذب کر لیتا ہے پھر یہی تصور ہے جس کی رہنمائی میں وہ معرفتِ الہی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ یہی تصور ہے جس کے آئینہ میں وہ کائنات کا مشاہدہ کرتا اور اس کے خفی و جلی حقائق کا سراغ لگاتا ہے۔ یہی تصور ہے جس کی روشنی میں وہ زندہ گی کے اسرار و رموز پر غور کرتا اور اس کی ظاہر و مخفی حقیقتیں دریافت کرتا ہے۔ اور یہی وہ چراغ ہے جسے لے کر وہ عرفانِ نفس و عرفانِ ذات کی وادی میں قدم رکھتا ہے پھر اسی تصور کی روشنی میں وہ تمام چیزوں کے ساتھ اپنے موقف کی تعمیر کرتا ہے۔ خدا کی جناب میں وہ ایسا موقف اختیار کرتا ہے جس میں عبودیت و بندگی کی شان نمایاں ہو۔ انسان، حیوان، کائنات، اور طبعی قوانین کے سلسلے میں وہ ایسا طرزِ اختیار کرتا ہے جو دینِ الہی کے ان اصولوں کی روشنی میں ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں، تاکہ یہاں پر بھی خالص عبودیتِ الہی کی جلوہ طرازی ہو۔ اس طرح یہ تصورِ مسلم معاشرے کی پوری زندگی اور زندگی کی ساری سرگرمیوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جب یہ بات طے ہوگئی کہ یہی ”مسلم معاشرہ“ ہے، تو اس معاشرے کی تعمیر کیسے ہو؟ اس تعمیر کا انداز کیا ہو؟

اس قسم کا معاشرہ اُس وقت تک تعمیر نہیں ہو سکتا جب تک انسانوں کی ایک

ایسی جماعت وجود میں آجائے۔ جو یہ فیصلہ کر لے کہ اس کی مکمل بندگی صرف خدا کے لیے ہوگی غیر اللہ کی بندگی کے وہ قریب نہ پھٹکے گی۔ نہ اس کے اعتقاد و تصویر میں غیر اللہ کی بندگی ہوگی، نہ عبادات و شعائر میں اس کی کوئی جھلک ہوگی۔ اور نہ دستور و نظام اور آئین و قوانین میں اس کی کوئی مہک ہوگی۔ پھر وہ اسی خالص بندگی کی اساس پر عملاً پوری زندگی کی تعمیر کرے۔ دل و دماغ کو غیر اللہ کے عقیدہ الوہیت سے پاک کرے عبادات کو غیر اللہ کے آستانوں کی ہوا نہ لگنے دے۔ اور آئین و قوانین کے لیے اس کے ذہن میں غیر اللہ کا تصور نہ آئے۔ بھول کر بھی نہ آئے۔

اس وقت۔۔۔ ہاں صرف اس وقت یہ جماعت "مسلم جماعت" ہوگی، اور اس کے ہاتھوں تعمیر ہونے والا یہ معاشرہ مسلم معاشرہ ہوگا۔ لیکن اگر معاشرے کے یہ افراد عبادات میں یہ اخلاص پیدا کرنے کا فیصلہ نہ کریں، تو وہ مسلمان نہ ہوں گے۔ اس اساس پر اپنی زندگیوں کی تعمیر کرنے سے پہلے ان کا معاشرہ مسلم معاشرہ نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ پہلی اینٹ جس پر اسلام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، اور وہ پہلا پتھر جس پر مسلم معاشرے کا قلعہ تعمیر ہوتا ہے، یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت، اس کے دونوں ہی اجزاء ناپید ہیں۔ اسلام کا اجتماعی نظام قائم کرنے اور ایک مسلم معاشرے کی داغ بیل ڈالنے کا خیال ذہن میں لانے سے پہلے ناگزیر ہے کہ تمام تر توجہ دلوں کو غیر اللہ کی عبودیت سے پاک کرنے پر صرف ہو پھر وہ افراد جن کے دل غیر اللہ کی عبودیت سے پاک ہو جائیں، وہ ایک مسلم جماعت کی شکل میں منظم ہوں۔ کیونکہ جو جماعت ہر پہلو سے غیر اللہ کی عبودیت سے پاک ہوگی، اسی جماعت سے مسلم معاشرے کا وجود ہوگا جن افراد کے دل بادۂ توحید سے سرشار، جن کی عبادتیں اخلاص و لہیت کی آئینہ دار اور جن کی زندگیاں شاہ شریعت کی تابع ہوں گی، وہی افراد مسلم معاشرے کے ستون ہوں گے پھر جو شخص اس معاشرے میں ضم ہونا



چاہے گا اور اسلامی عقائد و عبادات کو ماننے اور اس شریعت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوگا جو فی الواقع عقیدہ لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ کی عملی تعبیر ہے، وہ اگر اس میں شامل ہو جائے گا۔

وہ پہلی مسلم جماعت، جس نے پہلے معاشرے کی تعمیر کی تھی اس کا نشو و ارتقا اسی انداز پر ہوا تھا، اور اسی انداز پر ہر مسلم جماعت کا نشو و ارتقا ہو سکتا ہے نیز کسی مسلم معاشرے کے قیام کی بھی یہی شکل ہے۔

مسلم معاشرہ بس اسی طرح وجود میں آ سکتا ہے کہ کچھ افراد یا چند جماعتیں غیر اللہ کی عبودیت سے نکل کر خدا کے واحد کی عبودیت میں آجائیں اور وہ یہ فیصلہ کر لیں کہ ان کے نظام زندگی کی بنیاد یہی عبودیت ہوگی۔ یہی وہ ساعت ہوگی جب اس نئے معاشرے کی نئی زندگی کی تکمیل ہوگی۔ یہ نیا معاشرہ اگرچہ جاہلی معاشرے کے ہی بطن سے نمودار ہوگا، مگر ایک نئے عقیدے اور ایک نئے نظام کے ساتھ اس سے آنکھیں ملائے گا۔ وہ نظام عقیدے کی ہی بنیادوں پر قائم اور اسلام کے رکن اول، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی ہی عملی شکل ہوگا۔

ممکن ہے اس وقت پورا جاہلی معاشرہ نئے اسلامی معاشرے میں آکر شامل ہو جائے۔ اور یہ بھی خدشہ ہے کہ صورت حال اس کے برعکس ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ وہ نئے مسلم معاشرے سے صلح کر لے، اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ آمادہ پیکار و برسرِ جنگ ہو جائے، اگرچہ دستور یہی رہا ہے کہ جاہلی معاشرہ پورے طنطنہ کے ساتھ میدان میں اترتا ہے، اور کسی رورِ عایت سے کام لیے بغیر پیہم دھماکے لگاتا ہے نشوونما کے زمانے میں اس معاشرے کے ہر اول و سول پر بھی لگاتا ہے، اور عملاً قائم ہو چکنے کے بعد خود اس معاشرے پر بھی نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک بلا استثناء ہر زمانے میں تاریخ دعوتِ اسلامی کا یہی سحر یہ رہا ہے۔

قدرتی طور پر اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ نیا مسلم معاشرہ اس وقت تک پروان نہیں چڑھ سکتا، اور صحیح معنوں میں وقت تک اس کا چراغ نہیں جل سکتا، جب تک وہ اتنی قوت نہ فراہم کرے جس سے قدیم جاہلی معاشرے کا مقابلہ کر سکے۔ تصوری اور اعتقادی قوت بھی، اخلاقی، اور روحانی قوت بھی، تنظیمی اور اجتماعی قوت بھی۔ غرض وہ ساری قوتیں جن سے وہ جاہلی معاشرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکے۔ اس پر غالب آسکے، یا کم از کم مقابلے میں پوری پامردی اور ثابت قدمی سے ڈٹا رہ سکے۔

لیکن "جاہلی معاشرہ" ہے کیا؟ اور اس کے سلسلے میں اسلام کا موقف کیا ہوگا؟

ہر وہ معاشرہ جاہلی معاشرہ ہے، جو مسلم معاشرہ نہ ہو! اگر ہم اور زیادہ جامع و مانع تعریف کرنا چاہیں تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں — ہر وہ معاشرہ جس کی بندگی کا قبلہ و کعبہ تنہا اللہ تعالیٰ نہ ہو۔ جس کے عقائد و تصورات میں اسی کا جلوہ نہ ہو۔ جس کی عبادتیں اور نیاز مندیاں اسی کے لیے خاص نہ ہوں، اور جس کے قوانین و احکام اسی کی بارگاہ قدس سے ماخوذ نہ ہوں، وہ جاہلی معاشرہ ہے۔

اس جامع و مانع تعریف سے "جاہلی معاشرے" کی صف میں وہ سارے معاشرے آجائیں گے جو اس وقت روئے زمین پر موجود ہیں!!

اس میں اشتراک معاشرے بھی آجائیں گے — کیونکہ خدا کے سلسلہ

میں ان کا رویہ ملحدانہ ہے۔ وہ سرے سے اس کے وجود کے ہی منکر ہیں۔ وہ

اس کائنات کی مؤثر طاقت یا اصل علت "مادے" یا "فطرت" اور

کو قرار دیتے ہیں۔ وہ انسانی زندگی اور انسانی تاریخ کا خالق و محرک "معاش" یا

"یا" ذرائع پیداوار کو ٹھہراتے ہیں۔ ثانیاً وہ ایک ایسے نظام کے بانی ہیں

جس میں بندگی پارٹی کی ہوتی ہے — کیونکہ اس نظام میں اجتماعی قیادت

ہی اصل حقیقت ہے! — خدا کی قیادت کوئی پیہر ہی نہیں! اب پھر

اس نظام و تصور کے نتیجے میں جو "انسانی خصوصیات کا جنازہ اٹھ جاتا ہے وہ الگ ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی "بنیادی ضرورتیں" وہی ہیں جو حیوان کی ہیں۔ کھانا، پانی، پیڑا، گھرا اور جنسی تسکین! پھر وہ "انسانی" روح جو اسے حیوان سے ممتاز کرتی ہے اس کی ضروریات سے وہ یکسر محروم ہو جاتا ہے۔ خدا کا عقیدہ اسے اپنانے کا حق اور اس کے اعلان کی مکمل آزادی جو انسانی روح کی سب سے اوّلین اور بنیادی ضرورت ہے۔ اس سے سلب ہو جاتی ہے اسی طرح انسان کی نمایاں ترین خصوصیت اس کی "الفرادیت پسندی" ہے۔ یہی چیز ہے جو شخصی ملکیت کے پردے میں نظر آتی ہے۔ اور یہی وہ بجلی ہے جو کسی فن کا انتخاب کرنے، اس میں امتیاز حاصل کرنے اور اپنی شخصیت کو ابھارنے اور نکھارنے کے لیے بیتاب رکھتی ہے۔ انسان کی یہ نمایاں ترین خصوصیت بھی اس معاشرے میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح وہ ساری خصوصیات جو "انسان" کو "حیوان" یا "مشین" سے ممتاز کرتی ہیں، وہ سب سبک سبک کر دم توڑ دیتی ہیں۔ کیونکہ اشتراکی تصور ہو یا اشتراکی نظام، دونوں ہی بسا اوقات انسان کو حیوان کے بھی مرتبے سے اتار کر مشین کے مرتبے میں لاکھڑا کرتے ہیں!

اس جاہلیت کی صف میں صنم پرست معاشرے بھی شامل ہیں۔ جو اب تک ہندوستان، جاپان، فلپائن اور افریقہ میں موجود ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے تصور و اعتقاد کی بنیاد غیر اللہ کی الوہیت کو قرار دیتے ہیں۔ خواہ اس الوہیت میں اللہ تعالیٰ شریک ہو یا نہ ہو۔ ثانیاً، وہ مذہبی عبادت و رسوم کے نذرانے بھی عملاً ان بہت سے دیوتاؤں اور معبودوں کے آستانوں پر لے جاتے ہیں، جن کی الوہیت کے وہ قائل ہوتے۔ نیز ایسے نظاموں اور اصول و نظریات کے وہ علمبردار ہیں، جن کا سرچشمہ غیر اللہ اور ان کی شریعت ہے۔ معاملہ کی نوعیت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ نظام اور یہ اصول و نظریات مجاوروں، کاہنوں، پر وہتوں، جادوگروں اور پنڈتوں سے حاصل

کیے جائیں یا ان متمدن "سیکولر" اداروں سے جو شریعت الہی کی طرف رخ کیے بغیر  
حق قانون سازی کے مالک ہوں۔ دوسرے لفظوں میں "قوم" یا "پارٹی" یا  
یا کسی ہستی کے نام سے خود اقتدار اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوں۔ حالانکہ  
اقتدار اعلیٰ تو صرف اللہ کا حق ہے، اور اس کا نفاذ بس اسی طرح ممکن ہے جس طرح  
اس کے رسولوں نے بتایا ہے۔

اس جاہلیت کی صف میں دنیا کے سارے یہودی اور عیسائی معاشرے بھی  
داخل ہیں۔ اولاً: اپنے ان بگڑے ہوئے عقائد کی وجہ سے جن کی رو سے  
الوہیت صرف اللہ کے لیے خاص نہیں رہ جاتی۔ اس کے بہت سے شرکاء پیدا  
ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ شکر کسی بھی صورت میں ہو۔ تثلیث کی صورت میں ہو یا کسی  
کو اس کا بیٹا قرار دیکر ہو، غلط اور گمراہ تصورات کے نتیجے میں ہو، یا مخلوق کا اس کے  
ساتھ اس قسم کا رشتہ جوڑ کر ہو، جس کا حقیقت اور واقعیت سے کوئی تعلق نہ ہو:

یہودیوں نے کہا، عزیز اللہ کا بیٹا ہے اور

نصاریوں نے کہا: مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ

ان کی خود ساختہ اور من گھڑت باتیں ہیں

یہ بالکل ویسی ہی باتیں کہتے ہیں جیسی ان

لوگوں نے کہیں جو ان سے پہلے کفر میں

پڑ چکے ہیں اللہ انہیں ہلاک کرے " یہ

کہاں بھٹکے جا رہے ہیں؟

بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا:

"اللہ تین کا تیسرا ہے" حالانکہ الہ واحد

کے سوا کوئی الہ نہیں۔ جو کچھ یہ کہتے ہیں اگر

اس سے باز نہ آئے تو ان کافروں کو دردناک

عذاب چھٹ کر رہے گا۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ

اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ

ابْنُ اللَّهِ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ

يَافُوَاهُمْ يَفْصَاهُونَ قَوْلِ

الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَاتِلْهُمْ

اللَّهُ طَائِفًا لِيُؤْفَكُوْنَ ؟ ..

التوبة - ۳۰

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ

اللَّهَ ثَلَاثَةٌ وَمَا مِنْ

إِلَهِ إِلَّا إِلَهُ وَاحِدٌ وَإِنْ

لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ

الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابُ

اَلَيْكُمْ - (المائدہ ۷۳)  
 وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ  
 غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلَعِنُوا إِلَٰهًا  
 قَالُوا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ  
 يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ..

(المائدہ ۶۲۴)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصْرَىٰ:  
 نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاءُ لَهُ قُلْ:  
 فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ  
 أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّثْلَ خَلْقٍ :

(المائدہ ۱۸)

اور یہود کہتے ہیں: اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا  
 ہے۔ انہی کے ہاتھ باندھے جائیں لعنت ہو  
 ان پر، اس طرح کی جگو اس کرنے پر۔ اس کے  
 تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جس طرح  
 چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

یہود و نصاریٰ کہتے ہیں: "ہم اللہ کے  
 بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں" کہو: تو پھر  
 وہ تم کو تمہارے گناہوں پر سزا کیوں دیتا  
 ہے؟ (نہیں) تم بھی انسان ہی ہو جس  
 طرح اور انسان ہیں۔

ایک چیز اور بھی ہے جو انہیں جاہلی معاشروں کی صف میں لاکھڑا کرتی ہے  
 وہ ایسے مذہبی مراسم کے پابند اور ایسے رسوم و رواج میں گرفتار ہیں۔ جو سرتاسر گمراہ  
 تصورات اور باطل عقائد کا کرشمہ ہیں۔ ان کے وہ نظام اور اصول و نظریات  
 بھی انہیں جاہلیت کی صف میں لاکھڑا کرتے ہیں جو جہاں توحید و نور بندگی سے یکسر  
 خالی ہیں۔ یہ حق حاکمیت خدا کے لیے تسلیم نہیں کرتے، نہ اس کی شریعت کو آخری  
 اتھارٹی سمجھتے ہیں، بلکہ انہوں نے انسانوں پر مشتمل ایسے ادارے قائم کر رکھے ہیں  
 جو نا جائز طور پر اس حاکمیت اعلیٰ کے منصب پر براجمان ہیں، ورنہ اس منصب کا  
 تو تھا حق دار اللہ ہے۔ زمانہ قدیم میں جب کہ نزول قرآن کا سلسلہ جاری تھا، اللہ  
 نے ان پر شرک و کفر کی فریادیں جاری کی تھی، کیونکہ انہوں نے اجبار و رہبان کے لیے  
 یہ حق تسلیم کر لیا تھا۔ وہ چاہتے قانون بناتے اور یہ ان کے خود ساختہ قوانین بے چون و  
 چرا تسلیم کر لیتے:

انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے اجبار و رہبان

أَتَّخَذُوا أَحْبَابًا مِّمَّنْ دُونِ اللَّهِ

کو رب بنا لیا۔ اور مسیح ابن مریم کو بھی

حالات انہیں اس کے سوا اور

کوئی حکم نہ دیا گیا تھا کہ الہ واحد کے سوا وہ

کسی اور کی عبادت نہ کریں۔ اس کے سوا

اور کوئی الہ نہیں۔ اس کی شان و عظمت کے

منافی ہے، وہ شرک جو یہ کہتے ہیں۔

أَسْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ

وَالْمَسِيحِ ابْنِ مَرْيَمَ

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا

وَاحِدًا، لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ، سُبْحٰنَهُ

عَمَّا يُشْرِكُونَ۔

(التوبہ: ۳۱)

یاد رہے وہ لوگ اجبار و زہبان کے الہ یا معبود ہونے کا عقیدہ کبھی نہیں

رکھتے تھے، نہ ان کے آستانوں پر نہ ہی عبادات کے نذرانے پیش کرتے تھے،

وہ فقط ان کے لیے حق حاکمیت کے قائل تھے، وہ اجبار و زہبان خدا کی طرف

سے قانون سازی کے منصب پر مامور نہ تھے، پھر بھی وہ اپنے دل سے قانون

بناتے، اور یہ آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیتے اب اگر اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں

مشرک و کافر کے لفظ سے موسوم کیا تو پھر ان موجودہ یہود و نصاریٰ کے مشرک و کافر

ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے جبکہ آج انہوں نے یہی حق قانون سازی کا حق

ان لوگوں کو دے رکھا ہے جو اجبار و زہبان بھی نہیں، انہی جیسے حیوان ہیں۔

آخر میں جاہلی معاشروں کی صف میں وہ سارے معاشرے بھی آجاہیں

گے، جو آج اپنے "مسلم" ہونے کے مدعی ہیں۔!

یہ معاشرے اس صف میں اس لیے نہیں کھڑے ہیں کہ وہ غیر اللہ کے

الہ و معبود ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں یا ان کی عبادات کا قبلہ غیر اللہ ہیں۔ وہ

اس صف میں صرف اس لیے نظر آتے ہیں کہ اپنے نظام حیات میں وہ تنہا

اللہ کی بندگی اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں، اس طرح وہ گرچہ غیر اللہ

کی الوہیت کا عقیدہ نہیں رکھتے، مگر الوہیت کا مخصوص ترین حق غیر اللہ کے

حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ غیر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرتے اور اپنے نظاموں،

قدروں، پیمانوں، قوانین و احکام، عادات و اخلاق۔۔۔ غرض کے سارے

امور کے لیے اسی حاکمیت کے در پر دستک دیتے ہیں!۔

حالانکہ حکام کے سلسلہ میں خدائے تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ  
اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ  
(المائدہ ۴۴)

اور جو لوگ اس کے مطابق فیصلہ نہ کریں  
جو اللہ نے اتارا ہے، تو ایسے ہی لوگ  
کافر ہیں۔

اور عام لوگوں کے سلسلہ میں بھی یہ ارشاد الہی موجود ہے:-

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ  
أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْنَا  
وَمَا أَنْزَلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ  
أَنْ يَتَّخِذُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَ  
قَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ...  
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى  
يُحْكَمُوا بِمَا فِي نَفْسِهِمْ خَرَجُوا  
مِمَّا قَضَيْتَ وَيَسْمَعُوا تَسْلِيمًا...

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ  
کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں جو تمہاری  
طرف اتارا گیا ہے اور جو تم سے پہلے اتارا گیا  
ہے چاہتے ہیں کہ فیصلے کرانے کے لیے  
طاغوت کے پاس جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا  
ہے کہ وہ اس کا انکار کریں سو نہیں تمہارے  
رب کی قسم یہ ایمان والے نہیں ہو سکتے جب  
ہم اپنے درمیان کٹھننے والے جھگڑے میں تم  
فیصلہ نہ کر ائیں۔ پھر جو فیصلہ تم کر دو، اس پر  
اپنے دل میں کوئی کھٹک نہ پائیں اور پورے  
طور پر پتے آپ کو حوالہ کر دیں۔

ر انشاء ۶۰ - ۶۵

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے یہود و نصاریٰ کو شرک و کفر، عبادت الہی سے  
گریز اور اجبار پرستی و رہبان پرستی کا ملزم قرار دیا، جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں  
نے اجبار و رہبان کو وہ حیثیت دے رکھی تھی، جو آج در مسلم، عوام اپنے کچھ  
افراد کو دے دیتے ہیں! اور اس کو اللہ تعالیٰ نے بالکل اسی درجہ کا شرک قرار  
دیا جس درجے کا شرک عیسیٰ بن مریم کو رب بنا کر ان کی الوہیت کے گن گانے اور  
ان کی عبادت کرنے کو۔ جس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ کسی کے لیے

حاکمیت اور قانون سازی کا حق تسلیم کرنا بالکل اسی طرح خدا سے بغاوت  
حق سے عداوت اور بندگی الہی سے خروج ہے، جس طرح کسی کی الوہیت و  
ربوبیت کے گن گانا۔ ظاہر ہے اس کے بعد کوئی شخص ایک لمحہ کے لیے بھی  
دین الہی میں باقی نہیں رہ سکتا۔

ان نام نہاد مسلم معاشروں میں سے بعض معاشرے تو ڈنکے کی چوٹ پر  
اپنی بالادہیت کا اعلان کرتے ہیں اور بعض اعلان تو کرتے ہیں کہ ان کے  
دل میں دین کا احترام ہے، لیکن اجتماعی نظام سے اسے بے دخل کر دیتے  
ہیں، کہتے ہیں کہ ہم "غیب" کے قائل نہیں۔ ہمارے نظام کی بنیاد "علم"  
پر ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک علم، غیب کا نقیض ہے! حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک  
ایسا جاہلانہ استدلال ہے، جو جاہلوں ہی کی زبان سے ادا ہو سکتا ہے اور بعض  
ایسے بھی ہیں جو عملاً حاکمیت کے منصب پر تو غیر اللہ کو لا بٹھاتے ہیں اور وہ خود جو  
چاہتے ہیں، "قانون" گڑھتے ہیں۔ پھر خود ساختہ قانون اور اپنی طبعزاد شریعت  
کے سلسلے میں دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کا قانون اور اللہ کی شریعت ہے۔!  
واقعہ یہ ہے کہ یہ سبھی معاشرے اس حیثیت سے بالکل یکساں ہیں کہ ان کی  
بنیاد تنہا بندگی رب پر نہیں۔

جب یہ بات طے ہو گئی تو سارے جاہلی معاشروں کے سلسلہ میں اسلام کا  
موقف بالکل دو ٹوک انداز میں سامنے آجاتا ہے کہ وہ ان معاشروں کی اسلام پسندی  
اور شریعت نوازی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اسلام ان معاشروں کے بلکے نہیں دیکھتا۔ ان کی سرخیاں اور سائن بورڈ  
نہیں دیکھتا ان کے لیبل اور ان کے ٹائٹل نہیں دیکھتا۔ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ  
ایک ہی چیز ان سب میں مشترک ہے۔ یہ سب خدا سے دور ہیں۔  
ان سب کی زندگیوں کی بنیاد خدا سے واحد کی کامل بندگی پر نہیں۔ اور یہیں سے  
یہ نام نہاد مسلم معاشرے بقیہ دوسرے معاشروں سے "جاہلیت" کی صفت میں



آکر مل جاتے ہیں۔

مسلم معاشرے کے مزاج اور اس کی بنیادی خصوصیت کے سلسلہ میں پیچھے ہم جو یہ عرض کر آئے ہیں کہ اس کے سارے معاملات کی بنیاد تنہا عبودیت الہی ہوگی، اس سے آخری حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ اور اس سوال کا جواب خود بخود بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ موجودہ انسانی زندگی کے سلسلہ میں اسلام کا کیا موقف اور کیا طریق کار ہوگا؟ آج کیا موقف ہوگا؟ کل کیا موقف ہوگا؟ اور ہمیشہ کیا موقف رہے گا؟

اس مزاج کی تعین فیصد کن انداز میں ہمیں بتاتی ہے کہ وہ کون سا نقطہ ہوگا جس کے گرد انسانی زندگی گردش کرے گی؟ وہ کونسی بنیاد ہوگی جس پر اس کی عمارت کھڑی ہوگی؟ کیا وہ دین الہی اور خدائی نظام زندگی ہوگا؟ یا انسانی عرف اور سماجی نظام ہوگا خواہ کوئی بھی ہو اور کیسا بھی ہو؟

اسلام ایک لمحہ بھی پس و پیش یا توقف کیے بغیر بالکل دو ٹوک انداز میں کہتا ہے کہ وہ بنیاد جس کی طرف ساری انسانی زندگی کو پلٹنا ہوگا وہ دین الہی اور خدائی نظام زندگی ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ کی شہادت جو اسلام کا رکن اول ہے اس وقت تک معتبر نہ ہوگی جب تک یہ بنیاد نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق خدائے واحد کی کامل بندگی اس وقت تک نہ پائی جائے گی جب تک یہ بنیاد بغیر کسی توقف اور پس و پیش کے عملاً تسلیم کر لی جائے۔

رسول تمہیں جو کچھ دے اُسے لے لو جس چیز سے روک دے اس سے رُک جاؤ۔

وَمَا أَنْتُمْ بِالرَّسُولِ فَخُذُوا  
وَمَا نَهَكُمُ عَنْهُ فَأَنْتَهُوا۔

(الحشر، ۷)

اسلام پوچھتا ہے:

تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟

أَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ؟



اس فرد کو ہرگز نہ ہوگا جو اللہ کے نام پر اقتدار کا دعویٰ کرنا چاہے، جیسا کہ ”تھیوا کرسی“ یا ”مقدس اسٹیٹ“ کے نام سے یورپ میں کبھی ایسا ہوا، کہ اس کو اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی اس بات کا مجاز نہیں کہ وہ اللہ کی مرضی کی ترجمانی کرے۔ انتہائی واضح طور پر ایسے نصوص موجود ہیں جو شریعت الہی کے حدود مقرر کر دیتے ہیں۔

«الدین للواقع» دین زندگی کے حسب حال ہے، کا مفہوم سمجھنے میں لوگ بری طرح ٹھوکر مائل کھاتے ہیں۔ اسی طرح اس کا استعمال بھی بے محل ہوتا ہے۔ بلاشبہ دین زندگی کے حسب حال ہے لیکن کس زندگی کے!

اس سے مراد وہ زندگی ہے جسے خود یہ دین اپنے ان اصولوں کے مطابق تشکیل دے جو فطرت انسانی پر پوری طرح منطبق ہوتے اور انسان کی تمام ہی حقیقی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ البتہ ان ضروریات کی تعین بھی خود وہ ذات کرے گی جو خالق ہے اور مخلوقات کا پورا علم رکھتی ہے:

یسا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا، جبکہ وہ بہت

أَلَّا يَعْلَمَ مَنْ خَلَقَ، وَهُوَ اللَّطِيفُ

ہی ہا ایکس میں اور خبر رکھنے والا ہے۔

الْحَكِيمُ (الملك ۱)

دین کی یہ کوشش کبھی نہیں ہوتی کہ خواہ کسی بھی طرز کی زندگی ہو، اسے وہ جوں کی توں برقرار رکھے، یا اس کے نیسے سبب جو تلاش کرے، اور کسی حکم شرعی کا سراغ لگا کر اس کے چہرے پر مستعار سائن بورڈ کی طرح آویزاں کر دے! وہ تو انسانی زندگی کی طرف اس ارادے سے بڑھتا ہے کہ اسے اپنی میزان میں تولے، جو چیزیں برقرار رکھنے کی ہیں، انہیں برقرار رکھے۔ جو چیزیں روکنے کی ہیں، انہیں روک کر دے۔ اور اگر وہ زندگی بالکل ہی پسند نہ آئے تو اسے منہدم کر کے ایک دوسری زندگی تعمیر کرے اور جو زندگی وہ تعمیر کرے گا، حقیقت میں وہی زندگی ہوگی اسلام ”حقیقت پسند“ دین ہے، یا ”اسلام زندگی کے حسب حال ہے“ اس کا مفہوم بس یہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ تو کیا تمہارا یہ فرض نہیں کہ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کرو!

ہو سکتا ہے اس موقع پر سوال کیا جائے :  
 ”کیا یہ فرض نہیں کہ انسانی زندگی مصلحت انسانی کے سانچے میں ڈھالی جائے؟“  
 ہم پھر اس سوال کی طرف پلٹتے ہیں، جسے اسلام خود اٹھاتا اور خود ہی اس کا جواب  
 دیتا ہے:

— وَأَنْتُمْ أَغْلَمُ أَمِ اللَّهُ ؟  
 — وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ  
 ”تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟“  
 ”اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے!“

مصلحت انسانی تو خود شریعت الہی میں مضمر ہے۔ اس شریعت میں جو خود  
 اللہ نے بھیجی اور رسول خدا نے ہم تک پہنچائی ہے۔ لہذا اگر کسی روز انسان  
 کو یہ احساس ہو کہ اس کی مصلحت شریعت الہی کی خلاف ورزی میں ہے تو اولاً تو  
 وہ اپنے اس احساس میں ”واہمہ کاشکار ہوگا“:

ان يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا  
 تَهْوَى الْأَنْفُسُ ط وَقَدْ جَاءَ  
 هُمْ مِنْ رَبِّهِمْ الْهُدَىٰ أَمْ  
 لِلْإِنْسَانِ مَا تَمَنَّى ؟ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ  
 وَالْأُولَىٰ ...  
 یہ لوگ تو زری شکل پر، اور جو جی چاہتا ہے  
 اس پر چل رہے ہیں، جبکہ ان کے پاس  
 ان کے رب کی طرف سے ہدایت آ  
 چکی ہے کہیں آدمی کو ملتا ہے جو چاہے ہے  
 تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے کچھلا بھی، اور

پہلا بھی۔

ذ النجم ۲۲ - ۲۵

ثانیاً: ”وہ کافر ہوگا“ — ظاہر ہے جس شخص کا یہ گمان ہو کہ مصلحت اس میں  
 ہے جو وہ سمجھتا ہے، خواہ وہ شریعت الہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔  
 کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس دین میں باقی اور دین داروں کے زمرے  
 میں شامل رہ سکے!

## کائناتی شریعت

تم جو یہ دیکھتے ہو کہ اسلام فکر و عمل کی دنیا میں اپنے عقائد کی عمارت خالص عبودیت و بندگی رب کی اساس پر قائم کرتا ہے، اور یکساں طور پر عقیدہ، عبادت شریعت تمام ہی چیزوں سے اسی نور بندگی کی شعائیں بھوٹی اور اسی نکرت عبودیت کی جلیں اٹھتی ہیں۔ کیونکہ لا الہ الا اللہ کی شہادت کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہتا، اگر زندگی کے تمام معاملات میں خدائے واحد کی خالص و کامل بندگی نہ ہو۔ اسی طرح محمد رسول اللہ کی عملی شہادت بھی اسی وقت ممکن ہے جبکہ اس عبودیت و بندگی کی کیفیات آپ ہی کی بارگاہ قدس سے حاصل کی جائیں۔

بلاشبہ اسلام جس وقت اپنی پوری عمارت اس اساس پر چلتا ہے اور لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ کی شہادت اسلامی نظام حیات کی نمائندگی کرتی، اور اس نظام کے خدوخال کو نمایاں اور اس کی خصوصیات کو اجاگر کرتی ہے۔ بلاشبہ اسلام جس وقت اپنا قصر اس بے مثال انداز سے تعمیر کرتا ہے، اس بے مثال طرز سے تعمیر کرتا ہے جو اسے ان تمام دوسرے نظاموں سے ممتاز کر دیتا ہے، جن سے انسانیت اب تک آشنا ہو سکی ہے، اس وقت وہ ایک ایسے ضابطہ سے وابستہ ہوتا ہے جو نہ صرف انسان بلکہ پورے عالم اور ساری کائنات کا ضابطہ ہے۔ وہ ایک ایسے نظام سے ہم آہنگ ہوتا ہے جو نہ صرف انسانی زندگی، بلکہ پورے باغ و بستان کا نظام ہے:

تصورِ اسلامی کی بنیاد یہ ہے کہ یہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اس کی مشیت ہوئی اور یہ وجود میں آگئی۔ نیز اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایسے قوانین

اور ایسے ضابطے مقرر کر دیے ہیں جن پر وہ سختی سے کاربند اور ہر آن ان کی پابند ہے۔ ان قوانین سے جہاں اس کی مجموعی حرکت اور مجموعی نظام میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہیں اس کے اجزاء کے درمیان بھی کامل ہم آہنگی کی نشان نمایاں ہوتی ہے:

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ  
أَنْ نَقُولَ لَهُ: كُنْ فَيَكُونُ۔

کسی چیز کا جب ہم ارادہ کرتے ہیں تو اس سے  
بس ہمارا یہ کہنا ہوتا ہے، ہو جا پس وہ ہو  
جاتی ہے۔

د النحل ۲۰

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدْ أَسَاكَ لَقَدْ يُدْرِكُ

اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ پھر اس کا ٹھیک  
ٹھیک اندازہ ٹھہرایا۔

د الفرقان

اس کائنات کے پرے میں ایک ذہن ہے جو اس کا انتظام کرتا ہے ایک  
غیبی ہاتھ ہے جو اسے حرکت میں لاتا ہے، ایک ضابطہ ہے جو اسے منظم رکھتا  
ہے یہ ضابطہ اس کائنات کے اجزاء میں ہم آہنگی پیدا کرتا، اور انہیں ایک  
نظم کا پابند رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ ٹکراتے نہیں، اور ہم پر ہم نہیں ہوتے اور ایک منظم  
انداز میں مسلسل حرکت کرتے رہتے ہیں، اس طرح یہ پوری کائنات اس ذہن،  
اس غیبی قوت اور اس ضابطے کے آگے سرنگندہ اور پوری طرح اس کی پابند  
ہے۔ مجال نہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے سرتابی کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ  
پورے سکون کے ساتھ روال دوال ہے نہ اس میں کوئی بگاڑ پیدا ہوتا ہے  
نہ اختلال۔ بگاڑ اور اختلال بس اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب خدا کی مشیت

ہو۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ  
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ  
أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ،  
يَغْشَى اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ  
حَيْثُ وَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ

حقیقت میں تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں  
اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر تخت  
حکمرانی پر متمکن ہو گیا، وہ رات پر دن کو اڑھاتا  
ہے، جو تیزی سے اس کا تعاقب کر رہا ہے،  
اور سورج اور چاند اور تاروں کو اس طرح پیدا

مُسَخَّرَاتٍ مَّ بِأَمْرِهِ إِلَّا لَهُ الْخَلْقُ  
وَالْأَمْرُ، تَبَارَكَ اللَّهُ  
رَبُّ الْعَالَمِينَ . . . . .

کیا کہ وہ اس کے حکم سے کام میں لگے ہوئے  
میں۔ جان لو! اسی نے پیدا کیا ہے، اور  
اسی کا حکم چل رہا ہے۔ اللہ ساری دنیا

د الاعراف نم ۵۷

کارب بڑی برکت والا ہے۔

انسان اسی کائنات کا جزو ہے اور اس کی فطرت پر انہی قوانین کی حکمرانی ہے  
جن کی اس پوری کائنات پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اسی طرح پیدا کیا  
جس طرح اس کائنات کو پیدا کیا۔ اور اس کی مادی صورت گہری اسی زمین کی  
مٹی سے ہوئی۔ پھر خدائے سے جو نمایاں خصوصیات مرحمت کیں، وہ بھی ایک  
خاص انداز میں دیں۔ نیز وہ جسمانی اعتبار سے بھی اس خاص قانون فطرت کا پابند  
ہے، جو خدائے اس کے لیے طے کر دیا ہے، خواہ وہ اسے پسند ہو یا ناپسند۔  
اس کو شروع میں جو زندگی ملتی ہے وہ مشیتِ الہی سے ملتی ہے، جس میں اس کے  
یا اس کے والدین کے ارادہ، خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا، کیونکہ وہ دونوں باہم  
ملتے ہیں لیکن اس کا جنین حاصل کر لینے یا دوسرے لفظوں میں ایک قطرہ ناچیز  
تو ایک عظیم انسانی وجود میں تبدیل کر دینے کی قدرت نہیں رکھتے۔ وہ اسی اصول  
کے تحت پیدا ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حمل و ولادت کے سلسلہ میں مقرر کر دیا ہے۔  
اسی ہوا میں سانس لیتا ہے جو خدائے اسی کے لحاظ سے بنائی ہے۔ اور اسی  
طرح اور اتنی ہی لیتا ہے، جتنی وہ چاہتا ہے۔ وہ قانون الہی کے تحت ہی  
آرام و تکلیف کا احساس کرتا اور بھوکا اور پیاسا ہوتا، اور کھاتا اور پیتا ہے۔ مختصر  
یہ کہ پوری زندگی گزارتا ہے اس کا کہ کوئی ارادہ ہوتا ہے، نہ اختیار۔ مشیتِ الہی،  
فیصلہ الہی اور قانون الہی کے تابع ہونے میں اس کا بالکل وہی حال ہے، جو  
کائنات اور اشیاء کائنات کا ہے۔

جس ہستی نے یہ کائنات بنائی، اس میں انسان کو بسا یا پھر اسے انہی قوانین  
کا پابند بنایا، جن کا پابند اس کائنات کو۔ اسی ہستی نے ایک "شریعت" ،

بھی بنائی ہے، تاکہ وہ انسان کی ارادی زندگی کو اس طرح منظم رکھے کہ طبیعی زندگی یا غیر ارادی زندگی سے اس کا تصادم نہ ہو گویا شریعت الہی اس عالمگیر ضابطہ الہی کا ایک جزو ہے جو انسان کی فطرت اور ساری کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے۔ اور ان تمام کو باہم منظم اور ہم آہنگ کیے ہوئے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ہر فرمان خواہ وہ امر ہو یا نہی، وعدہ ہو یا وعید، قانون ہو یا موعظت، اسی عالمگیر ضابطہ الہی کا ایک جزو ہے۔ اور اس کے اندر وہی صداقت ہے جو ان قوانین میں ہے جنہیں ہم قوانین فطرت یا الہی اور تکوینی قوانین کہتے ہیں۔ جو ازل سے ہی اپنے اندر ٹھوس صداقت رکھتے ہیں، اور فیصلہ الہی کے مطابق ہر لمحہ ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کو منضبط اور منظم کرنے کے لیے جو "شریعت" بنائی ہے، یہیں سے وہ ایک کائناتی شریعت ہے۔ کیونکہ وہ عالمگیر نظام فطرت سے مربوط اور کائنات کے مرکزی قانون سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اور اس طرح اس کی پابندی بھی ضروری قرار پاتی ہے تاکہ انسان کی زندگی اور جس کائنات میں وہ رہتا ہے اس کے نظام میں کامل توافق و ہم آہنگی پیدا ہو سکے نیز اس کی پوشیدہ فطرت اور خارجی شخصیت پر حکمرانی کرنے والے قوانین کے اندر بھی مکمل ہم آہنگی کی شان نمایاں ہو سکے اور کہیں سے بھی ان دونوں کے درمیان کسی قسم کے تصادم یا بے ربطی و نااتفاقی کا ظہور نہ ہو۔

انسان کے بس میں یہ نہیں کہ وہ تمام قوانین فطرت کو دریافت کر سکے۔ یا عالمگیر ضابطہ الہی یا قانون الہی کے سارے گوشوں اور پہلوؤں کو جان سکے۔ حتیٰ کہ وہ قانون الہی بھی اس کے دائرہ علم و فہم سے باہر ہے جو خود اس کی فطرت پر حکمرانی کر رہا ہے اور اس کی پسند ناپسند کا لحاظ کیے بغیر اس کو اپنا تابع و محکوم بنائے ہوئے ہے۔ اس طرح اس کے بس میں یہ بھی نہیں کہ وہ کوئی ایسا نظام تیار کر سکے جس سے انسانی زندگی اور کائناتی نظام میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے، یا اس کی پوشیدہ فطرت اور ظاہری



شخصیت میں ہی ایک جہتی قائم ہو سکے۔ یہ کام تو بس وہی ہستی کر سکتی ہے جو ساری کائنات کی بھی خالق ہے اور سارے انسانوں کی بھی، اور جو اپنے ایک ہی مقررہ ضابطے یا پسندیدہ نظام کے تحت ساری کائنات کا بھی انتظام کرتی ہے اور نوع انسانی کے تمام معاملات کا بھی۔

اس طرح شریعت الہی کی پابندی ناگزیر ہو جاتی ہے، تاکہ اس کائنات میں کامل ہم آہنگی اور ہمہ گیر یک جہتی پیدا ہو سکے۔ جبکہ اعتقادی طور پر اسلام کا وجود بھی اسی پر منحصر ہے۔ کیونکہ اسلام کا صحیح معنوں میں وجود اس وقت تک ممکن ہی نہیں، نہ افراد کی زندگیوں میں ممکن ہے نہ جماعت کی زندگی میں، جب تک خدا کی بندگی میں کامل اخلاص نہ ہو، پھر یہ عبودیت و بندگی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں کی روشنی میں نہ ہو، کیونکہ اس کے بغیر اسلام کے رکن اول: "الَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ" کی شہادت کا مفہوم ہی ناقص رہ جاتا ہے۔

انسانی زندگی اور کائناتی نظام کے درمیان کامل ہم آہنگی ہی فلاح انسانیت کی کلید ہے، زندگی کو تباہی و بربادی سے محفوظ رکھنے کی یہی واحد تدبیر ہے۔ انسان بس اسی حالت میں اپنی فطرت کے ساتھ صلح و آشتی کی زندگی گزار سکتا ہے۔ کائنات کے ساتھ صلح اس وقت رہ سکتی ہے جب انسان کائنات کے نظام سے ہم آہنگ ہو۔ اور دونوں کی منزل اور سمت سفر ایک ہو۔ اور فطرت کے ساتھ صلح اس وقت رہ سکتی ہے جب انسانی سرگرمیاں فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہوں ان دونوں میں آویزش اور کشمکش نہ ہو۔ شریعت الہی عملی زندگی اور پوشیدہ فطرت میں بسہولت ہم آہنگی پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس ہم آہنگی سے ایک دوسری ہم آہنگی جنم لیتی ہے جسے ہم عام انسانی تعلقات کی ہم آہنگی سے تعبیر کر سکتے ہیں، یعنی تمام انسانی تعلقات میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی اور عام انسانی سرگرمیوں میں ایک ہی روح کار فرما ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت سارے انسان اسی ایک نہج پر گامزن ہوتے ہیں جس پر یہ پوری کائنات گامزن ہے۔ وہ اسی ایک نظام

سے وابستہ ہوتے ہیں، جو اس کائنات کے عمومی نظام یا مرکزی قانون کا ہی ایک جزو ہے۔

اس طرح انسانیت کے لیے فلاح کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ وہ صحیح راہ پر لگ جاتی ہے۔ اور بسہولت اس کائنات کے بھیدوں، اس کی مخفی قوتوں، اور اس کی تہ میں مدفون خزانوں سے باخبر ہو جاتی ہے۔ پھر ان تمام کو شریعت الہی کے مطابق بغیر کسی کشمکش اور باہمی نزاع کے، عالمگیر فلاح انسانی کی راہ میں استعمال کرتی ہے۔

ایک طرف شریعت الہی ہے جس کی یہ رحمتیں اور سعادتیں ہیں دوسری طرف نفسانیت اور ہوا و ہوس ہے جس کی تباہیوں اور ہلاکت سامانیوں کی طرف قرآن یوں اشارے کرتا ہے:

اور اگر کہیں حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا

وَلَوْ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ

تو آسمانوں اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ

سب کی حالت دگرگوں ہوتی۔

(المؤمنون ۷۱)

اس طرح دین اسلام حق کو ایک اکائی قرار دیتا ہے۔ ایک ہی حق ہے جو اس دین

کی روح ہے۔ اور وہی اصل کائنات کی بھی روح ہے۔ اسی پر زمین و آسمان کا نظام قائم ہے۔ دنیا و آخرت کی صلاح و بہتری اسی سے وابستہ ہے اسی کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ باہر پہن کرے گا اور جو اس کے حدود توڑے گا اسے سزا دے گا۔ گویا حق ایک

وحدت ہے، جس میں تعدد نہیں، یا حق ایک اکائی ہے جس میں دوئی نہیں۔ اور یہ وہی عالمگیر خدائی نظام ہے جس پر اللہ تعالیٰ اس وجود کو ہر آن دیکھتا چاہتا ہے اور جس کے آگے اس عالم ہستی کے سارے جاندار و غیر جاندار سرنگوں میں:

ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری ہے

لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ

جس میں تمہارے لیے ذکر ہے تو کیا تم سمجھتے نہیں

ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ! وَ كَمْ

کتنی بیٹیوں کو جو ظالم تھیں، ہم نے پیس کر

قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً

رکھ دیا۔ اور ان کے بعد دوسری کسی قوم کو

وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ،

فَلَمَّا أَحْسَبُوا أَنَّنَا إِذَا أَهْلُمُ مِنْهَا  
يَرْكُضُونَ، لَا تَرْكُضُوا وَأَرْضُ جُجُوا  
إِلَى مَا أَتَرَفْتُمْ فِيهِ وَمَسَلِكِكُمْ  
لَعَلَّكُمْ تَسْئَلُونَ - قَالُوا:  
يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ! فَسَاءَ  
نَزَاتُ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ مِمَّا جَعَلْنَاهُمْ  
حَصِيدًا أَخَامِدِينَ وَمَا خَلَقْنَا  
السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا  
لِعِبَادِينَ. بَلْ أَسْرَدْنَا أَنْ تَتَّخِذَ  
لَهُوًّا إِلَّا تَخَذُ نَاهُ مِنْ لَدُنَّا  
إِنْ كُنَّا فَاعِلِينَ.. بَلْ نَقْذِفُ  
بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ  
فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ، وَكَلَّمَ الْوَيْلُ  
مِمَّا تَصِفُونَ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ  
وَالْأَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا  
يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ  
وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ يُسَبِّحُونَ  
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ

۵ ۴ ۳ ۲ ۱

(الانبیاء ۱۰ - ۲۰)

اٹھایا، پھر جب انہوں نے ہمارے عذاب کی  
آہٹ پائی تو گے وہاں سے بھاگنے! بھاگو  
نہیں، لوٹ چلو، جہاں تمہیں عیش و  
آرام ملا تھا، اور اپنے گھروں کو، تاکہ تم سے  
پوچھا جائے، کہنے لگے: افسوس ہم پر، بلاشبہ  
ہم ظالم تھے۔ پھر مستقل ان کی یہی پکار رہی  
یہاں تک کہ ہم نے انہیں ایسا کر دیا جیسے  
کٹی کھیتی اور بچھا ہوا انگارہ، ہم نے اس  
آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے  
درمیان ہے کھیل کرنے کو نہیں بنایا ہے۔  
اگر ہم کوئی بازیچہ بنا نا چاہتے تو اسے اپنے  
پاس سے بنا لیتے۔ اگر ہمیں ایسا کرنا ہوتا  
بلکہ ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں۔ تو  
وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے پھر دیکھتے دیکھتے  
وہ مٹ جاتا ہے۔ اور جو کچھ تم سمجھتے ہو اس کی  
بتا ہی ہے تمہارے لیے آسمانوں اور زمین  
میں جو کوئی ہے اسی کا ہے اور جو اس کے  
پاس ہیں وہ نہ تو غور میں آکر اس کی عبادت  
سے روگردانی کرتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔  
رات و دن تسبیح کرتے ہیں رکتے نہیں۔

فطرت انسانی اس حق کو اپنی گہرائیوں میں محسوس کرتی ہے۔ انسان کے  
گرد و پیش پھیلی ہوئی دنیا اور خود انسان کا ضمیر اس کا ہاتھ پکڑ کر بتا رہا ہے کہ اس  
وجود کی بنیاد حق پر ہے۔ حق ہی اس کی روح اور حق ہی اس کی اساس ہے۔ خدا

کا بنایا ہوا ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام ہے جس پر وہ پوری مضبوطی سے قائم ہے ناس میں کوئی خلل پیدا ہوتا ہے نہ انتشار، نہ بیاروں کی گردش میں کوئی فرق آتا ہے۔ نہ ان بیاروں میں کبھی تصادم ہوتا ہے۔ یہ زبردست کارخانہ حکمت کسی اتفاقی حادثے یا بے سوچے سمجھے ارادے کے تحت نہیں چل رہا ہے نہ کسی ہوا و ہوس یا نفسانیت کی یہاں کار فرمائی ہے۔ بلکہ یہ پورا عالم انتہائی دقیق اور منظم و محکم نظام کا پابند ہو کر رواں دواں ہے۔ یہیں سے انسان اور اس کی فطرت کے درمیان سب سے پہلے اس وقت ناچاتی و نا اتفاقی کا بیج پڑتا ہے، جب وہ نفسانی خواہشات کے چکر میں آکر فطرت کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے حق سے انحراف کرتا اور شریعتِ الہی کو چھوڑ کر ہوا و نفسانیت کی رہنمائی میں زندگی کے لیے خود کوئی نظام بناتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور پورے طور پر سرنگندہ نہیں ہوتا، جب کہ یہ سارا عالم وجود اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے آگے سرنگندہ ہے!

پھر جہاں یہ کشمکش اور یہ ناسازگاری آدمی اور اس کی فطرت اور نظام کائنات کے درمیان رونما ہوتی ہے، وہیں یہ انسانی افراد، انسانی جماعتوں اور تمام قوموں اور نسلوں کو بھی اپنی پیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس طرح کائنات کی قوتیں، اس کے مادی ذخیرے اور بیش بہا خزانے انسانیت کے لیے رحمت نہیں، وبال بن جاتے ہیں۔ یہ اس کے لیے ترقی و سعادت کی راہیں نہیں کھولتے، بلکہ اسے ہلاکت و بربادی کی جہنم میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہ پوری زمین جو امن و شافقتی کا ایک پرسکون گہوارہ بن سکتی تھی، ایک نہایت بھیانک رزم گاہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوا زمین پر شریعتِ الہی کے قیام کی آخری غایت بس آخرت کی تیاری نہیں کہ آخرت تو دنیا کا ہی طبعی نتیجہ یا اسی کا ایک حصہ ہے۔ یہ دونوں زندگی کے دو ایسے مرحلے ہیں جو ایک دوسرے سے مل کر ہی ایک کامل وجود بنتے ہیں اور جب تک شریعتِ الہی کی پیروی نہ ہو، ان دونوں میں سازگاری ممکن نہیں۔ یہ

شریعت ہی ہے انسانی زندگی میں ان دونوں مرحلوں کے درمیان سازگاری پیدا کرتی اور پھر پوری زندگی کو عالم گیر خدائی نظام یا دوسرے لفظوں میں — کائنات کے مرکزی قانون سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔

عالم گیر خدائی نظام کے ساتھ ہم آہنگی کے نتیجے میں ملنے والی سعادت ہے انسان آخرت کا انتظار نہیں کراتی۔ وہ تو دنیوی زندگی میں ہی ظاہر ہونی شروع ہو جاتی ہے! گرچہ تکمیل اس کی آخرت میں ہوگی۔

یہ ہے کائنات اور انسان کے سلسلہ میں اسلام کا بنیادی تصور۔ یہ وہ تصور ہے جو اپنے مزاج کے اعتبار سے ان تمام تصورات و نظریات سے جو ہر ہی اختلاف رکھتا ہے جو آج کی دنیا میں رائج ہیں یا کبھی رائج رہ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بنیاد پر وہ پابندیاں اور وہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو کسی بھی دوسرے نظریہ و نظام کی بنیاد پر نہیں عائد ہوتیں۔

اسلام کی نگاہ میں انسانی زندگی اور کائناتی نظام میں نہایت گہرا ربط ہے جو تکوینی اور الٰہی قوانین اس کائنات پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ہماری فطرت بھی انہی قوانین کی تابع ہے۔ اس طرح خود ہماری فطرت ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ہماری عام زندگی بھی انہی قوانین کی پابند ہو۔ اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے، جب کہ شریعت الٰہی کی پابندی کی جائے، کہ اسی سے وہ حقیقی اور کامل عبودیت ظہور پذیر ہو سکتی ہے جس کا مظاہرہ اس پوری کائنات کی طرف سے ہو رہا ہے اور اس شان سے ہو رہا ہے کہ کوئی انسان آج تک سایہ دعویٰ نہ کر سکا کہ یہ کائنات اس کی بندگی کر رہی ہے۔

نظام کائنات کے ساتھ سازگاری اور یہ ہم آہنگی انسانی زندگی کے لیے کس قدر ناگزیر ہے، اس کی طرف اس گفتگو سے بھی اشارہ ہوتا ہے۔ جو ابراہیم علیہ السلام اور نمرود جابر کے درمیان ہوئی تھی وہ زمین میں بندوں پر تو حاکمیت کا مدعی تھا۔ مگر چاند، سورج اور دوسرے ستاروں سیاروں پر ناکمیت کا دعویٰ نہ کر سکا۔ اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اس کائنات میں جو اقتدار کا مالک ہے

انسانی زندگی پر بھی اسی کا اقتدار چلنا چاہیے تو وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس دلیل کے بعد اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

کیا تم نے اسے نہیں دیکھا جس نے ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں حجت کی۔ کیونکہ اللہ نے اسے سلطنت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا: میرا رب وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے اس نے کہا: میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا: اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال دے۔ اس پر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔ اللہ ظالموں کو زاد نہیں دکھایا کرتا۔

أَلَمْ تَدِ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ — أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ — إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحِیْ وَیُمِیْتُ — قَالَ: أَنَا أُحِیْ وَأُمِیْتُ! قَالَ إِبْرَاهِيمُ: فَإِنَّ اللَّهَ یَأْتِی بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ — فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ وَاللَّهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظَّالِمِیْنَ —

د البقرہ ۲۲۸

سچ فرمایا خدا نے برتر نے؛

أَفَغَيْرِ دِينِ اللَّهِ یَبْغُونَ ، وَ لَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ طَوْعًا وَ كَرْهًا وَ إِلَیْهِ یُرْجَعُونَ —

د آل عمران ۷۸

کیا یہ دین الہی کے علاوہ کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی بنے بخوشی یا بالجبر اسی کے آگے سرنگوں ہے۔ اور انھیں اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

# اسلام ہی تہذیب ہے

اسلام بس دو ہی معاشروں سے واقف ہے — اسلامی معاشرہ یا جاہلی معاشرہ۔

”اسلامی معاشرہ“ ہر وہ معاشرہ ہے جس پر اسلام کی کلی اور ہمہ جہتی حکمرانی ہو۔ عقائد اسلامی ہوں، عبادات اسلامی ہوں، قانون اسلامی ہوں، نظام اسلامی ہوں، اخلاق اسلامی ہوں، معاشرت اسلامی ہو غرض ہر جگہ اسی کا جلوہ اور اسی کا غلبہ ہو۔ اس کے برعکس ہر وہ معاشرہ، جہاں اسلام کی حکمرانی نہ ہو، عقائد و تصورات غیر اسلامی ہوں، نظام و قوانین غیر اسلامی ہوں، اخلاق و معاشرت غیر اسلامی ہو۔ قد یہیں اور ترک و اختیار کے بیچانے غیر اسلامی ہوں، ایسا معاشرہ بلاشبہ ایک ”جاہلی معاشرہ“ ہے۔

اسلامی معاشرہ ہر وہ معاشرہ نہیں، جو اپنے کو ”مسلمان“ کہنے والے کچھ افراد کی بھیڑ جمع کر لے۔ جس طرح شریعت اسلامی ہر وہ قانون نہیں، جو اس معاشرے میں نافذ ہو، اگرچہ معاشرہ نمازیں بھی پڑھتا ہو، روزے بھی رکھتا ہو، اور بیت اللہ کا حج بھی کرتا ہو! معاشرہ اسلامی وہ معاشرہ بھی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اسلام کے علاوہ خود کوئی اسلام تراش لے، اور اس کا نام رکھے ”ترقی پسند“ اسلام یا اسی جیسا کوئی اور نام۔

”جاہلی معاشرہ“ کی مختلف شکلیں ہوا کرتی ہیں، جو سب کی سب جاہلی ہیں۔ کبھی وہ ایک ایسے معاشرے کی شکل میں ہوتا ہے جو وجودِ الہی کا منکر ہوتا ہے

اور تاریخ کی بالکل مادی اور جدلیاتی انداز کی تشریح کرتا ہے، اور "سائٹیفک سوشلزم" نامی چیز کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے قائم و نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اور کبھی وہ ایک ایسے معاشرے کی شکل میں سامنے آتا ہے، جو وجودِ الہی کا تو منکر نہیں ہوتا، البتہ اس کے لیے وہ صرف آسمانی بادشاہت کا قائل ہوتا ہے، اس زمین پر وہ اس کی عملداری اور حاکمیت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ شریعتِ الہی کو بحیثیت ایک نظام زندگی نہیں اپناتا۔ اور اس کی ان قدروں کو حکم نہیں بناتا جن کو خدا نے انسانی زندگی کے لیے دائمی اور اٹل قدیم قرار دی ہیں۔ وہ لوگوں کو اس کی اجازت تو دیتا ہے کہ مسجدوں اور کلیساؤں میں خدا کو پوجیں، لیکن اس کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ وہ اس سے اپنی زندگیوں میں شریعتِ الہی کو حکم بنائے یا اپنے معاملات میں اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا مطالبہ کریں۔ اس طرح وہ زمین پر الوہیتِ الہی کا منکر ہوتا ہے یا عملاً اُسے معطل کیے رہتا ہے۔ جبکہ صراحت کے ساتھ یہ فرمانِ الہی موجود ہے:

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌُ وَ  
فِي الْأَرْضِ إِلَهٌُ (الزخرف ۴۲)

وہی آسمان میں الہ ہے، اور وہی زمین میں بھی الہ ہے۔

اس طرح ایسے معاشرہ کا اس دینِ الہی سے کوئی تعلق نہیں رہتا جس کی جامع و مانع تعریف اس فرمانِ الہی سے ہوتی ہے:

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاتُهُ . . . ذَلِكَ  
الَّذِينَ اتَّخَذُوا  
اقتدار تو بس اللہ کا ہے۔ اُس نے حکم دیا ہے  
کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی صحیح  
اور سیدھا دین ہے۔ (یوسف ۲۲)

اور اس طرح وہ جاہلی معاشرہ قرار پائے گا، اگرچہ خدا سے، وجود کو وہ تسلیم کرتا ہو، اور مسجدوں، کلیساؤں میں اس کی عبادت و بندگی کے مراسم داکر نے کی کھلی آزادی دیتا ہو۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "اسلامی معاشرہ" جو اپنے اندر مذکورہ وصف



رکھتا ہوا، تنہا وہی "متمدن" اور "تہذیب یافتہ" معاشرہ ہے، اور جاہلی معاشرے خواہ کسی بھی شکل میں ہوں، پس ماندہ اور تہذیب و تمدن سے نا آشنا معاشرے میں! یہ ایک نہایت اہم حقیقت ہے، جس کی وضاحت ضروری ہے۔

ہم نے ایک بار اپنی ایک زیر طبع کتاب کا اشتہار دیا تھا، جس کا نام تھا: "متمدن اسلامی معاشرے کی طرف"۔ پھر دوبارہ اشتہار دیا تو لفظ "متمدن" حذف کر دیا، اور کتاب کا نام رکھا "اسلامی معاشرے کی طرف" کیونکہ کتاب کا موضوع بحث بھی یہی تھا۔

یہ ترمیم ایک جزا اثری اہل قلم کی نگاہ میں کھٹک گئی۔ انھوں نے اس کی توجیہ یہ کی کہ یہ اسلام کی طرف سے "داخلی جذبہ دفاع" کا نتیجہ ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اظہارِ افسوس بھی کیا کہ "یہ نامعقول" ذہنیت ہمیں مسئلہ کی اصل حقیقت تک نہ پہنچنے دے گی۔

میں اس صاحبِ قلم کو معذور سمجھتا ہوں کہ پہلے میری بھی یہی حالت تھی پہلی بار جب میں نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کا ارادہ کیا تھا۔ تو میں بھی بالکل اسی انداز پر سوچتا تھا، جس انداز پر آج وہ سوچ رہا ہے اور میرے لیے بھی وہی مسئلہ پریشان کن بنا ہوا تھا جو آج اس کے لیے بنا ہوا ہے یعنی "تہذیب و تمدن" کی تعریف کا مسئلہ!

ابھی میری عقل و روح مغربی تہذیب اور مغربی ثقافت کے اثرات سے آزاد نہ ہو سکی تھی۔ یہ اثرات جو مغربی لٹریچر اور مغربی افکار کی پیداوار ہوتے، اگرچہ میرے مزاجِ اسلامی کے لیے بالکل ہی نئے اور نامانوس ہوتے۔ کیونکہ اس وقت بھی اسلام کے سلسلہ میں میرا ذہن صاف تھا۔

مے بطور بالا سے جزا اثری اہل قلم کی خلش شاید واضح نہیں ہو سکی۔ ہمارے خیال میں اس جزا اثری کا تعلق اس طبقہ و نکر سے رہا ہو گا جس کا خیال ہے کہ اسلام محض ایک عقیدہ و مذہب ہے، جسے تہذیب و تمدن سے کوئی واسطہ نہیں اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اس کے رُخ پر دوسری تہذیبوں کا غازہ ملا جائے اور دیگر ترقی پسند اور متمدن نظریات کی روشنی میں اسے تہذیب و تمدن کی بلندیوں پر پہنچایا جائے اس کے برعکس مصنف کے نزدیک اسلام ہی دہاتی اگلے

لیکن اس کے باوجود مغربی اثرات فکر و تصور کو تاریک کر دیتے اور اسلامی طرز فکر کی کوئی جھلک نہ نظر آتی! "تہذیب و تمدن" کا یورپی تصور ذہن میں آتا اور فکر و تصور کو اس طرح دھندلا اور غبار آلود کر دیتا کہ تہذیب کی اصل حقیقت تک ذہن کا پہنچنا ممکن نہ رہ جاتا۔

پھر اصل حقیقت سب سے نقاب ہو گئی۔ یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ اسلام ہی اصل تہذیب اور مسلم "معاشرہ ہی" "متہدین" معاشرہ ہے۔ لہذا "متہدین" کا لفظ بے معنی ہے، جس سے کسی نئے مفہوم کا اضافہ نہیں ہوتا۔ البتہ اس لفظ سے قاری کے ذہن پر وہی اجنبی اور نامانوس پرچھائیاں آجاتی ہیں جو خود میرے ذہن کو تاریک کر دیتی تھیں۔ اور اس طرح صحیح انداز سے سوچنے اور تہذیب و تمدن کی اصل حقیقت تک پہنچنے میں رکاوٹ بنتی تھیں۔

تو اختلاف "تہذیب و تمدن" کی تعریف میں ہوا۔ لہذا اس حقیقت کی

وضاحت ضروری ہے!

دہلیہ اصل تہذیب ہے اور بقیہ دوسرے نظام و نظریات پیمانہ گی اور جاہلیت کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے اپنی نیر طبع کتاب کے نام سے لفظ متہدین حذف کر دیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک اسلام کو متہدین کہنا ویسا ہی تھا جیسے آفتاب کو روشن کہنا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا یہ تصور جزا اثری اہل قلم کے تصور اسلام سے بالکل مختلف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ترمیم اس کی نگاہ میں کھٹک گئی اور اسے مصنف کی طرف سے مایوسی ہوئی کیونکہ نام میں لفظ متہدین کو شامل کرنے کے بعد پھر اسے حذف کر دینے کا واضح مطلب یہ تھا کہ مصنف کے نزدیک وہ زائد ہے۔ گویا ان کے نزدیک اسلام کا ہی اصل تہذیب ہونا ایک ایسی مسلم حقیقت ہے جس کے اثبات کی کوئی حاجت نہیں۔ جبکہ اس جزا اثری کے نزدیک ضرورت اس بات کی تھی کہ تہذیب کی دوڑ میں دین اسلام کی پیمانہ گی کا احساس کر کے اسے آگے بڑھانے کی کوشش کی جاتی اور بلا تامل اس کی جبین پر تہذیب نوی کی انشاں چن کر "تہذیب" اور "متہدین" افسانہ نظاموں کی صف میں اسے کھڑا کیا جاتا۔ (مترجم)

جب کسی معاشرے میں حاکمیت اعلیٰ تنہا اللہ کے لیے ہو اور وہاں اسی کی شریعت کا چلن ہو، تبھی انسان صحیح معنوں میں انسان کی بندگی یا انسان کی غلامی سے آزاد ہوگا۔ اور اسی وقت "انسانی تہذیب" کا وجود ہوگا۔ کیونکہ تہذیب انسانی کی عمارت کو جو بنیاد رکھتا ہے، وہ انسان کی بے داغ عزت اور کامل حریت کی ہی اینٹوں سے تیار ہو سکتی ہے۔ اور سچ پوچھو تو، کسی ایسے معاشرے میں انسان کو نہ عزت حاصل ہو سکتی ہے نہ حریت، جس میں کچھ لوگ تو شارع ہوں اور کچھ لوگ تابع۔ کچھ لوگ تو قانون ساز آقا ہوں اور کچھ لوگ اطاعت کیش غلام! یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ تشریح کا تعلق محض قانونی احکام سے نہیں۔ جیسا کہ آج کا عام رجحان ہے۔ ذہنی تصورات معاشرتی نظام، اخلاقی تدریس ترک و اختیار کے پیمانے، عادات اور روایات — یہ سب تشریح میں، جن کے لوگ پابند ہوتے ہیں۔ اور جب معاشرے کے ہی کچھ افراد یہ چیزیں خود ڈھالنا شروع کر دیں۔ اور دوسرے ان کے پابند ہوں تو یہ معاشرہ آزاد معاشرہ آزاد معاشرہ نہ ہوگا بلکہ یہاں کچھ تو آقا ہوں گے اور کچھ غلام۔ اور یہ ہیں سے وہ پس ماندہ یا اسلامی اصطلاح میں "جاہلی" معاشرہ قرار پائے گا۔

اسلامی معاشرہ صرف وہ معاشرہ ہے جس میں سارا اقتدار خدائے واحد کا ہو۔ لوگ مخلوق کی بندگی سے آزاد اور بس ایک خدا کے بندے ہوں کیونکہ اسی شکل میں انسان کو وہ حقیقی اور کامل آزادی حاصل ہو سکے گی جس پر تہذیب انسانی کا دار و مدار ہے۔ نیز ملا اعلیٰ میں اس کے جس رتبہ بلند کا چرچا ہوا تھا! اور معمورہ ارضی میں قدم رکھتے وقت عزت و تکریم کے جن درخشاں ہیروں سے اس کا تاج خلافت مزین ہوا تھا، ان سے بھی سرفراز نہ ہو سکے گا۔

اگر کسی معاشرے کی تنظیم ایک فکر ایک عقیدہ اور ایک نظام زندگی کی بنیاد پر ہو، سب کا سرچشمہ وہ خدائے واحد ہو جس کی بارگاہ میں پہنچ کر انسان کو عزت و سرفرازی حاصل ہوتی ہے، نہ کہ زمین کے وہ جھوٹے خدا جن کی نگاہ میں انسان کا

آخری کام بس انسان کی غلامی ہے، تو وہ تنظیم انسان کے اندر چھپی ہوئی بندہ ترین فکری و روحانی خصوصیات کی نمائندہ ہوگی۔ لیکن اگر کسی معاشرے کی تنظیم نسل یا خون یا قوم یا وطن کی اساس پر ہوئی ہو یا انہی جیسے دوسرے علائق و روابط کا لحاظ کیا گیا ہو تو ظاہر ہے کہ نسل و خون اور قوم و وطن انسان کی اعلیٰ ترین خصوصیات کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انسان کسی خاص نسل یا خاص خون یا خاص قوم یا خاص وطن کا نہ ہو کر بھی انسان ہی رہتا ہے، مگر فکر و روح کے بغیر وہ انسان نہیں رہ سکتا! پھر وہ اپنے آزاد ارادے سے فکر و تصور اور عقیدہ و نظام کو تو بدل سکتا ہے مگر خون اور نسل کو نہیں بدل سکتا۔ اسی طرح کسی مخصوص قوم یا وطن میں پیدا ہونا بھی اس کے اپنے بس میں نہیں۔ لہذا وہ معاشرہ جس میں لوگ کسی ایسی بنیاد پر یکجا ہوں جو فرد کے آزاد ارادہ و اختیار سے تعلق رکھتی ہو، وہی تمدن اور تہذیب یافتہ معاشرہ ہے رہا وہ معاشرہ جس میں لوگ کسی ایسی بنیاد پر یکجا ہوں جو آدمی کے ارادہ و اختیار کے دائرے سے باہر ہو، تو وہ پس ماندہ اور غیر تمدن یا اسلام کی زبان میں "جاہلی" معاشرہ ہے!

اسلامی معاشرہ ہی وہ معاشرہ ہے جس کی بس عقیدہ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اور عقیدہ ہی اس کی وہ قومیت ہے جو کالے، گورے، سرخ، پیلے، عربی، رومی، ایرانی، حبشی غرض زمین کی ساری قوموں اور نسلوں کو ایک ایسی اُمت کی شکل میں یکجا کر دیتی ہے جس کا رب اور مسجود و معبود تنہا خدا ہوتا ہے، جس کے اندر شرف و عزت کا معیار صرف تقویٰ ہوتا ہے۔ جس میں سب ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں، جس میں سب صرف ایک خدا کے نام پر جمع ہوتے، اور ایک ہی خدائی رشتے سے منسلک ہوتے ہیں۔

اگر کسی معاشرے کی نگاہ میں سب سے زیادہ اعلیٰ و اشرف چیز انسان کے "انسانیت" ہو اور "انسانی" خصوصیات ہی قدر و منزلت اور تکریم و عزت کی بنیاد ہوں تو یہ معاشرہ تمدن معاشرہ ہوگا۔ لیکن اگر کسی بھی حیثیت سے یہی

مقام " مادہ " کو حاصل ہو جائے ، چاہے " نظریئے " کی حیثیت سے جیسا کہ تاریخ کی مارکسی توجیہ میں ہے ! یا " مادی پیداوار " کی صورت میں جیسا کہ امریکہ یورپ اور انہی جیسے دوسرے معاشروں میں ہے ، جن کے نزدیک مادی ترقی ہی وہ سب سے بڑی چیز ہے جس کی راہ میں ساری قدریں اور تمام انسانی خصوصیات قربان کی جاسکتی ہیں۔ تو یہ معاشرہ پس ماندہ یا اسلام کی زبان میں جاہلی معاشرہ ہوگا !

متحدہ اسلامی معاشرہ مادے کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ نہ نظریہ کی حیثیت سے ، نہ " مادی پیداوار " کی صورت میں۔ کیونکہ جس کائنات میں ہم رہتے ہیں ، جس کے خیر و شر سے متاثر ہوتے ہیں جس کی تعمیر و تخریب میں حصہ لیتے ہیں ، اور جس کے بناؤ بگاڑ سے ہم تعلق رکھتے ہیں ، اس کی تخلیق مادے ہی سے ہوئی ہے۔ رہی مادی پیداوار تو خدا کی زمین پر خلافت کے فرائض انجام دینے کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں ، ہاں یہ ضرور ہے کہ معاشرہ اسلامی کے نزدیک مادہ کی یہ حیثیت نہیں کہ اس کے لیے انسانی خصوصیات اور قدریں ، فرد کی عزت اور حریت ، خاندانی ضروریات اور تقاضے ، معاشرتی اخلاق اور حرمتیں ، غرض وہ ساری بلند قدریں ، حرمتیں اور فضائل اخلاق قربان کیے جاسکیں جنہیں جاہلی معاشرے مادی پیداوار کی فراوانی کے لیے بے دریغ قربان کہہ دیتے ہیں۔

" انسانی قدریں " اور " انسانی اخلاق " ہی اگر معاشرے میں عزت و احترام کی بنیاد ہوں ، تو بلاشبہ یہ معاشرہ متحدہ معاشرہ ہوگا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ انسانی اخلاق اور انسانی قدریں کوئی دقیق ، مبہم غیر متعین اور تغیر پذیر چیزیں نہیں ، کہ وہ کسی ایک چال پر رہنے کے بجائے ہر لمحہ بدلتی اور نئے نئے روپ دھارتی رہیں۔ جیسا کہ " سائٹفک سوشلزم " اور تاریخ کی مادی توجیہ کا دعویٰ ہے !

یہ تو وہ اخلاق اور قدریں ہیں جو انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کو ابھارتی ہیں جن میں وہ حیوان سے ممتاز اور ایک انفرادی شان کا مالک ہے، نہ کہ وہ اخلاق اور قدریں جو بھیمی صفات کو جلا دیں، اور اس طرح اسے حیوانوں کی صف میں لا کھڑا کریں۔

مسئلہ کو اس حیثیت سے دیکھا جائے اور تہذیب و تمدن کا یہ پیمانہ سامنے رکھا جائے، تو اخلاق اور انسانی قدروں کے سلسلہ میں ایک ایسا اٹل، محکم اور قطعی خط امتیاز ابھر کر سامنے آتا ہے جو ترقی پسندوں اور سائنٹفک سوشلزم کے علمبرداروں کی ان کوششوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا، جن کا ہدف یہ ہے کہ انسانی اخلاق اور قدریں ایک مادہ بیال بن کر رہ جائیں۔ جو ماحول سماج اور افراد کے لحاظ سے نت نئی شکلیں اختیار کرتی رہیں

تہذیب و تمدن کا یہ پیمانہ سامنے رہے تو اس وقت اخلاقی قدروں کے حدود متعین کرنے والی چیز ماحول کی اصطلاح اور سماج کا عرف نہ ہوگا۔ ماحول اور سماج سے الگ ایک دوسری ہی اٹل میزان ہوگی۔ اس وقت ایسا نہ ہوگا۔ کہ کچھ ”زراعتی“ اخلاق اور قدریں ہوں اور کچھ ”صنعتی“، کچھ ”سرمایہ دارانہ“

اخلاق اور قدریں ہوں اور کچھ اشتراکی کچھ بورژوائی اخلاق اور قدریں ہوں اور کچھ ”پرولتاری“! اس وقت اخلاق کی تعین کرنے والی چیزیں ماحول، معیار زندگی، وقتی تقاضے اور اسی طرح کی دوسری سطحی اور ظاہری چیزیں نہ ہوں گی۔ اس وقت تو ان تمام سے ماوراء کچھ ”انسانی“ اخلاق اور قدریں ہوں گی اور کچھ ”حیوانی“ اگر یہ تعبیر صحیح ہے! — یا اسلام کی زبان میں کچھ

”اسلامی“ اخلاق اور قدریں ہوں گی اور کچھ ”جاہلی“ — اسلام کو جن معاشروں پر غلبہ و اقتدار حاصل ہوتا ہے، ان میں وہ انہی اخلاق اور انہی قدروں کی تخم ریزی کرتا اور پھر پوری تن دہی سے ان کی آبیاری کرتا، اور ان کی جڑیں مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نیز اس سلسلہ میں اس کے یہاں کوئی تفریق و امتیاز نہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ وہ معاشرے سے زراعت پیشہ ہیں یا صنعت پیشہ شہری ہیں یا دیہاتی، فقیر ہیں یا غنی، خوشحال ہیں یا بد حال۔ وہ ان تمام ہی حالات

میں انسانی خصوصیات کو بلند پویوں کی طرف لے کر بڑھتا اور حیوانیت کی پستیوں میں گرنے سے بچاتا ہے۔ کیونکہ ان قدروں کی طرف بڑھنے والی راہ حیوانی پستیوں سے انسانی رفعتوں کی طرف آتی ہے۔ اب اگر یہ راہ ———  
 مادی تہذیب کے ساتھ ——— پیچھے مڑ جائے، تو اس کو تہذیب و تمدن سے کوئی واسطہ نہ ہوگا! وہ بس ”پسماندگی“ ہوگی یا ”جاہلیت“!

اگر ”خاندان“ ہی معاشرے کا ستون ہو، اور وہ خاندان زن و شوہر کے درمیان ”تقسیم کار“ کی اساس پر قائم ہو، نیز آنے والی نسل کی صحیح تربیت ہی خاندان کی اہم ترین ڈیوٹی ہو، تو وہ معاشرہ مستحکم ہوگا، کیونکہ اس انداز کا کلبہ ہی ——— جس پر نظام اسلامی کا جاں نواز سایہ کھلی ہو ——— وہ ماحول فراہم کرتا ہے جس کے درمیان وہ ”انسانی“ اخلاق اور قدیں پروان چڑھ سکتی اور نئی نسل کے پیکر میں ڈھل سکتی ہیں جن کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا، اور جن کا خاندانی اکائی کے علاوہ کسی اور اکائی میں پروان چڑھنا ناممکن ہے۔ لیکن اگر ”آزاد“ جنسی تعلقات اور ناجائز یا ”غیر قانونی“ نسل ہی معاشرے کا ستون ہو، اگر صنفین کے درمیان قائم ہونے والے تعلقات کی اساس، ہوا و ہوس، جنسی بھوک اور حیوانی اکساہٹ ہو، اگر عورت کا کام زینت و آرائش، ناز و عشوہ اور فتنہ گری و نازک زنی ہو، اور اگر عورت نئی نسل کی تربیت و نگہداشت کے سلسلہ میں اپنی اساسی ذمہ داریوں سے دست کش ہو، اور وہ اس بات کو ترجیح دے، یا معاشرہ اس کے لیے پسند کرے ”انسانیت کو وہ کسی ہوٹل یا جہاز یا طیارے میں ضیافت کے فرائض انجام دے اور اگر وہ اپنی ساری قوتیں ”مادی پیداوار“ اور ”آلات سازی“ میں صرف کرنے لگے ”انسانیت ساری“ میں صرف نہ کرے کہ مادی پیداوار کی اس وقت انسانیت سازی ”تے زیادہ مانگتے۔ تو اس وقت انسانی نقطہ نظر سے یہ ”تمدنی پسماندگی“ یا اسلام کی زبان میں ”جاہلیت“ ہوگی!

کنبہ اور صنہین کے درمیان قائم ہونے والے تعلقات کسی معاشرے کے متعلق یہ متعین کرنے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں، کہ وہ پسماندہ ہے یا متقدم، جاہلی ہے یا اسلامی! وہ معاشرے جن کے ان تعلقات میں حیوانی اخلاق حیوانی جذبات اور حیوانی قدریں کارفرما ہوں، وہ کبھی متقدم معاشرے نہیں ہو سکتے۔ چاہے صنعتی، اقتصادی اور علمی حیثیت سے وہ کتنا ہی آگے ہوں! یہ وہ پیمانہ ہے جو "انسانی" ترقی کی مقدار بتانے میں کبھی خطا نہیں کر سکتا۔

جدید جاہلی معاشروں میں تو "اخلاقی" تصور بالکل ہی برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ ان تمام قدروں سے خالی ہو چکا ہے جو "انسان" کو "حیوان" سے ممتاز کرنے والی ہیں! ان معاشروں میں غیر قانونی جنسی روابط حتیٰ کہ خلاف فطرت جنسی تعلقات بھی — کوئی اخلاقی برائی نہ رہے۔ ان کے یہاں اخلاقی تصور بس اقتصادی امور اور سیاسی معاملات کے تنگ دائرے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اور سیاسی معاملات میں بھی اس کی جھلک بس اسی حد تک ہے جس حد تک "مصالح حکومت" کا تقاضا ہو۔ کریسٹن کیلر اور انگلستانی وزیر پروفیمو (PROFUMEO) کی رسوائی انگلستانی معاشرے میں اپنے جنسی پہلو سے رسوائی نہ تھی۔ اس کے وجہ رسوائی ہونے کا سبب صرف یہ تھا کہ کریسٹن کیلر (KEELER) سے (KRISTEN) روسی امباشی (RUSSIAN ATTACHE) سے بھی دوستانہ تعلقات رکھتی تھی۔ لہذا اس "بت کافر" سے وزیر کے تعلقات رہنے میں اسرارِ مملکت کے لیے خطرہ تھا۔ اور انگلستانی پارلیمنٹ میں اس کے جھوٹا پول بھی کھل گیا تھا۔ امریکی سینٹ (AMERICAN SENATE) میں ہونے والی اس قسم کی رسوائیاں اور ان جاسوسوں، انگلستانی ملازموں اور امریکیوں کی رسوائیاں جو روس فرار ہو گئے۔ ان کی جنسی آوارگی کے پہلو سے رسوائیاں نہ تھیں! بلکہ



اسرار مملکت کے لیے خطرہ ہونے کے پہلو سے سمجھیں !  
 جاہلی معاشرہ میں جگہ جگہ ایسے صحافی، ایسے ناول نگار اور ایسے  
 کلاکار موجود ہیں جو کس بچیوں اور جوان دوشیزاؤں سے کہتے ہیں، آزاد  
 جنسی تعلقات میں کوئی اخلاقی برائی نہیں۔ برائی تو یہ ہے کہ کوئی جوان  
 اپنی (فرینڈ بوائے) کو دھوکا دے جائے۔ اور پوری طرح اس کے  
 دامِ محبت میں گرفتار نہ ہو۔ برائی یہ ہے کہ جب توہر کے لیے بیوی  
 کے سینے میں محبت کی گرمی نہ رہ جائے تو اس وقت بھی وہ اپنی محبت  
 و عصمت کی حفاظت کرے! اور کوئی ایسا دوست نہ تلاش کرے، جسے  
 بہ تقاضا اُلفت اپنا تن سیمیں سونپ سکے! کثرت سے شائع ہونے  
 والے افسانے، ناول، رسائل و اخبارات کے ادارے، کارٹون اور  
 مزاحیے سب اپنے اندر یہی پیام رکھتے ہیں۔

اس طرح کے معاشرے بلاشبہ پسماندہ معاشرے ہیں۔ جنہیں  
 تہذیب و تمدن سے کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ وہ انسانیت سے کوسوں  
 دور ہیں، ترقی انسانی کی شاہراہ سے انتہائی پرے ہیں۔

ترقی انسانی کی شاہراہ تو اسی وقت طے ہو سکتی ہے جبکہ حیوانی  
 جذبات پر پورا کنٹرول رہے وہ فیملی یا ”خاندان“ کے ہی دائرے میں  
 محصور ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے فرائض سے بندھا ہوا ہو۔ کہ  
 اسی طرح اس ”انسانی ذمہ داری“ سے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے  
 جس کی روح لذات اندوزی نہیں، بلکہ ایک ایسی انسانی نسل کی فراہمی  
 ہے جو ”انسانی“ تہذیب کے سلسلے میں موجودہ نسل کی سچی جانشین ہو  
 سکے، جو حیوانی صفات سے گریزاں ہو، انسانی خصوصیات کی قدرداں  
 ہو، اور جان و دل سے ان کی نمود و ترقی کے لیے کوشاں ہو۔ ظاہر  
 ہے ایسی نسل کی اٹھان ایک ایسے ہی کنبے کی آغوش میں ممکن ہے

جس کے گرد تحفظات کی ایسی بار کھڑی کر دی گئی، جس کے اندر ذہنوں کو پورا سکون حاصل ہو۔ وہ کسی ہیجان یا انتشار کا شکار نہ ہوں۔ اور جس کی داغ بیل ایک ایسے اہم فرض کی ادائیگی کے لیے پڑی ہو، جو وقتی جذبات اور ہنگامی تاثرات سے متاثر نہ ہو جو وقتی تاثرات و انفعالات کے ساتھ ساتھ جھولتا نہ ہو۔ اب تم غور کرو، ایک ایسا معاشرہ جس میں اخلاقی تصور دم توڑ چکا ہو۔ جہاں سے جنسی آداب کا جنازہ اٹھ چکا ہو، اور جو شر پسند عناصر کی نجیست و مسموم ہدایات کی روشنی میں پروان چڑھ رہا ہو، کیا ایسا معاشرہ وہ انسانی آغوش فراہم کر سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

انہی تمام وجوہ سے اسلامی اخلاق، اسلامی قدریں، اسلامی ہدایات اور اسلامی تحفظات ہی انسان کے شایاں ہیں۔ اور اس طرح اسلام ہی اصل تہذیب ہوگا۔ اور مسلم معاشرہ ہی متعین معاشرہ ہوگا۔ کیونکہ تہذیب و تمدن کی پیمائش کا یہی اصل پیمانہ ہے۔ جو کسی زمان و مکان کے ساتھ خاص نہیں۔

اگر زمین پر انسان صحیح معنوں میں خلافت الہی کے فرائض انجام دینے لگے تو وہ صرف خدائے تعالیٰ کی بندگی کرے، غیر اللہ کی بندگی سے بیر رکھے، صرف نظام الہی کو قائم و نافذ کرے، غیر الہی نظاموں کو نفرت سے ٹھکرا دے، پوری زندگی میں صرف شریعت الہی کو حکم بنائے، کسی اور قانون و شریعت کو حکم بنا نا گوارا نہ کرے۔ ان اخلاق اور قدروں کی روشنی میں زندگی گزارے جو اللہ تعالیٰ نے متعین کی ہیں، دوسروں کے تزاوے ہوئے اخلاق اور قدروں کو کوئی اہمیت نہ دے۔ ان قوانین فطرت کا سراغ لگائے جو خدا نے اس مادی کائنات کے لیے مقرر فرمائے ہیں، پھر ان سے زمین کے دفینے برآمد کرنے اور زندگی کو ترقی دینے میں مدد لے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر خام اشیاء اور غذائی نعمتوں

کے بے پناہ ذخیرے محفوظ کر دیئے ہیں، اور ان کھروں کو قوائینِ فطرت سے مہربند کر کے خلافتِ الہی کی ذمہ داریاں بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے ان کی جلتی ضرورت تھی، اسی کے بقدر انسان کو دہریں توڑ سکنے کی بھی قدرت دی ہے۔ غرض انسان خدا سے کیے ہوئے کرد و شرائط کے ساتھ زمین پر خلافت کے فرائض دینے لگے۔ رزق کی تہریں رواں کرتے ہوئے خام مادے سے قسم قسم کی مصنوعات تیار کرتے ہوئے، اپنی پوری تاریخ میں انسان جو فنی معلومات اور مفید تجربات حاصل کر سکا ہے، ان سے کام لیتے ہوئے وہ ایک ”زبانی“ کا طرزِ عمل اختیار کر لے، اور خلافتِ الہی کے فرائض اس انداز پر جذبہ عبودیت کے ساتھ انجام دینے لگے، تو اس وقت صحیح معنوں میں انسانی تہذیب کی تکمیل ہوگی اور اسی وقت معاشرہ حضارت و تمدن کی سب سے بلند چوٹی پر ہوگا۔

یہیں صرف مادی اختراعات تو اسلام میں ان کا نام تہذیب نہیں کیونکہ بسا اوقات مادی اختراعات ہوتی

ہیں اور انہی کے پہلو پہلو جاہلیت بھی کھڑی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی جاہلیت زدہ مادی

ترقی کی متعدد مثالیں ذکر کی ہیں :-

(۱) اَتَبْسُونَ بِكُلِّ رِيحٍ آيَةٌ

تَعْبَثُونَ؟ وَتَتَّخِذُونَ

مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ!

وَإِذَا بَطِشْتُمْ جَبَّارِينَ

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا

وَأَتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ بِمَا

تَعْلَمُونَ، أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ

وَبَنِينَ وَجَنَّتِ وَعْيُونَ

إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ

کیا تم ہر اونچی جگہ فصول ہی آیت لگا

بنالیتے ہو؟ اور بڑے بڑے محل تعمیر

کرتے ہو، گویا تم ہمیشہ رہو گے! اور

جب تم کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو، تو انتہائی

جابر بن کر ہاتھ ڈالتے ہو، سو اللہ

سے ڈرو، اور میرا کہا مانو، ڈرو

اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا

جو تم جانتے ہو۔ اس نے دیئے تمہیں

چوپائے اور بیٹے، باغ اور چشمے

مجھے تو تمہارے بارے میں ایک

بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝

(الشعراء ۱۲۴-۱۲۰)

کیا تم یہاں کی چیزوں میں بیخوف  
چھوڑ دیئے جاؤ گے؟ یا سونوں  
اور چشموں میں، کھیتوں اور بھجوروں  
میں جن کا شکوفہ ملائم ہے، اور  
تم پہاڑوں کو تراش تراش کر پوری  
مہارت سے گھر بنا لیتے ہو؟ تو  
اللہ سے ڈرو، اور میرا کہا مانو،  
اور مسرفین کا کہنا نہ مانو، جو زمین  
میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔

(۲) اَتُرَكُّوۡا فِیۡمَا هُنَا  
اٰمِنِیۡرِیۡ جَنَّتِ وَّعِیۡوٰنِ  
وَزُرَّجِ وَنَخْلِ طَلَعَمَا  
هَظِیۡمٍ وَتَنۡجِیۡتُوۡنَ عَنِ  
اَلۡجِبَالِ بۡیۡوَتًا فَرِیۡنِ  
فَاۡتَقُوۡا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوۡنَ  
وَلَا تُطِیۡعُوۡا اَهۡلَ الْمَسْرِیۡنَ  
الَّذِیۡنَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الْاَرْضِ  
وَلَا یُصۡلِحُوۡنَ ۝

(الشعراء ۱۲۶-۱۵۲)

بچر جس سے ان کی یاد دہانی کرائی  
گئی تھی اسے جب انھوں نے بھلا دیا  
تو ہم نے ان پر تمام ہی نعمتوں کے  
دروازے کھول دیئے، یہاں تک  
کہ انھیں جو سمجھ ملا تھا، اس پر جب  
وہ خوب اتر لیے، تو اچانک ہم نے  
انھیں پکڑ لیا۔ پھر تو اب وہ بالکل  
مایوس تھے سو ان لوگوں کی جبر کٹ  
گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا۔ اور حمد  
اللہ ہی کے لیے ہے جو ساری جہان  
کا رب ہے۔

(۳) فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا  
بِهٖ فَجَنَّا عَلَیۡهِمۡ اَبۡوَابَ  
كُلِّ شَیۡءٍ حَتّٰی اِذَا فَرِحُوا  
بِمَا اُوْتُوا اَخَذۡنَاهُمۡ  
بَغۡتَۃً فَاِذَا هُمۡ مُبۡلِسُوۡنَ  
فَقَطَّعۡ دَاۡبِرَ الْقَوۡمِ الَّذِیۡنَ  
ظَلَمُوۡا وَاَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ  
رَبِّ الْعٰلَمِیۡنَ ۝

(الانعام ۲۳-۲۵)

یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا

(۴) حَتّٰی اِذَا اَخَذَتِ الْاَرْضُ

سنگار کر لیا اور سنور گئی اور اس کے  
ماک سمجھنے لگے کہ ہمیں اس پر پورا  
اختیار حاصل ہے، تو اچانک  
رات یادن میں ہمارا حکم آن پہنچا  
اور ہم نے اسے کٹی ہوئی کھیتی  
کی طرح کر دیا۔ گریا کل وہاں آبادی  
ہی نہ تھی۔

زُخْرُفَهَا وَازِيْنَتْ وَ  
ظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَدِرُونَ  
عَلَيْهَا أَنَّهُمْ آخِرُ نَالِيَدًا  
أَوْ نَهَادًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا  
كَانُ لَمْ تَعْنِ بِأَلَا مَسِ  
(یونس ۲۲)

لیکن اسلام، جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں، مادے کو حقارت کی  
نگاہ سے نہیں دیکھتا نہ مادی ترقی کو حقیر سمجھتا ہے۔ وہ تو اس قسم کی ترقی کو  
اگر وہ خدائی اصولوں کے تحت ہو۔ ایک نعمت الہی قرار دیتا  
ہے۔ اور طاعت الہی کے صلے میں ان کے ملنے کا مشورہ سنا تا ہے۔

تو میں نے کہا: تم اپنے رب سے  
استغفار کرو۔ بلاشبہ وہ بے حد  
مغفرت کرنے والا ہے۔ وہ  
بادل کو بھیجے گا تم پر خوب برساتا ہوا  
اور تمہیں اور زیادہ مال اور بیٹے دیگا  
اور تمہارے لیے باغ اگا دے گا،  
اور نہریں نکال دے گا۔

(۱) فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ  
أَنَّهُ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلِ  
السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا  
وَيُمِدُّكُمْ بِأَمْوَالٍ  
وَبَنِينَ وَيَجْعَلُ لَكُمْ  
جَنَّاتٍ وَيَجْعَلُ لَكُمْ أَنْهَادًا  
(نوح ۱۰-۱۲)

اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے  
اور اللہ کی نافرمانی سے ڈرتے  
تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکتوں  
کے دروازے کھول دیتے۔ مگر  
انہوں نے تکذیب کی تو جو سمجھ وہ

(۲) وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى  
آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمُ  
بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ  
وَلَكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمُ  
بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔

(الاعراف ۹۶) کرتے تھے اس کی پاداش میں ہم نے انھیں پکڑ لیا۔

دیکھنے کی اصل چیز۔ صنعتی ترقی یا مادی برتری نہیں۔ اصل چیز تو وہ اساس یا وہ بنیادی تصور ہے جس پر صنعتی ترقی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ قابل لحاظ شے تو وہ قدریں ہیں جو معاشرے میں رواج پاتی اور انسانی تہذیب کی خصوصیات کو اجاگر کرتی یا اس کے رُخ کا تعین کرتی ہیں۔

غرض اسلامی معاشرے کی ابتداء اور اس کا تکوینی مزاج یا ارتقائی انداز یہ دونوں چیزیں اسے ایک بالکل ہی منفرد معاشرہ بنا دیتی ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جو ان نظریات میں سے کسی بھی نظریہ سے ہم آہنگ نہیں ہوتا، جو جاہلی معاشروں کے قیام کی بنیاد اور ان کے تکوینی مزاج کے اٹلینہ دار ہوتے ہیں۔ اسلامی معاشرہ تحریک کی پیداوار ہے۔ تحریک اس میں ہمیشہ رہتی ہے۔ یہ چیز ہے جو اس کے اندر افراد کی قدر و قیمت متعین کرتی اور ان کی ذمہ داریوں اور مورچوں کے حدود قائم کرتی ہے۔

جس تحریک سے یہ معاشرہ پہلے پہل وجود میں آتا ہے۔ اس تحریک کا تعلق نہ اس مادی دنیا سے ہوتا ہے، نہ انسانی ذہن سے۔ بلکہ اس کا تعلق ان دونوں کے ماورئی ایک تیسرے سرچشمے سے ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے عقیدے کی شکل میں ہوتی ہے، جو خدا کے پاس سے آتا اور انسانوں کو زندگی، کائنات انسانی تاریخ، اخلاقی قدروں اور زندگی کی غایتوں کے سلسلہ میں ایک خاص تصور دیتا ہے، نیز ان کے سامنے ایک ایسا عملی پروگرام پیش کرتا ہے جو اس تصور کا صحیح ترجمان ہو۔ وہ پہلی موج جو تحریک کو آگے بڑھاتی ہے اس کا سرچشمہ نہ انسانی ذہن ہوتا ہے نہ یہ مادی کائنات ہوتی۔ وہ اس کائنات کے باہر اور عالم انسانی کی سرحدوں کے بھی آگے سے آتی ہے۔ اور یہی وہ پہلی

چیز ہے جو اسلامی معاشرے کے مزاج اور اس کی تنظیم کو امتیاز بخشتی ہے۔  
 اسلامی معاشرے کا سنگ بنیاد ایک ایسا عنصر (ELEMENT) ہوتا ہے جس کا تعلق انسانی دنیا سے ہوتا ہے نہ گہادی کائنات سے۔

اسی غیبی اور خدائی عنصر سے اسلامی معاشرے کے قیام کے سلسلہ میں تحریک کا پہلا قدم اُٹھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ”انسان سازی“ کا سبھی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے ذہن و دماغ تیار ہونے شروع ہو جاتے ہیں جو سرچشمہ غیب سے آنے والے اس عقیدے پر ایمان رکھتے ہوں۔ اور جس لمحے پہلا انسان اس عقیدے پر ایمان لاتا ہے حکماً اسی لمحے سے اسلامی معاشرے کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔ یہ کبھی ممکن نہیں کہ ایک انسان اس عقیدے کو اپنائے اور اپنے ہی اندر اسے چھپائے رہے وہ اسے لے کر آگے بڑھے گا! یہی اس کا مزاج ہے۔ زندہ تحریک کا مزاج۔ وہ عظیم و برتر قوت جس نے اس عقیدے کو اس دل میں پہنچا یا وہ جانتی ہے کہ یہ ضرور آگے بڑھے گا۔ وہ موج تندر تیز جس نے عقیدہ کی نکھتوں سے اس کو معطر کیا۔ رفتہ رفتہ آگے بڑھتی ہی رہے گی۔

اور جس وقت اس عقیدے کے ہمنوائتین ہو جائیں گے۔ یہ عقیدہ خود ان سے کہے گا، اس وقت تم ایک معاشرہ ہو، مستقل اسلامی معاشرہ، ایک ایسا معاشرہ جس کا اس جاہلی معاشرے سے کوئی تعلق نہ ہوگا جو اس عقیدے کو تسلیم نہیں کرتا، نہ اس کی ان بنیادی قدروں کو حکم ماننا، جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اور اس وقت اسلامی معاشرہ عملاً قائم ہو چکا ہوگا!  
 تین دس ہوں گے، دس سو ہوں گے، سو ہزار ہوں گے، ہزار بارہ ہزار ہوں گے، اور اس وقت اسلامی معاشرے کا وجود پوری طرح مستحکم اور نمایاں ہوگا!

اور چونکہ یہ نو چیز معاشرہ اپنے عقیدہ و تصور اپنی سرگرمیوں اور عملی

پر وگراؤں، اپنی قدروں اور پیمانوں میں جاہلی معاشرے سے بالکل مختلف ہوگا۔ اس لیے لازمی طور پر کشمکش ہوگی۔ اور اس طرح تحریک اپنے آغاز وجود سے لے کر مستقل وجود کی شکل اختیار کرنے تک اس معاشرے کے ہر فرد کو پرکھ چکی ہوگی۔ اسلام کے اپنے پیمانوں کے اعتبار سے وہ معاشرے میں جس حیثیت اور جس قدر و منزلت کا مستحق ہوگا وہ حیثیت اور وہ قدر و منزلت بھی اسے مل چکی ہوگی۔ پھر اس حیثیت کا اعتراف خود معاشرہ کرے گا۔ اس کی ضرورت کبھی نہ پڑے گی کہ وہ خود اپنی بلندی و برتری کا ثبوت پیش کرے یا اپنی اہلیت کا اعلان کرتا پھرے، بلکہ اس کا عقیدہ اور اس کے معاشرے کا مزاج تو اسے مجبور کرے گا کہ وہ اپنی طرف لپکنے والی نگاہوں سے اپنے آپ کو چھپائے۔

لیکن ”تحریک“ جو عقیدہ اسلامی اور اس عقیدے سے وجود میں آنے والے معاشرے کا مزاج ہے، کسی کی صلاحیتوں کو بھی پردہ خمول میں نہ رہنے دے گی! لازمی طور پر معاشرے کے ہر فرد میں حرکت ہوگی! اس کے عقیدے میں حرکت ہوگی۔ اس کے خون میں حرکت ہوگی۔ اس معاشرے اور معاشرے کی تنظیم میں حرکت ہوگی۔ اور چونکہ چاروں جاہلیت ہی جاہلیت ہوگی۔ اس کے اندر اور باہر اسی کے اثرات ہوں گے اس لیے جنگ بھی لازماً ہوگی اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔

مختلف مراحل میں مناسب اور موزوں تحریکی اقدامات کی ہی روشنی میں معاشرے کے ہر فرد کی حیثیت متعین ہوگی، اور ذمہ داریوں کی تقسیم بھی اسی پہلو سے ہوگی۔ کیونکہ معاشرے کی تنظیم کو کمال اسی طرح حاصل ہوگا کہ اس کی تمام ذمہ داریاں افراد کے اندر صحیح تناسب سے تقسیم ہوں۔ اور مناصب سونپتے وقت ان کی تحریکی خدمات، عملی کارنامے اور اعلیٰ صلاحیتیں ہی پیش نظر رہیں۔



یہ نشوونما اور یہ اندازِ ارتقاء اسلامی معاشرے کی دو ایسی خصوصیات ہیں جو دوسرے تمام معاشروں سے اسے ممتاز کر دیتی ہیں، صورت و ہیئت، مزاج و طبیعت، ترکیبی عناصر، نظام اور نظام کو نافذ کرنے والے اقدامات غرض ہر پہلو سے اسے ایک بالکل ہی منفرد معاشرہ قرار دیتی ہیں۔ اور ان سارے اعتبارات و امتیازات کو ایک مستقل حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، گویا انھیں ایسے اجتماعی تصورات سے نہیں برتا جا سکتا جو ان کے لیے اجنبی ہوں، ان پر ریسرچ یا تحقیق و مطالعہ ایسے نہج سے نہیں کیا جا سکتا جو ان کے مزاج کے لیے۔۔ نامانوس ہو، اور نہ انھیں ایسے اقدامات کے ذریعہ، نافذ کیا جا سکتا، جو کسی دوسرے نظام سے ماخوذ ہوں!

پیچھے ہم تہذیب کی جو تعریف کر آئے ہیں، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ معاشرہ اسلامی تاریخ کا کوئی سین نہیں، جسے ماضی کے اوراق میں تلاش کیا جائے۔ وہ تو حال کی پکار اور مستقبل کی آرزو ہے۔ وہ تو فلاح و سعادت کی ایسی کلید ہے جس کی آرزو مند ساری انسانیت ہو سکتی ہے، آج بھی ہو سکتی ہے، کل بھی ہو سکتی ہے تاکہ جاہلیت کی جس کھڈ میں بڑی اوہ کراہ رہی ہے، اس سے باہر نکل سکے کیونکہ آج کوئی قوم بھی جاہلیت سے محفوظ نہیں، خواہ وہ قومیں ہوں جو صنعتی اور اقتصادی میدان میں بہت آگے نکل چکی ہیں، یا پسماندہ اور غیر متقدم قومیں۔

وہ قدریں جن کی طرف ہم نے اجمالی اشارہ کیا، یہ وہ انسانی قدریں ہیں جن تک انسانیت ”تہذیب اسلامی“ کے ہی مبارک دور میں پہنچ سکی۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ”اسلامی تہذیب“ کی اصطلاح سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ اسلامی تہذیب سے ہماری مراد وہ تہذیب ہے جس میں یہ قدریں پورے طور پر موجود ہوں کوئی بھی صنعتی، اقتصادی یا علمی ترقی

جو ان قدروں سے خالی ہو اسے کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہو، مگر اسلامی تہذیب کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

پھر یہ قدریں کوئی ”مثالی“ اور ”مخیالی“ یا ”تخیلاتی“ نہیں۔ یہ تو وہ عملی اور واقعی قدریں ہیں جو انسانی جدوجہد سے عملی دنیا میں قائم و نافذ کی جا سکتی ہیں۔ ہر ماحول میں نافذ کی جا سکتی ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ جدوجہد صحیح اسلامی نہج پر ہو اور ایسا کرنے کے لیے اس کی ضرورت قطعاً نہ ہوگی کہ وہاں کی صنعتی، اقتصادی اور علمی ترقی یا وہاں کی طرز معاشرت کو چھینا جائے۔ کیونکہ یہ قدریں زندگی کے کسی بھی میدان میں ترقی کی مخالف نہیں، اس کے برعکس یہ تو ترقی کی مزید حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ کیونکہ خود عقیدے کا یہی مزاج ہے لیکن ساتھ ہی ان علاقوں یا ان ملکوں میں یہ قدریں عاجز و در ماندہ یا بے بس نہیں ہو جاتیں، جو اس وقت تک ان میدانوں میں ترقی نہ کر سکے ہوں۔ تہذیب ہر جگہ اور ہر ماحول میں قائم ہو سکتی ہے، اور انہی قدروں کی بنیاد پر قائم ہوگی۔ البتہ اس کے لیے جو جو مادی صورتیں وہ اختیار کرے گی ان کی کوئی فہرست نہیں، کیونکہ وہ ہر ماحول میں انہی وسائل سے کام لے گی جو عملاً وہاں موجود ہوں گے۔ اور انہی کو وہ مزید پروان چڑھاٹے گی۔

گویا اسلامی معاشرہ اپنی صورت و حیثیت، اپنی وسعت اور اپنے نقشہ زندگی کے اعتبار سے تاریخ کا کوئی واقعہ یا تاریخ کا کوئی ”پہچر“ نہیں، جس کا تعلق کسی خاص دور سے ہو، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کا وجود اور اس کی تہذیب کچھ لازوال تاریخی قدروں پر موقوف ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ جب ہم ”تاریخی“ کا لفظ بولتے ہیں، تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے؟ ہماری مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ تاریخ کے ایک خاص دور میں، ہمیں ان قدروں کا علم عطا ہوا، ورنہ یہ تاریخ کا کرشمہ نہیں اور طبعی طور پر ان قدروں کا زمانے سے کوئی تعلق نہیں، یہ تو وہ صدائیں ہیں جو انسانیت کے پاس خدا کے ہاں

سے آئی ہیں یہ نہ انسانی نہ بہن کی پیداوار ہیں، نہ اس مادی کائنات کی۔  
 اسلامی تہذیب ظاہری طور پر، حالات کے لحاظ سے، اپنے تنظیمی تقاضوں  
 کی طرف مختلف شکلیں اختیار کر سکتی ہے لیکن جن اصولوں اور جن قدروں  
 پر اس کی عمارت کھڑی ہوگی، وہ ہمیشہ ایک سی ہوں گی۔ وہ اپنے ان بنیادی  
 اصولوں اور اساسی قدروں سے کبھی نہیں ہٹ سکتی، کیونکہ یہی اس کا تانا  
 بانا ہیں۔ وہ قدریں ہیں کیا؟ خالص خدا کی بندگی، محض عقیدے کی بنیاد  
 پر باہمی شیرازہ بندی، مادے پر روح کی برتری، ان انسانی قدروں کی حکمرانی  
 جو انسان کی انسانیت کو پروان چڑھائیں، نہ کہ حیوانیت کو، خاندانی حرمت  
 کا تحفظ، خدا سے کیے ہوئے عہد و شرائط کا ایفاء، زمین پر سچی خلافت الہی  
 کا قیام، اور سارے ہی امور میں صرف نظام الہی اور شریعت ربانی کی بالادستی۔  
 اسلامی تہذیب جو ان اٹل بنیادوں پر قائم ہوگی، اس کی ظاہری اور  
 تنظیمی شکلیں صنعتی، اقتصادی اور سائنسی ترقیوں سے متاثر ہوئے بغیر  
 نہیں رہ سکتیں۔ پھر جس درجے کی ترقی ہوگی، اسی درجے کی تبدیلیاں ہوں  
 گی، کیونکہ وہ ہر ماحول کے فراہم ہو سکنے والے وسائل سے پورا پورا فائدہ  
 اٹھاتی ہے۔ اور یہیں سے اس کی شکلوں کا بدلنا بھی ناگزیر ہے۔ پیدلنا  
 ناگزیر ہے تاکہ اس کے اندر اتنی لچک برقرار رہ سکے کہ ہر معاشرے اور  
 ہر سطح کے لوگ اسلامی چوکھٹے میں فٹ ہو سکیں۔ اور اسلامی قدروں اور  
 اسلامی اصولوں کو اپنا سکیں۔ البتہ یہ واضح رہے کہ عقیدہ اسلامی، جس  
 سے یہ تہذیب وجود میں آتی ہے اس پر یہ لچک الگ نہیں چپکائی جا رہی  
 ہے کہ یہ لچک تو خود اس عقیدے کے مزاج میں شامل ہے۔ ہاں یہ ضرور  
 ہے کہ لچک زمانہ سازی اور ابن الوقتی کا نام نہیں۔ دونوں کے درمیان  
 زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اسلام تو افریقہ کے صحراؤں میں رہنے والے ننگ و دھڑنگ وحشیوں کے درمیان

بھی تہذیب کی داغ بیل ڈالتا تھا چنانچہ اس کے آتے ہی برہمنہ جسموں پر لباس آجاتے ہیں اور لوگ تیزی سے لباس کی تہذیب اپنانے لگتے ہیں کہ یہ براہ راست اسلامی تعلیمات کا تقاضا تھا۔ اسی طرح وستی و زینتِ عالی کے غاروں سے نکل کر عمل کی دنیا میں آنے لگتے ہیں اور کائنات کے مادی ذخیروں سے نفع اندوزی کے طریقے سیکھتے ہیں۔ وہ قبیلے اور گھرانے سے ترقی کر کے اُمت کے اسٹیج میں آجاتے ہیں۔ اور قبائلی دیوتا طوطم (TOTEM) کی عبادت چھوڑ کر رب کائنات کی عبادت کرنے لگتے ہیں۔ تہذیب اگر اس کا نام نہیں تو پھر کس کا نام ہے؟ یہ اس ماحول کی تہذیب تھی جو عملاً وہاں پائے جانے والے وسائل کا سہارا لیتی لیکن یہی اسلام جب کسی دوسرے ماحول میں قدم رکھتا ہے تو اپنی اُٹل قدروں کی ہی بنیاد پر تہذیب کی کوئی دوسری شکل اختیار کرتا ہے۔ پھر اس ماحول کے اندر ہر وقت فراہم ہو سکنے والے ذرائع و وسائل سے کام لیتا ہوا انہیں مزید پروان چڑھاتا ہے۔

اسی طرح تہذیب اسلامی کا قیام، صنعتی، اقتصادی اور سماجی ترقی کے کسی خاص معیار پر موقوف نہیں۔ اگرچہ وہ قائم ہوتی ہے تو موجودہ ترقی سے پورا فائدہ اٹھاتی ہے، نہ صرف فائدہ اٹھاتی ہے، بلکہ اسے مزید آگے بڑھاتی اور اس کے مقاصد کو رفعت بخشی ہے اسی طرح ترقی نہ ہونے کی صورت میں خود اس کی داغ بیل ڈالتی اور خود ہی

لے افریقی قبائل کا ایک مہم دیوتا تھا جسے وہ طوطم (TOTEM) کہتے۔ یہ طوطم ہر قبیلے کا الگ الگ ہوتا۔ مجموعاً یہ کوئی خاص جانور ہوتا۔ جس کے بارے میں یہ عقیدہ ہوتا کہ اس کا خون تمام افراد قبیلہ کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ چنانچہ اسے وہ ہمیشہ تقدس کی نگاہ سے دیکھتے۔ نہ اسے کبھی مارتے نہ ذبح کرتے بس خاص خاص مذہبی تقریبات میں ہی اسے قربان کرتے اس وقت وہ اس کا خون بھی پیتے۔ تصور یہ ہوتا کہ وہ خون ہمیشہ ان کی رگوں میں دوڑتا رہے گا۔ (مترجم)

اسے آگے بڑھاتی اور پروان چڑھاتی ہے، لیکن ان ساری ہی حالتوں میں وہ اپنے مستقل اصولوں سے نہیں مٹتی، اور معاشرہ اسلامی کا وہ خاص مزاج اور اس کی وہ تنظیم جوں کی توں باقی رہتی ہے، جس کا ظہور اس پہلے ہی نقطے سے ہوتا ہے، جہاں سے وہ معاشرہ آگے بڑھتا اور جس کی بنیاد پر دوسرے جاہلی معاشروں سے ممتاز ہوتا ہے۔

بس اللہ کا رنگ! اللہ سے اچھا کس کا  
رنگ ہوگا؟

صِبْغَةَ اللَّهِ جَ وَمَنْ أَحْسَنُ  
مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً؟

## اسلام اور کلچر

خدا نے واحد کی مکمل بندگی اور رسول اکرمؐ کی کامل پیروی ہی اسلام کی اصل بنیاد ہے۔ جیسا کہ ”لا الہ الا اللہ — ایک نظام زندگی“ نامی فصل میں گزرا۔

اور خدا نے واحد کی مکمل بندگی صحیح معنوں میں اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ تنہا اسی کو الہ تسلیم کیا جائے۔ اس طور سے کہ دلوں میں بس اسی کی محبت و عظمت کے چراغ روشن ہوں۔ عبادت و نیاز مندی کی پیشانیاں اسی کے آگے جھکی ہوئی ہوں اور زندگی کی تمام سرگرمیاں اسی کے قوانین کے احکام کے تابع ہوں۔ چنانچہ ایک مسلم یہ عقیدہ کبھی نہیں رکھ سکتا کہ ”الوہیت“ اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ یا جہاں ”بندگی“ خدا کے سوا کسی اور کے آگے بھی جھک سکتی ہے یا کشور ”حاکمیت“ میں کسی بندے کے لیے بھی گنجائش ہو سکتی ہے اس کی بھی توضیح اسی فصل میں ہو چکی ہے۔

وہیں ہم نے عبودیت، اعتقاد اور عبادت کی بھی وضاحت کی ہے اب اس فصل میں ہم ”حاکمیت“ کا مفہوم اور ثقافت (CULTURE) سے اس کا تعلق بیان کریں گے۔

اسلام میں ”حاکمیت“ کا مفہوم بس اتنا ہی نہیں کہ خدا کے ہاں سے آئے ہوئے قانونی احکام کی روشنی میں مقدمات کے فیصلے کر دیئے جائیں۔ اسلام میں ”شرعیات“

کا مفہوم محض قانونی تشریح یا قانونی احکام کے تنگ دائرے میں محصور نہیں، نہ اصول حکومت نظام حکومت اور انداز حکومت کے ہی دائرے میں محصور ہے۔ یہ تنگ مفہوم اسلامی تصور "شریعت" سے میل نہیں کھاتا۔

شریعت سے مراد وہ تمام ہدایات و قوانین ہیں جو انسانی زندگی کو انحراف بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔ عقائد کے اصول ہوں یا حکومت کے نظام، اخلاق کے ضابطے ہوں یا معاشرت کے آداب، علم و دانش کے آئین ہوں یا تحقیق و ریسرچ کے طریقے، ان سب سے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہدایات دی ہیں اور یہ سب شریعت کے تحت داخل ہیں۔

اعتقاد و تصور کے تمام عناصر اس کے تحت داخل ہوں گے۔ سارے ہی تصورات، خواہ حقیقت الوہیت سے متعلق ہوں یا حقیقت انسان سے، اس مرئی کائنات سے متعلق ہوں یا مخفی کائنات سے، اس محسوس زندگی سے متعلق ہوں یا پوشیدہ زندگی سے، ان چیزوں کے باہمی ربط سے متعلق ہوں یا ان کے ساتھ انسان کے طرز عملی سے، یہ سارے تصورات شریعت کا جزو ہیں۔ یہ سب شریعت سے براہ راست وابستہ ہیں۔

شریعت سیاست و معاشرت، اقتصاد و معیشت سے بھی بحث کرتی ہے۔ ان کے سلسلہ میں بھی وہ بنیادی اصول اور واضح خطوط دیتی ہے، کہ ان کے اندر بھی خدا کی کامل بندگی کا رنگ نمایاں ہو۔

قانونی احکام جو زندگی کے ان تمام شعبوں کی شیرازہ بندی کرتے ہیں، وہ بھی شریعت کے دائرے میں داخل ہیں اور آج کل تو شریعت کے معنی ہی ہو گئے ہیں قانونی احکام حالانکہ شریعت کا یہ تنگ مفہوم اس اصل مفہوم کی نمائندگی نہیں کرتا، جو اسلام میں مراد ہے۔

زندگی کی وہ قدیں، ترک و اختیار کے وہ پیمانے اور اخلاق و معاشرت کے وہ اصول جو معاشرے میں حکمرانی کرتے اور اجتماعی زندگی میں کسی کے محترم یا ذلیل ہونے، کسی چیز کے اچھے یا بُرے ہونے یا کسی واقعہ کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کے فیصلے کرتے ہیں، وہ بھی شریعت کے دائرے سے خارج نہیں۔

پھر یہ شریعت علم و فن کے سارے شعبوں سے بھی بحث کرتی اور فکر و فن کے جملہ اصول فراہم کرتی ہے۔

ان سارے امور میں ضروری ہے کہ ہم قرآن و سنت سے رہنمائی حاصل کریں۔ بالکل اسی طرح حاصل کریں جس طرح ان خاص احکام میں حاصل کرتے ہیں جنہیں ہم بزرگ خود شرعی احکام کہتے، اور جن کے تنگ دائرے میں شریعت کو محصور کر دیتے ہیں۔

”حاکمیت“ — بمعنی حکومت اور قانون سازی کا جو تعلق ہے شریعت سے، وہ بھی اب آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں تو ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

معاشرے کی رائج قدروں اور پیمانوں اور اخلاق و معاشرت کے حکمران اصولوں کا شریعت سے جو تعلق ہے، اس کا سمجھنا بھی اب دشوار نہیں رہا۔ کیونکہ معاشرے کی رائج قدروں اور پیمانوں اور اخلاق و معاشرت کے حکمران اصولوں کا تعلق براہ راست اس تصور یا اس اعتقاد سے ہوتا ہے جو اس معاشرے میں پایا جاتا ہے، ان تمام امور کا سرچشمہ بھی وہی ہوتا ہے جو عقیدے کے بنیادی حقائق کا ہوتا ہے۔

البتہ جس چیز سے اجنبیت محسوس کی جاسکتی ہے — حتیٰ کہ اس طرح کے اسلامی مباحث پڑھنے والے حلقوں میں بھی! — وہ فکری اور فنی مباحثوں میں بھی تصورِ اسلامی اور سرچشمہ ربانی کی طرف رجوع کرنے کا مسئلہ ہے۔

فن کے سلسلہ میں تو ایک مستقل کتاب ”منظر عام پر آچکی ہے جس میں

لے الا نذام محمد قطب کی کتاب ”منہج الفن الاسلامی“



اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ فن (آرٹ) انسان کے تصورات و رجحانات، تاثرات و میلانات اس کے وجدان و انفعال کی ایک انسانی تعبیر ہے۔ اور مسلم کے اندر ان چیزوں کو نکھارنے والی، نہ صرف نکھارنے والی بلکہ ان کی تخلیق کرنے والی چیز اس کا تصور اسلامی ہے۔ وہ تصور جو نفس، زندگی اور کائنات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ وہ تصور جس کا تعلق اس مستی سے ہے جو نفس، زندگی اور کائنات کی خالق ہے! وہ تصور جو اس انسان کی حقیقت، کائنات میں اس کی حیثیت، اس کے وجود کی غایت، اس کے منصبی فرائض اور زندگی کی حقیقی قدروں کے سلسلے میں خاص نقطہ نظر رکھتا ہے۔ قصہ کوتاہ یہ ساری چیزیں اس تصور اسلامی کا جزو ہیں جو محض ایک فکری تصور اور ذہنی تخیل ہی نہیں، بلکہ ایک زندہ، موثر، فعال، پر جوش اور انسان کے سارے جذبات و رجحانات پر تصرف کرنے والا اعتقادی تصور ہے۔

رہا خالص فکری علوم یا فکری کاوشوں کا مسئلہ یعنی یہ باہر خدائے واحد کی کامل بندگی کیلئے انھیں بھی خدائی اصولوں اور اسلامی ضابطوں کا پابند رکھنا ضروری ہے، تو اس پر ہمیں یہاں کھل کر گفتگو کرنی ہے کیونکہ یہ چیز فارمیں کے لیے — حتیٰ کہ ان مسلمانوں کے لیے بھی جو حاکمیت اور قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کیلئے قرار دینا ضروری سمجھتے ہیں — اجنبی یا بالکل ایک نئی چیز ہو سکتی ہے!

وہ مسائل جو عقیدہ و عبادت سے تعلق رکھتے ہوں یا عام تصور وجود سے اخلاق و معاشرت سے تعلق رکھتے ہوں یا زندگی کی قدروں اور بیابانوں سے سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی نظاموں سے تعلق رکھتے ہوں یا انسانی جدوجہد کے اسباب و محرکات انسانی تاریخ کے آثار چڑھاؤ کی تشریح و تفسیر سے، ان تمام مسائل میں

کتاب الہی کی طرف رجوع کرنا اور خدا کی بھیجی ہوئی ہدایا سے روشنی حاصل کرنا ضروری ہے اس طرح ان امور میں رہنمائی کسی ایسے مسلمان سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے جس کے دین و تقویٰ اور عملی زندگی پر کامل اعتماد ہو۔

البتہ ایک مسلمان کو یہ اختیار ہے کہ وہ خالص دنیاوی علوم مثلاً طبیعیات

(PHYSICS) فلکیات (ASTRONOMY) کیمیا (CHEMISTRY)

علم الحیات (BIOLOGY) طب، صنعت و زراعت کا فن نظم و انتظام، جنگ

و پیکار کے فنی طریقے مسلم یا غیر مسلم کسی سے بھی سیکھے، اگرچہ خود مسلم معاشرہ کی یہ ذمہ داری

ہے کہ وہ ان تمام میدانوں میں یہ ساری صلاحیتیں بہم پہنچانے کی جدوجہد کرے۔ اور

ان کے لیے ایسی فضا پیدا کرے جس میں وہ پھلیں پھولیں پر وان چڑھیں، اور بہتر سے

بہتر شکل میں نتیجہ خیز اور بار آور ہو سکیں۔ یہ سب فرض کفایہ ہیں۔ ضروری ہے کہ معاشرے

کے کچھ افراد ان چیزوں میں مہارت حاصل کریں، ورنہ سارے ہی لوگ گنہگار ہوں گے

البتہ جب تک یہ بات نہیں ہوتی اس وقت تک ایک مسلم کو اختیار ہے کہ وہ

ان علوم کو سیکھنے اور ان کی عملی تطبیق کرنے میں مسلم یا غیر مسلم سب سے فائدہ اٹھائے۔

سب کی کاوشوں سے خوشہ چینی کرے اور کسی کی طرف سے بھی حاصل ہونے والے

موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے، کیونکہ یہ تمام چیزیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے اس ارشاد کے تحت آتی ہیں:

أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ۔ ”اپنی دنیا کے معاملات کو تم بہتر طور پر سمجھتے ہو۔“

کیونکہ یہ علوم زندگی، کائنات، انسان، انسان کے مقصد و وجود اور گرد و پیش

کی دنیا سے اس کے تعلق کی نوعیت سے کوئی بحث نہیں کرتے۔ نہ خالق کائنات

کے ساتھ اس کے تعلق کی کیفیت سے کوئی تعرض کرتے ہیں۔ وہ اصول و مبادی

وہ شرائع و احکام اور وہ نظام جو شخصی یا اجتماعی پیمانے پر اس کی زندگی کوئی رخ

متعین کرتے ہیں۔ ان سے بھی ان علوم کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اخلاق و آداب ، وہ عادات و روایات ، وہ قدریں اور پیمانے جو معاشرے پر حکمرانی کرتے اور اس کا مجموعی کردار تیار کرتے ہیں ، وہ بھی ان علوم کے دائرے سے خارج ہیں۔ لہذا ان سے عقیدے کے بگڑنے یا جاہلیت کی طرف پھریاٹ جانے کا کوئی اندیشہ نہیں !

مگر جہاں تک ان علوم کا تعلق ہے جو انسان کی اجتماعی یا انفرادی جدوجہد کی توجیہ و وضاحت کرتے ہیں جن کے ذریعہ انسان کی حقیقت اور انسانی تاریخ کے آثار چھڑھاؤ پر بخور کیا جاتا ہے اور جو ماوراء الطبیعی پہلو سے زندگی ، کائنات اور خود انسان کی نشوونما کے اصول متعین کرتے ہیں۔ ان کا حال خالص دنیاوی علوم یعنی طبیعیات ، کیمیا ، فلکیات اور طب جیسا نہیں۔ ان کا تو بالکل وہی معاملہ ہے جو ان شرائع و احکام اور ان اصول و مبادی کا ہے جو انسانی زندگی اور اس کی سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتے اور اسکی کوئی ایک متعین کرتے ہیں۔ ان کا تعلق براہ راست عقیدے سے ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ایک مسلم ان کے سلسلہ میں رہنمائی کسی ایسے مسلمان سے ہی حاصل کرے ، جس کے دین و تقویٰ پر اسے اعتماد ہو ، اور یہ یقین ہو کہ اس کی ان ساری معلومات کا سرچشمہ خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت ہی ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ یہ چیز مسلمان کے ذہن میں پیوست ہو جائے اور وہ اچھی طرح جان لے کہ یہ خدائے واحد کی بندگی یا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ کی شہادت کا ہی لازمی تقاضا ہے۔

وہ جاہلی کاوشوں اور جاہلی ذہن کے سارے افکار و نظریات سے واقف ہو لیکن اس لیے نہیں کہ یہی تمام چیزیں ان امور میں اس کے فکر و تصور اور علم و واقفیت کی بنیاد بنیں ، بلکہ اس لیے کہ اسے اندازہ ہو کہ جاہلیت کس کس طرح بھٹکتی اور ٹھوکر پی کھاتی ہے ! اور کس طرح اسلامی اصولوں اور عقیدہ اسلامی کی صداقتوں سے اسے آہ رویوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

بلاشبہ ”فلسفے“ کے سارے رُخ ”تاریخ انسانی“ کی تمام تعبیریں ”علم النفس“

(PSYCHOLOGY) کے سارے رجحانات، ”اخلاق“ کے سارے مباحث

”ہم عصر مذاہب“ کے تقابلی مطالعے کے تمام طریقے نیز اجتماعیت کے تمام نظریات

براہ راست جاہلی عقائد و تصورات سے متاثر ہیں۔ بلکہ ان کی بنیاد ہی انہی عقائد و

تصورات پر ہے۔ ان تمام علوم کے سلسلہ میں جہاں تک مشاہدات، اعداد و شمار اور

براہ راست حاصل ہونے والی معلومات کا تعلق ہے، انہیں تو مستثنیٰ قرار دیا

جاسکتا ہے لیکن ان مشاہدات اور اعداد و شمار سے جو عمومی نتائج اور اصولی کلیے

اخذ کیے جاتے ہیں، انہیں ہرگز مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تمام علوم یا کم از کم ان میں

سے پیشتر علوم اپنے بنیادی اصولوں میں تمام ہی مذہبی تصورات بالخصوص تصویہ اسلامی

سے انتہائی شدید عداوت رکھتے ہیں۔ خواہ یہ عداوت علانیہ ہو یا درپردہ!

فکری اور علمی! — جدوجہد کی ان اقسام کا وہ معاملہ نہیں جو کیمیا،

طب، فلکیات، طبیعیات اور علم الحیوۃ جیسے علوم کا ہے۔ پھر ان علوم میں بھی شرط یہ کہ یہ علمی

تجربات اور واقعی نتائج کی ترتیب کے حدود میں رہیں، نہ کہ ان حدود کو پھانڈ کر

کسی بھی شکل میں ان کی فلسفیانہ تشریح پر آجائیں جس طرح ڈاروینی ذہن علم الحیوۃ

(BIOLOGY) میں مشاہدات اور ان کی ترتیب کو ثابت کرتے ہوئے یہ کہہ

بیٹھا کہ زندگی کی نشوونما اور اس کے تغیرات کی تشریح کے لیے عالم طبیعی سے ماورا

ایک طاقت کا وجود ماننے کی کوئی ضرورت نہیں اور ایسا اس نے محض ہوا و نفاس

کی بنا پر کیا۔ ورنہ اس دعوے کی نہ کوئی دلیل ہے۔ نہ یہ دعویٰ کرنے کی کوئی ضرورت

تھی اس لیے کوئی دعویٰ نہیں۔

ان امور کے سلسلہ میں مسلمان کے پاس خدائے تعالیٰ کے ہاں سے آئی ہوئی

اتنی معلومات موجود ہیں، جو اس کے لیے کافی ہیں۔ اور وہ اتنی بلند سطح پر

اس سلسلہ کی ساری انسانی کاوشیں مضحکہ خیز اور طفلانہ حرکتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جبکہ یہاں محض معیار کی پستی یا بلندی کا ہی سوال نہیں بلکہ اس معاملے میں تعلق براہ راست عقیدے اور خدائے واحد کی کامل بندگی سے ہے۔

”ثقافت (CULTURE) تو انسانی ورثہ ہے، نہ اس کا کوئی وطن ہے اور نہ اس پر کسی مذہب کا اجارہ ہے یہ حکایت بالکل صحیح ہے بشرطیکہ اس کا تعلق خالص دنیاوی علوم اور ان کی عملی تطبیقات سے ہو، نہ کہ اس دائرے سے آگے بڑھ کر ان علوم کے نتائج کی فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی (METAPHYSICAL) تشریح کی جانے لگے یا انسانی سرگرمیوں اور تاریخی تغیرات کی فلسفیانہ تشریح ہونے لگے یا فن و ادب اور تمام شعوری تعبیرات سے بحث کی جانے لگے کیونکہ اس صورت میں تو یہ یہودیوں کی عالمی سازشوں میں سے ایک خطرناک سازش ہوگی۔ جس کا مقصد ہے راستے کی ساری چٹانوں بالخصوص عقیدہ و تصور کی چٹانوں کو پاش پاش کر دینا تاکہ یہ بد باطن جسم عالم کو گھس کر کے اس میں پوری طرح نفوذ کر جا سکیں۔ پھر دل کھول کر اپنے شیطانِ ارمان پورے کریں۔ بالخصوص سودی کاروبار کو فروغ دے سکیں، جس کا انجام یہ ہوگا کہ ساری نوع انسانی کا خون، پسینہ اور گارٹھی کماٹیاں یہودی کمپنیوں میں براجمان بد بختوں کی سٹھیوں میں آ جا پڑیں گی!

اسلام کی نگاہ میں ان تمام فنی اور دنیاوی علوم اور ان کی عملی تطبیقات کے پس منظر میں دو قسم کی ثقافتیں کار فرما ہیں۔ اسلامی ثقافت جو اسلامی تصور اور اسلامی عقیدے کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور جاہلی ثقافت جس کی تہ میں مختلف اصول کار فرما ہیں جن میں سے تمام کی بالآخر ایک ہی اصل قرار پاتی ہے اور وہ ہے فکر انسانی کو ایک ایسا خدا بنا دینا جو اللہ تعالیٰ سے بالکل بے نیاز ہو، پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی ثقافت انسان کی

ساری ہی عملی اور فکری سرگرمیوں پر حاوی ہے اور وہ ایسی بنیادوں، ایسے اصول اور ایسی خصوصیات سے مالا مال ہے جو ان سرگرمیوں کی نشوونما اور ان کی زندگی و پابندگی کی ضامن ہیں۔

ہمارے لیے یہ جان لینا کافی ہوگا کہ یہ سائنٹیفک نقطہ نظر یا تجرباتی علوم جن پر یورپ کی موجودہ صنعتی تہذیب کی بنیاد ہے، ان کی نشوونما پہلے یورپ میں نہیں، ایشیا اور اندلس کی اسلامی درسگاہوں میں ہوتی اور ان کے رہنما اصول بھی اسلام اور اس کی ان تعلیمات سے ہی لیے گئے جو واضح طور پر کائنات اس کی فطرت اور اس کی تہوں میں مدفون خزانوں کی طرف اشارے کرتی ہیں۔ پھر یورپ کی نشاۃ ثانیہ (RENAISSAN) میں وہاں کی علمی تحریک نے انہیں اپنے ہاتھ میں لیا اور برابر وہ انہیں پروان چڑھاتی اور ترقی دیتی رہی، جبکہ ادھر عالم اسلام میں ان پر جمود و تعطل کا حملہ ہوا، اور بالآخر عالم اسلام کا ان سے رشتہ ہی ٹوٹ گیا جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ عالم اسلام کچھ اسباب و عوامل کے تحت رفتہ رفتہ اسلام سے دور ہوتا گیا، جن میں سے کچھ عوامل تو معاشرے کے اندرونی حالات سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ صلیبی اور صیہونی یورشوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ پھر چرچ جو محض بغی و سرکشی کی وجہ سے خدائی بادشاہت کی اڑے کر انسانوں پر زیادتیاں کر رہا تھا، اس کے یورپ کو دوری ہوئی تو اسی زمانے میں اس نے مسلمانوں سے اخذ کردہ اس نقطہ نظر یا ان علوم کو ان کی اسلامی اور اعتقادی بنیادوں سے کاٹ کر الگ کر دیا۔ اور پھر انہیں خدا سے بہت دور لے جا کر ہی دم لیا۔

اس طرح فکر یورپ کی ساری پیداوار — جیسا کہ ہر جگہ اور ہر دور میں جاہلیت کی پیداوار فکر کا یہی حال رہا ہے — ایک دوسری ہی چیز بن گئی جو بنیادی طور پر تصور اسلامی کی بنیادوں سے مختلف بھی ہے اور تصور اسلامی کی

فطری دشمن بھی، لہذا ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے عقیدہ و تصور کی بنیادوں کی طرف پلٹے اور انہی کو اپنا مرجع و ماخذ بنائے اگر ممکن ہو تو براہ راست کتاب الہی اور سرچشمہ ربانی سے سیراب ہو، ورنہ کسی ایسے مسلمان کو واسطہ بنائے جس کے اندر دین و تقویٰ کی وافر مقدار موجود ہو کہ اس پر وہ مکمل اعتماد کر سکے۔

وہ تمام علوم جو عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں، جو زندگی اور کائنات کا کوئی تصور پیش کرتے ہوں یا جو عادات اور روایات کے سلسلے میں کوئی نقطہ نظر دیتے ہوئے یا جو انسانی اخلاق، انسانی اقدار کی کوشش کرتے ہوں مختصر یہ کہ جو براہ راست انسان اور اس کی سرگرمیوں سے متعلق ہوں، ایسے علوم کے سلسلہ میں اس بات کو نظر انداز کر دینا کہ ان کا ماخذ کیا ہے، یہ اسلام کے لیے ایک بالکل ہی نئی چیز یا اسلامی نقطہ نظر سے انتہائی عجیب بات ہے۔

اسلام اس کی اجازت تو دیتا ہے کہ مسلمان طبیعیات اور فلکیات،

کیمیا اور طب، صنعت اور زراعت، دفتری یا انتظامی کام اور اسی طرح کی دوسری چیزیں کی غیر مسلم یا ناخدا ترس مسلم سے حاصل کرے۔ مگر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے عقیدہ و تصور کی بنیادیں، قرآن و حدیث کی تفسیریں، نبیؐ کی سیرت اور تاریخ کے اصول، حکومت کے نظام اور سیاست کے انداز، معاشرے کا دستور العمل اور فن و ادب کے محرکات اور تعبیریں وغیرہ غیر اسلامی اداروں سے حاصل کرے یا قابل اعتماد اور خداترس مسلم کا بجائے کسی اور سے سیکھے بخالص دنیاوی علوم کے سلسلے میں بھی یہ رعایت بس اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک کہ ان علوم کے لیے کوئی متقی اور خداترس مسلمان نہ ملے، جیسا کہ آج اپنے کو مسلم کہنے والے معاشرے میں ہم دیکھتے ہیں، جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے دین و مذہب اور اسلامی تصور خلافت سے دُور جا پڑے، اور خلافت ارضی کے لیے جن

مختلف علوم و فنون اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے، ان سے افسوس ناک حد تک غافل ہے۔

یہ سطرین لکھنے والا ایک ایسا شخص ہے جس نے عمر کے مکمل چالیس سال فکر و تحقیق اور ریسرچ میں گزارے ہیں۔ جن میں اس کا کام ہی تھا، تمام انسانی علوم کو کھنکالنا اور ان کا گہرا اور تحقیقی مطالعہ کرنا۔ ان میں سے کچھ علوم تو اس کے اختصاص کے تھے اور کچھ سے اسے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ پھر چالیس سال بعد جب وہ اپنے اصل سرچشمہ علم و حکمت یعنی قرآن و سنت کی طرف پلٹا تو اسے محسوس ہوا کہ اب تک اس نے جو علوم پڑھے یا سیکھے ہیں، وہ اس بے حد بے پایاں علمی اثاثہ کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہیں۔ انکی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی قد آور قوی سیکل سیربل کے مقابلے میں کچھ چھوٹے موٹے بونے۔ ظاہر ہے، اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا مگر وہ عمر کے ان چالیس سالوں پر نادم نہیں۔ کیونکہ اس نے جاہلیت کی حقیقت اچھی طرح پہچان لی۔ اس کی بے راہ روی بے لوری اور حقیقت سے دوری کا اسے اندازہ ہو گیا اس کی خود فریبیوں، بلند بانگ کھوکھلے دعوؤں اور خست آمیز شیخیوں سے وہ پوری طرح آگاہ ہو گیا اور اسے اس بات کا علم یقین حاصل ہو گیا کہ مسلمان بیک وقت ان دونوں سرچشموں کو اپنا ماخذ نہیں بنا سکتا اور جاہلیت اور ہدایت، ان دونوں کشتیوں پر سوار ہونے کی حاجت نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے جو کچھ کہا، وہ ہماری اپنی بات نہیں۔ معاملے کی نزاکت اس کی متعل نہیں کہ اس سلسلہ میں اپنے جی سے کوئی بات نہی جائے۔ . . .

خدا کی نگاہ میں یہ بات اتنی اہم ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی مسلمان اپنی رائے پر اعتماد نہیں کر سکتا ہم اس معاملے میں خدا اور اس کے رسول کے ارشاد کو حکم بناتے ہیں کہ اختلافی مسائل میں مومنین کا ہمیشہ یہی شیوہ رہا ہے۔

یہود و نصاریٰ عام طور سے مسلمانوں کے سلسلہ میں کیا ارمان اولیٰ کیا منصوبے



رکھتے ہیں، اس کی نشاندہی کرتے ہوئے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے :

وَدَكِّيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوكُمْ  
مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كَفَّارًا  
حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ  
بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا  
وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ  
إِنَّا اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

اہل کتاب میں سے بہترے اپنے دلوں کے  
حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ کسی طرح  
ایمان لانے کے بعد پھر تمہیں کافر بنا دیں،  
جبکہ حق پوری طرح واضح ہو کر ان کے سامنے  
آگیا۔ تو تم درگزر سے کام لو اور جانے دو،  
یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آجائے بلاشبہ  
اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(البقرہ ۱۰۹)

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا  
النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ  
إِنَّ هُدَىٰ اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ وَلَئِن  
اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا  
جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ  
مِنْ وَّلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝

اور نہ یہودی تم سے راضی ہو سکتے ہیں، اور  
نہ نصاریٰ، جب تک تم ان کے طریقے پر نہ  
چلنے لگو۔ کہہ دو، خدا کی ہدایت ہی ہدایت  
ہے۔ اور اگر تم اس علم کے بعد بھی جو تمھارے  
پاس آیا ہے، ان کی خواہشات پر چلے تو  
اللہ کے مقابلے میں نہ تمھارا کوئی دوست  
ہوگا نہ مددگار۔

(البقرہ ۱۲۰)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا  
فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ  
يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ ۝

ایمان والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے  
کسی گروہ کی بھی بات مان لی، تو وہ ایمان  
لے آنے کے بعد پھر تمہیں کافر بنا دیں گے۔

(آل عمران ۱۰۰)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم  
نے فرمایا:

کسی چیز کے بارے میں اہل کتاب سے نہ  
پوچھو، کہ وہ تو خود ہی گمراہ ہیں، تمہاری  
کیا رہنمائی کریں گے۔ تم یا تو غلط باتیں  
مان لو گے، یا حق باتوں کو بھٹلا دو گے  
بخدا اگر موسیٰ تمہارے درمیان زندہ  
ہوتے تو ان کے لیے بھی جائز نہ ہوتا مگر  
یہ کہ وہ میری پیروی کریں۔

لَا تَسْأَلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ عَنْ شَيْءٍ  
فَإِنَّهُمْ لَنْ يَهْدُواكُمْ وَقَدْ ضَلُّوا  
وَإِنَّكُمْ أُمَّةٌ أَمَّا أَنْ تَصَدِّقُوا بِبِطَالٍ  
وَإِنَّمَا أَنْ تَكْذِبُوا بِحَقِّ وَإِنَّ  
وَاللَّهِ لَو كَانَ مُوسَىٰ حَيًّا بَيِّنًا  
أَظْهَرَكُمْ مَا حَلَّ لَكُمْ إِلَّا أَنْ  
يَتَّبِعَنِي (رواه ابو یعلیٰ)

اس قدر واضح انداز میں یہود و نصاریٰ کے ارمانوں کی نشان دہی ہو جانے  
کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور قائم کرنا کتنی سادہ لوحی ہو گی کہ وہ اسلامی عقیدہ  
یا اسلامی تاریخ یا مسلم معاشرے کی سیاست و معیشت سے تعلق رکھنے والے  
مسائل میں اپنی نیتیں درست رکھ سکیں گے، یا راست روی اور انصاف پسندی کی  
روش اپنا سکیں۔ جو لوگ خدا کی طرف سے آئی ہوئی ان واضح تبینہات کے بعد  
بھی ان سے یہ اُمید قائم رکھتے ہیں۔ وہ کس قدر غفلت و مدہوشی میں ہیں؟

پھر وہ کون سا ماخذ ہو گا جس کی طرف ایک مسلمان کو رجوع کرنا ہو گا۔؟  
ارشاد الہی "قُلْ إِنَّ هُدَىٰ اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ" (کہہ دو: خدا کی ہدایت  
ہی ہدایت ہے۔) سے اس کی بھی تعین ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہدایت الہی کے سوا  
جو کچھ ہے، ضلالت و گمراہی ہے۔ ہدایت الہی کے علاوہ اور کہیں ہدایت کا نام  
نہیں۔ "قُلْ إِنَّ هُدَىٰ اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ" تاکید اور حصر کا انداز ہے، جس سے  
یہی تبنیہ مقصود ہے لہذا آیت کے اس مفہوم میں شک کی گنجائش نہیں، نہ  
تبادل کا ہی کوئی امکان ہے!

اب جو لوگ ذکر الہی سے روگردانی کریں، اور ساری توجہات اسی دُنیا

پر مرکوز کر دیں، ایسوں کے ساتھ ہمارا کیا رویہ ہو؟ آیات الہی کہتی ہیں کہ ان سے قطعی طور پر اعراض کیا جائے کیونکہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہم و گمان ہے۔ اور مسلم کو وہم و گمان کی پیروی سے منع کیا گیا ہے۔ ان کی نگاہ دنیوی زندگی کی ظاہری رنگینوں تک ہی محدود ہے، اس لیے وہ صحیح علم و بصیرت سے محروم ہیں۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا  
وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا  
ذَلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ  
إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ  
عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ  
اهْتَدَىٰ۔

تو تم ایسے لوگوں سے کنارہ کش رہو جو ہمارے  
ذکر سے روگرداں ہیں، اور جن کا نصب العین  
حیاتِ دنیا کے سوا کچھ نہیں، ان کے علم کی  
رسائی یہیں تک ہے۔ بلاشبہ تمہارا رب  
اس شخص سے خوب واقف ہے جو اس کی راہ  
سے بھٹک گیا۔ اور اس سے بھی خوب واقف  
ہے جس نے سیدھی راہ اپنائی۔

(النجم ۱۹-۲۰)

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ  
الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ  
غٰفِلُونَ ۝ (الروم ۷)

”وہ دنیوی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے  
ہیں، اور آخرت میں وہی غافل  
ہیں“

جو ذکیر الہی سے غافل اور دنیا کی شادابیوں پر ہی فریفتہ ہو۔

جیسا کہ آج کے ”اربابِ علم و دانش“ کا حال ہے۔ اس کو بس ظاہر کا چینی  
علم ہو سکتا ہے۔ اور یہ وہ ”علم“ نہیں جس کی بنیاد پر ایک مسلم کسی پر اعتماد کر سکتا اور اپنی تمام  
مشکلات میں اس کی طرف رجوع کر سکتا ہو۔ ایسے لوگوں کے سلسلہ میں تو بس اسی  
حد تک گنجائش ہے کہ ان کے مادی علوم سے فائدہ اٹھایا جائے، نہ کہ زندگی اور  
روح کی عام تشریح اور ان سے تعلق رکھنے والے عقائد و نظریات ان سے معلوم  
کیے جائیں۔ یاد رہے یہ وہ علم ہرگز نہیں، جس کی طرف قرآنی آیتیں بار بار مدح و

توصیف کے پیرائے میں اشارے کرتی ہیں، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے :  
 هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ  
 وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝  
 کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہوں  
 اور وہ جو علم سے بے بہرہ ہوں؟

ظاہر ہے یہاں علم سے مراد یہ علم ظاہر یا علم دنیا نہیں، جیسا کہ ان لوگوں کا  
 گمان ہے جو قرآنی آیات کو سیاق سے الگ کر کے موقع بے موقع ان سے استدلال کے  
 عادی ہیں۔ یہ سوال جس آیت میں ہے، وہ پوری آیت ملاحظہ ہو:

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ  
 سَاجِدًا وَ قَائِمًا يُحَدِّثُ  
 الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةً  
 رَبِّهِ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي  
 الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ  
 لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا  
 يَتَذَكَّرُ أُولَٰئِكَ  
 الْآلِبَابِ ۝ (الزمر ۹)

جو رات کی گھڑیوں میں عبادت میں مصروف  
 رہتا ہے، کبھی سجدہ ریز ہوتا ہے کبھی قیام  
 کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا بھی ہے۔ اپنے  
 رب کی رحمتوں کی امید بھی رکھتا ہے کیا  
 (وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو خدا سے  
 غافل اور آخرت کا منکر ہو؟) کہو: کیا برابر  
 ہو سکتے ہیں وہ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو  
 علم سے بے بہرہ ہیں؟ تذکر تو عقل والے ہی  
 حاصل کرتے ہیں۔

جو شخص راتوں کو عبادت الہی میں مصروف رہتا ہو، کبھی قیام کی حالت میں دعا  
 و مناجات میں مشغول ہو تو کبھی سجدے میں پڑا آہ و زاریاں کرتا ہو، تصورِ آخرت  
 سے لرزاں بھی ہو اور رحمت الہی کا امیدوار بھی۔ یہی وہ شخص ہے جس کے پاس  
 علم ہے، اور حقیقت میں یہی علم ہے۔ آیت الہی میں جس علم کا ذکر ہے اس سے مراد  
 وہی علم ہے جو بندے کو خدا مست و خدا ترس بنا دے، نہ کہ فطرت کو مسخ کر کے  
 ملحد اور وہرہ بنا دے۔

علم سے مراد صرف وہ عقائد و فرائض اور شرائع و احکام کا ہی علم نہیں کہ علم کی دنیا تو بہت وسیع ہے۔ قوانین فطرت (PHYSICAL LAWS) کو دریافت کرنا اور خلافتِ ارضی کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں ان سے مدد لینا بھی بالکل اسی طرح علم میں داخل ہے جس طرح عقائد و فرائض اور شرائع و احکام داخل ہیں۔ البتہ اگر کسی علم کا رشتہ ایمان سے ٹوٹ جائے تو اسے وہ علم نہیں کہا جاسکتا جس کی طرف قرآن پاک اشارے کرتا اور جس سے متصف لوگوں کی تعریفیں کرتا ہے۔ فلکیات (ASTRONOMY) طبیعیات (PHYSICS) علم الحیوة (BIOLOGY) کیمیا (CHEMISTRY) طبقات الارض (GEOLOGY) اور نوائس کائنات و قوانین حیات سے تعلق رکھنے والے سارے علوم کا ایمان سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ سارے علوم اللہ تعالیٰ سے ملانے والے ہیں۔ بشرطیکہ مہلے آوارہ کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہیں۔ اور وہ ان میں خدا بیزاری کا زہر نہ گھول دے جیسا کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں دیکھا کہ وہاں بھی دردناک صورت حال پیش آئی علمی طبقے اور ظالم اہل چرچ کے درمیان نہایت شدید اختلافات ہوئے۔ جس کے نتیجے میں وہاں کی علمی تحریک سخت خدا بیزاری کی راہ پر چل پڑی اور پھر اس نے یورپ کے مزاج اور وہاں کے تمام ہی فکری سرمایہ پر انتہائی گہرے نقش چھوڑے اس نے ان تمام افکار میں جو ذہن یورپ کی پیداوار ہیں۔ نہ صرف چرچ اور چرچ کے خلاف بلکہ جملہ دینی و مذہبی تصورات کے خلاف شدید نفرت و عداوت کے زہریلے جذبات گھول دیئے۔ حتیٰ کہ علم کا کوئی شعبہ ان مہلک اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خواہ مابعد الطبیعیاتی (METAPHYSICAL) فلسفے ہوں یا خالص سائنسی یا مجرد علمی و فنی تحقیقات، جن کا بظاہر موضوع دین سے کوئی علاقہ نہیں!

جب یہ بات طے ہو گئی کہ مغرب کے تمام ہی فکری اصول اور اس فکر سے پیدا ہونے والے تمام علوم روزِ اول سے ہی جملہ مذہبی تصورات کے خلاف شدید نفرت و

عداوت کی بنیاد پر قائم ہوئے ہیں، تو پھر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ فکری اصول اور یہ علوم براہ راست تصورِ اسلامی کے دشمن ہیں۔ اس دشمنی کے مظاہرے برابر ہوتے رہتے ہیں وہ آٹے دن زور لگاتے ہیں کہ دینی عقائد و تصورات اور اسلامی اقدار کو خس و خاشاک کی طرح بہادیں اور وہ تمام بنیادیں منہدم کر دیں جو مسلم معاشرے کو اپنی تمام چیزوں میں ممتاز کرتی ہیں۔

اس طرح یہ بات بڑی خطرناک ہوگی کہ اسلامی تحقیقات کے سلسلہ میں مغرب کے فکری اصولوں اور اس کے علمی سرمایہ پر مکمل اعتماد کر لیا جائے۔ دنیاوی علوم جن کے سلسلہ میں ہم فی الحال مغرب کی خوشہ چینی پر مجبور ہیں، ان کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی ہمیں ہر طرح چوکنا رہنا ہوگا، کہ ان کی تہ میں کون سے فلسفیانہ اصول و افکار کار فرما ہیں۔ کیونکہ یہ اصول و افکار بنیادی طور پر جملہ مذہبی تصورات بالخصوص تصورِ اسلامی کے دشمن ہیں، اور ان کی ذرا سی مقدار بھی صاف شفاف چشمہٴ اسلام کو مسموم کر دینے کے لیے کافی ہے۔

اسلام نے جس روز انسانیت کو نبی انسانی قدریں اور نئے پیمانے عطا کیے، ٹھیک اسی دن اس نے تعلقات و روابط اور باہمی رشتوں کی بابت بھی ایک بالکل ہی نیا تصور عطا کیا۔

وہ آیات کہ انسان کو اس کے رب سے پھر جوڑ دے اور اسی کو انسانی قدروں اور رد و قبول کے پیمانوں کا سرچشمہ قرار دے کیونکہ وہی اس کے وجود اور اس کی زندگی کا سرچشمہ ہے اسی طرح انسانی تعلقات و روابط کی اصل بھی اسی کو ٹھہرائے کہ اسی کے ارادہ و مشیت سے وہ پیدا ہوا اور اسی کی طرف اسے پلٹنا ہے۔

وہ آیا، تاکہ یہ ذہن نشین کر لے کہ ایک ہی خدائی رشتہ ہے جو انہیں باہم  
 وگر جوڑتا ہے، اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو پھر نہ کوئی قرابت ہے نہ رشتہ مجتہد۔  
 لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ  
 وَاليَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ  
 حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا  
 آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ  
 أَوْ عَشِيرَتَهُمْ۔ (المجادلہ ۲۲)

جو لوگ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں  
 ان کو تم کبھی نہ پاؤ گے کہ وہ ایسے لوگوں سے  
 دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے رسول  
 کے دشمن ہیں، چاہے وہ ان کے باپ یا بیٹے  
 یا بھائی یا گھرانے کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔

(۲) ایک ہی جماعت ہے جو خدا کی ہے، اور وہ متعدد نہیں ہو سکتی، اور بقیہ ساری جماعتیں شیطانی اور طاغوتی ہیں:

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا

جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، اور جنہوں نے کفر کیا وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں، تو تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو۔ بلاشبہ شیطان کی چال بہت پھس پھسی ہے۔

(النساء ۷۶)

۳۔ ایک ہی راستہ ہے جو خدا کی طرف جاتا ہے، اور بقیہ راستے اس تک نہیں پہنچاتے:

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ

اور یہ کہ یہ میرا راستہ ہے، بالکل سیدھا لہذا تم اسی پر چلو، اور دوسرے راستوں پر نہ چلو، کہ وہ تمہیں اس کے راستے سے ہٹا کر مختلف راہوں پر ڈال دے۔

(الانعام ۱۵۱)

۴۔ ایک ہی نظام ہے جو اسلامی نظام ہے، اور بقیہ نظام جاہلیت ہیں:

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنْ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ

کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ سے اچھا فیصلہ کرنا والا کون ہو سکتا ہے؟

(المائدہ ۵۰)

۵۔ ایک ہی قانون ہے جو خدائی قانون ہے، اور بقیہ قوانین ہوا و نفسانیت ہیں:

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّن

پھر دین کے سلسلہ میں ہم نے تمہیں ایک واضح



راستہ پر لگا دیا ہے، تو تم اسی راہ پر چلو،  
ان لوگوں کی خواہشات پر کبھی نہ چلنا جو  
علم سے بے بہرہ ہیں۔

الْأَمْرُ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ  
الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

(المجادلہ ۱۸)

۶۔ ایک ہی حق ہے جو متعدد نہیں ہو سکتا اور اس کے ماسوا جو کچھ ہے  
ضلالت و گمراہی ہے۔

فَمَاذَا بَعَدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ؟  
فَأَنَّى تُصْرَفُونَ؟ (یونس ۳۲)

۷۔ ایک ہی خطہ ہے جو دارالاسلام ہے۔ اور یہ وہ خطہ ہے جہاں اسلامی حکومت  
کا قیام خدائی شریعت کا نفاذ اور حدود اللہ کی حکمرانی ہو، جہاں ایک مسلمان دوسرے  
مسلمان کا رفیق و ہمدرد اور غم خوار و غم گسار ہو۔ اس کے علاوہ جو علاقہ بھی ہو، وہ  
دارالحرب ہو گا جس سے مسلمان یا تو جنگ کرے گا یا عہد امان کی بنیاد پر صلح،  
مگر وہ دارالاسلام نہ ہو گا نہ وہاں کے باشندوں سے مسلمانوں کا کوئی رشتہ و تعلق  
ہو گا،

بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی  
اور راہِ خدا میں اپنی جان اور اپنے مال سے  
جہاد کیا۔ اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے  
والوں کو) جگموسی اور (ان کی) مدد کی وہی  
دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ اور جو  
لوگ ایمان تولے آئے مگر ہجرت نہیں کی تو  
ان سے تمہارا ولایت کا کوئی رشتہ نہیں،  
جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں، لیکن اگر وہ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا  
جَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ  
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوُوا  
وَنَصَرُوا أُولَئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ  
بَعْضٍ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ  
يُهَاجِرُوا أَمْوَالُكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ  
مِنْ شَيْءٍ حَتَّى يُهَاجِرُوا وَإِذَا  
اسْتَضَرُّوكُمْ فِي الدِّينِ فَوَلِّوهُمْ

التَّصَرُّفَ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ  
 وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ وَاللَّهُ بِمَا  
 تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَالَّذِينَ  
 كَفَرُوا ابْغَضْتَهُمْ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ  
 إِلَّا تَفَعَّلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي  
 الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۝ وَالَّذِينَ  
 آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا  
 فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوُوا  
 وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ  
 حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ  
 كَرِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن  
 بَعْدِ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا  
 مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ -

(الأنفال ۷۲ - ۷۵)

دین کے معاملے میں تم سے مدد چاہیں تو مدد  
 کرنا تم پر فرض ہے، مگر کسی ایسی قوم کے  
 مقابلے میں نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو  
 اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے  
 اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایک دوسرے  
 کی حمایت کرتے ہیں، اگر تم ایسا نہیں کرتے  
 تو زمین میں بڑا فتنہ و فساد ہوگا اور جو لوگ  
 ایمان لائے اور ہجرت کی، اور اللہ کی  
 راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (انہیں)  
 جگہ دی اور ان کی مدد کی درحقیقت  
 ایسے ہی لوگ مومن ہیں۔ ان کے لیے خطاؤں  
 سے درگزر اور بہترین رزق ہے اور جو لوگ  
 بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے  
 ساتھ ہو کر جہاد کیا تو وہ بھی تم میں شامل ہیں۔

اسلام ہی پیام لیکر آیا۔ وہ آیا، تاکہ انسان کو اونچا اٹھائے، اسے  
 خاک و خون اور قوم و وطن کی بیڑیوں سے آزاد کرے۔ چنانچہ مسلم کا وطن صرف  
 وہ خطہ ہے۔ جہاں شریعتِ الہی کا قیام ہو، اس کی قومیت بس وہ عقیدہ ہے  
 جو اسے "دارالاسلام" میں "امت مسلمہ" کا ایک فرد قرار دے۔ اور اس کی  
 قرابت صرف وہ رشتہ ہے جو عقیدہ الہی کے تنے سے پھوٹے۔ پھر یہی قرابت ہوگی  
 جو اس کے اور اہل و عیال کے درمیان خدا کی بنیاد پر رشتہ قائم کرے گی۔

مسلم کے لیے باپ، باپ نہیں، ماں، ماں نہیں، بھائی بھائی نہیں، بیوی

بیوی نہیں، اور خاندان خاندان نہیں، جب تک یہ پہلا رشتہ — — —  
خدا کی رشتہ قائم نہ ہو، کہ یہی رشتہ پھر رجمی رشتے سے جڑے گا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ  
الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَآ  
حَدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا  
وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً  
وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ  
بِهِ وَالْآرْحَامِ -

لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تمہیں  
ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی سے  
اس کا جوڑا بنایا۔ پھر ان دونوں سے  
بہت سے مرد، عورت پھیلا دیئے اور  
خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک  
دوسرے سے (اپنے حقوق) مانگتے ہو اور

رشتوں کا پاس و لحاظ رکھو۔

(النساء - ۱)

مگر اختلاف عقیدہ کے باوجود والدین کے ساتھ حسن سلوک میں کوئی فرق  
نہ آئے گا، بشرطیکہ وہ خود اسلام کے مقابلے میں صف آرا نہ ہوں، ورنہ پھر تو  
کوئی رشتہ اور کوئی تعلق نہ رہے گا۔ منافقین کے سرغنہ عبد اللہ بن ابی کے بیٹے  
حضرت عبد اللہؓ اس حقیقت کی نہایت روشن مثال ہیں:

ابن زیاد سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن  
ابی کے بیٹے عبد اللہؓ کو بلا کر فرمایا: دیکھتے نہیں تمہارے باپ کیا کہہ رہے ہیں؟  
انہوں نے عرض کیا: کیا کہہ رہا ہے میرا باپ؟ میرے ماں باپ آپ پر فدا! آپ  
نے فرمایا: وہ کہہ رہے ہیں، اگر ہم مدینہ لوٹے تو طاقتور ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔

انہوں نے عرض کیا: اس نے سچ کہا، اے اللہ کے رسول! بندگان اطاعت و عزت  
کے مالک تو آپ ہی ہیں، اور ذلیل وہ ہے۔ خدا گواہ ہے اے اللہ کے رسول! اور  
اہل شہر کو بھی معلوم ہے کہ جس وقت آپ مدینہ تشریف لائے، یہاں مجھ سے زیادہ  
اپنے باپ کا وفادار اور طاعت گزار کوئی نہ تھا لیکن اگر خدا اور رسول کہیں تو

ابھی اس کا سر حاضر کر دوں۔ ارشاد ہوا ”نہیں“ پھر لوگ مدینہ لوٹے تو حضرت  
 عبد اللہ رضی اللہ عنہ تلوار سونت کر گھر کے دروازے پر کھڑے ہو گئے اور باپ سے کہا: تجھ  
 ہی نے کہا ہے، اگر ہم مدینہ لوٹے تو طاقتور ذلیل کو نکال باہر کرے گا؟ خدا ابھی  
 معلوم ہوا جاتا ہے کہ عزت و قوت تیرے لیے ہے یا رسول خدا کے لیے؟ خدا  
 اس گھر کا سایہ تجھ پر پڑ نہیں سکتا، تو قیامت تک اس میں قدم نہیں رکھ سکتا،  
 جب تک خدا اور رسول کا اذن نہ ہو اس نے قوم کی دہائی دی۔ خنزرج کے لوگو! یہ لڑکا مجھے  
 گھر میں داخل ہونے نہیں دیتا۔ خنزرج کے لوگو! یہ لڑکا مجھے گھر میں جانے سے روکتا ہے۔ عبد اللہ  
 نے کہا: بخدا تو اندر قدم نہیں رکھ سکتا جب تک آپ کا اذن نہ ہو۔ اتنے میں بہت لوگ جمع ہو گئے اور  
 سب نے منانے کی کوشش کی۔ مگر وہ برابر یہی کہتے رہے: بخدا وہ اندر جا نہیں  
 سکتا، جب تک خدا اور رسول خدا کا اذن نہ ہو۔ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 وسلم کے پاس آئے، اور آپ کو صورت حال کی اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا:  
 ”جاؤ کہہ دو: گھر میں جانے دیں“ لوگ رسول خدا کا اذن لیکر پہنچے تو ان کی زبان  
 سے یہ الفاظ سنے گئے: اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے تو وہ سر آنکھوں پر۔  
 اور جب عقیدے کا رشتہ قائم ہو گیا، تو سارے مومن بھائی بھائی ہیں، چاہے  
 نبی اعتبار سے ان کے درمیان کوئی رشتہ نہ ہو، کوئی نسلی اور خوئی قرابت نہ ہو۔  
 اَلْمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ۔ (مومنین تو بھائی بھائی ہیں) حضر اور تاکید کا  
 انداز ہے۔

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور  
 راہ خدا میں اپنی جان اور اپنے مال سے  
 جہاد کیا۔ اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے  
 والوں کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی وہی

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هٰجَرُوْا  
 وَ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ  
 فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا  
 وَ نَصَرُوْا اَوْلِيَّكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ

در اصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

پھر یہ رشتہ و تعلق ایک ہی نسل میں محدود نہیں رہتا، یہ بعد کی نسلوں میں بھی منتقل ہوتا ہے۔ یہ امت کے پہلے فرد کو آخری فرد سے، اور آخری کو پہلے سے انتہائی گہری الفت و محبت اور شفقت و ہمدردی کے سنہری تاروں سے جوڑ دیتا ہے:

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ  
مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ  
هَاجَدَ إِلَيْهِمْ وَلَا  
يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ  
حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا  
وَيُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ  
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ  
وَمَنْ يُؤْتِكْ شَيْخًا نَفْسِيهِ  
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝  
وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ  
يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا  
وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا  
بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي  
قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا  
رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ ۝

اور جو لوگ ان سے پہلے سے اس گھر  
(مدینہ) میں بسے ہوئے ہیں اور ایمان رکھتے  
ہیں، جو ہجرت کر کے ان کے یہاں آئیں  
ان سے محبت کرتے ہیں اور اپنے دلوں میں  
اس سے کوئی غرض نہیں پاتے، جو انہیں  
دیا جائے اور انہیں اپنے سے مقدم  
رکھتے ہیں چاہے انہیں محتاجی ہی کیوں  
نہ ہو، اور جو لوگ اپنے نفس کی طمع سے  
بچے رہے وہی فلاح یاب ہیں۔ اور جو ان کے  
بعد آئے، کہتے ہیں: ہمارے رب بخش دے  
ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ایمان  
کی بدولت ہم سے آگے نکل گئے اور  
ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں  
ہمارے دلوں میں کینہ کو جبکہ نہ دے۔ ہمارے  
رب! بیشک تو شفقت کرنے والا اور  
مہربان ہے۔

مثالی حیثیت سے اللہ تعالیٰ انبیائے کرام کے اس معزز کنبے کو پیش کرتا ہے جس کے افراد مختلف زمانوں میں قافلہ ایمان میں آ کر ملتے رہے، کہ ان کی ساری وابستگی عقیدے سے تھی، عقیدہ ہی ان کے تمام تعلقات کی بنیاد اور سارے رشتوں کی اساس تھا۔

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا: اے رب! میرا بیٹا بھی تو میرے گھر والوں میں سے ہے۔ اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے، اور تو ہی سب سے بڑا احاکم ہے (خدا نے) فرمایا: اے نوح! وہ تمہارے گھر والوں میں سے نہیں، یہ تو غلط کام ہے، تم ایسی چیز کا مجھ سے سوال نہ کرو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ (نوح نے کہا): میرے رب! میں پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں تجھ سے ایسی چیز کا سوال کروں، جس کا مجھے کوئی علم نہیں اور اگر تو نے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا، تو میں برباد ہو جاؤں گا۔

اور یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ ان میں پورا اُترا۔ فرمایا: میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے

وَنَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحَكِيمِينَ ۝ قَالَ نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعْظُكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُنْ مِنَ الْخَاسِرِينَ (سودہ ۴۵-۴۷)

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ فَقَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا

والا ہوں، اُس نے عرض کیا، اور میری  
اولاد میں سے بھی؟ فرمایا: میرے وعدے  
میں ظالم شامل نہیں ہیں۔

اور یاد کرو، جب ابراہیمؑ نے کہا: میرے  
رب! اس کو پرامن شہر بنا دے اور اس کے  
باشندوں کو پھلوں کا رزق دے۔ ان کو  
جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھیں۔  
(رب نے) فرمایا: جو کوئی کفر کرے گا،  
تھوڑا بہرہ مند تو اسے بھی کروں گا۔ پھر  
اسے عذابِ جہنم کی طرف گھسیٹوں گا۔  
اور وہ بدترین ٹھکانہ ہے۔

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي؟ قَالَ لَا  
يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ -

(البقرہ ۱۲۴)

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ  
هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ  
أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ  
مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ط  
قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمْتِعْهُ قَلِيلًا  
ثُمَّ أَصْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ  
وَيُؤْسَ الْمَصِيرِ ۝

(البقرہ ۲۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب دیکھتے ہیں کہ باپ اور دوسرے اعزہ و

اقربا گمراہی پر مصر میں تو وہ ان سب کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں:

اور میں آپ لوگوں کو چھوڑتا ہوں، اور  
انہیں بھی جنہیں آپ لوگ اللہ کے سوا  
پکارتے ہیں۔ میں اپنے رب کو پکاروں گا  
امید ہے اپنے رب کو پکار کر بے نصیب نہیں  
رہوں گا۔

وَاعْتَزِلْكُمْ وَمَا تَدْعُونَ  
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَادْعُوا رَبِّي  
عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي  
شَقِيًّا ۝

(ہریم ۲۸)

اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی قوم کا وہ کردار بھی پیش کرتا ہے۔

جو ایک قابلِ اتباع اور مثالی کردار ہے۔

تمہارے لیے ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

میں ایک عمدہ اور قابل تعلیم نونہ ہے جبکہ انہوں نے قوم سے کہا: ہم تم سے الگ ہیں اللہ کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو ان سے بھی الگ ہیں۔ ہم تمہیں نہیں مانتے اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے بغض و عداوت ہے جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

فِي اِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ اِذَا  
قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ  
وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ  
كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ  
الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى  
تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ -

(الممتحنہ ۴)

اصحاب کہف کے لیے جب یہ بات ممکن نہیں رہ جاتی کہ وہ گھر، خاندان اور وطن میں رہتے ہوئے خالص خدا کی بندگی کر سکیں، اور عقیدہ و ایمان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے، تو وہ گھر، خاندان اور وطن سب کو خیر باد کہہ کر اپنے رب کی پناہ میں آجاتے ہیں۔

وہ کچھ جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے، انہیں ہم نے اور زیادہ ہدایت دی، ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا، جب وہ اٹھے اور انہوں نے کہا: ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اس کے علاوہ کوئی اللہ نہ پکاریں گے (کیونکہ) اس وقت تو ہم بہت زیادتی کی بات کریں گے۔ یہ ہماری قوم نے تو اس کے علاوہ دوسرے بہت سے اللہ بنا لیے ہیں۔ یہ ان کے حق میں کوئی واضح سند کیوں نہیں لاتے! پھر

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ  
وَزِدْنَا لَهُمْ هُدٰى وَرَبَطْنَا  
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا  
رَبَّنَا رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ  
لَنْ نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اِلٰهًا  
لَقَدْ قُلْنَا اِذَا شَطَطًا هُوَ اَوْ  
قَوْمًا نَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اِلٰهَةً  
لَوْ لَا يَأْتُوْنَ عَلٰیهِمْ  
بِطٰنٍ بَیِّنٍ اَمِنْ اَظْلَمَ مِنْ  
اَفْتَرٰى عَلٰى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ وَ



اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ گڑھے ؟ اور جب کہ تم ان سے اور اللہ کے سوا جس کی یہ عبادت کرتے ہیں، اس سے کنارہ کش ہو گئے ہو تو غار میں چل کر پناہ لو، تمہارا رب تمہیں رحمت کی چادر اڑھا دے گا۔ اور تمہارے لیے ہر طرح کی آسانیاں مہیا کرے گا۔

إِذَا عَزَلْتُمْوَهُمْ وَمَا  
يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأَوْا  
إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْكُمْ رَبُّكُمْ  
مِنْ رَحْمَتِهِ وَيَهَيِّئْ لَكُمْ  
مِنْ أَمْرِكُمْ مَخْرَجًا

(الکہف ۱۲-۱۶)

اور جب عقیدے میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ تو حضرت نوح اور حضرت لوط

علیہما السلام سے ان کی بیویاں الگ کر دی جاتی ہیں۔

اللہ کفر کرنے والوں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کو مثال میں پیش کرتا ہے دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے زیر نکاح تھیں، دونوں نے ان کے ساتھ خیانت کی تو وہ اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ کام نہ آئے، اور کہا گیا: تم دونوں داخل ہو جاؤ آگ میں، داخل ہونے والوں کے ساتھ۔

صَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا  
أَمْرًا آةَ نُوحٍ وَآةَ لُوطٍ  
إِذْ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ  
عِبَادَتِ صَالِحِينَ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ  
يَغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا  
وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِينَ

(التحدیم ۱۰)

اور دوسری طرف فرعون کی بیوی کی مثال ہے:

اور اللہ ایمان لانے والوں کے لیے فرعون کی بیوی کو بطور مثال پیش کرتا ہے جب کہ اس نے کہا: میرے رب! میرے لیے اپنے

وَصَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا  
أَمْرًا فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ  
ابْنِي لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ

وَنَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ . پاس جنت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون  
وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ . اور اس کے عمل سے چھٹکارا دے . اور  
(التحریم ۱۱) چھٹکارا دے مجھے ظالم لوگوں سے .

اس طرح متعدد مثالیں ہیں، جو ہر رشتے سے تعلق رکھتی ہیں۔ قصہ نوح  
میں باپ کا رشتہ ہے، قصہ ابراہیم میں بیٹے اور وطن کا رشتہ ہے، قصہ اسماعیل  
کہف میں وطن، خاندان اور گھر، سبھی کا رشتہ ہے، اور نوح و لوط علیہما السلام  
کی بیویوں اور فرعون کی بیوی کے قصوں میں زوجیت کا رشتہ ہے۔

اس طرح باہمی تعلق اور روابط اور باہمی شتوں کی حقیقت کا یہ تصور رکھتے ہوئے یہ نیک  
قافہ گزر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خیر امت کا دور آتا ہے۔ وہ امت اپنے سامنے  
ایسی مثالوں، ایسے نمونوں اور ایسے واقعات کا ایک انبار پاتی ہے، اور پھر وہ بھی  
اسی نہج پر گامزن ہو جاتی ہے، جو اللہ نے اہل ایمان کے لیے تجویز فرمایا ہے چنانچہ  
جو نہی عقیدے میں اختلاف ہوتا ہے، اور جیسے ہی یہ پہلا رشتہ ٹوٹتا ہے، ایک ہی گھر  
اور ایک ہی خاندان میں باہم جدائی پڑ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کی یہ کیفیت  
یوں بیان فرمائی ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ  
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ  
حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا  
آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ  
إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ  
أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ  
الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ

جو لوگ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے  
ہیں ان کو تم کبھی نہ پاؤ گے کہ وہ ایسے لوگوں  
سے دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے  
رسول کے دشمن ہیں، چاہے وہ ان کے  
باپ یا بیٹے یا بھائی یا گھرانے کے لوگ ہی  
کیوں نہ ہوں، وہی لوگ ہیں جن کے دل نہیں  
اس نے ایمان کو نقش کر دیا ہے، اور اپنے

لطف خاص سے انہیں طاقتور بنایا ہے  
 وہ انہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا  
 جن کے نیچے سے نہریں رواں ہوں گی، جہاں  
 وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی وہ  
 اللہ سے راضی۔ یہ اللہ کی پارٹی ہیں بن لو  
 اللہ کی پارٹی ہی فلاح سے ہمکنار ہونے  
 والی ہے۔

وَيَدْخُلُهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ  
 تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا  
 رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا  
 عَنْهُ أُولَئِكَ حِزْبُ اللَّهِ  
 أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ  
 هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝  
 (المجادلة آیت ۲۲)

اور جب محمد — صلی اللہ علیہ وسلم — آپ کے چچا ابو لہب اور چچا  
 زاد بھائی عمرو بن ہشام (ابو جہل) کے درمیان قرابت کا رشتہ پارہ پارہ ہو جاتا  
 ہے، جب ہاجرین میدان بدر میں اپنے اہل و عیال اور اعزہ و اقرباء کے مقابلہ میں  
 صف بستہ ہو جاتے ہیں، اور جب ان کے خون سے وہ اپنے ہاتھ رنگین کر لیتے ہیں،  
 عین اس وقت ہاجرین و انصار کے درمیان عقیدے کا رشتہ قائم ہوتا ہے  
 اور اب وہ بھائی بھائی ہو جاتے ہیں۔ عرب مسلمانوں اور ان کے بھائیوں صہیب  
 رومی، بلال حبشی، سلمان فارسی کے درمیان بھی یہ رشتہ قائم ہوتا ہے، اور نسل  
 و وطن اور قبیلے کی عصبیت لاپتہ ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 ارشاد فرماتے ہیں:

دَعْوَاهَا فَإِنَّهَا مَنَّتُهُ  
 اُسے چھوڑ دو کہ یہ بدبودار ہے۔

اسی طرح کسی اور موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

لَيْسَ مِنْكُمْ دَعَا إِلَىٰ عَصِيَّةٍ  
 وَآيَةٍ سَأَسْأَلُ نَسِيَّ عَصِيَّةٍ  
 دَلَيْسَ مِنْكُمْ مَاتَ عَلَىٰ عَصِيَّةٍ  
 جو عصبیت کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں  
 جو عصبیت پر جنگ کرے وہ ہم میں سے نہیں  
 جو عصبیت پر مرے وہ ہم میں سے نہیں۔

چنانچہ عصیبت نسب کی بدبو ختم ہو گئی۔ نسلی غرور کا جنازہ اٹھ گیا۔ قومیت کی آلودگی لاپتہ ہو گئی۔ اور انسان خاک و خون کی بدبو اور نسل و وطن کی آلودگی سے دور، بہت دور، انتہائی بلندیوں میں سانس لینے لگا۔ اس روز سے مسلم کا وطن کوئی سرزمین نہ رہی، اس کا وطن ”دارالاسلام“ ہو گیا، وہ خطہ جہاں صرف عقیدہ اسلامی کا غلبہ اور شریعت الہی کی حکمرانی ہوگی۔ وہ خطہ جس میں وہ رہے گا، جان و دل سے اس کا دفاع کرے گا، اور اس کی حمایت و توسیع کیلئے جام شہادت بھی نوش کرے گا۔ اور یہ ”دارالاسلام“ ہر اس فرد کے لیے ہوگا جو عقیدہ اسلامی کو اپنا کر شریعت الہی کی پابندی کرے یا شریعت اسلامی کو اپنا نظام تسلیم کرے۔ اگرچہ عقیدہ اسلامی سے بے تعلق رہے، جیسے وہ اہل کتاب جو ”دارالاسلام“ میں رہیں۔ وہ سرزمین جہاں اسلام کا اقتدار اور شریعت الہی کی حکمرانی نہ ہو تو وہ ”دارالحرب“ ہے۔ مسلمان کے لیے بھی اور اس ذمی کے لیے بھی جس کا مسلمانوں سے معاہدہ ہو۔ مسلمان اس سے جنگ کرے گا، اگرچہ وہ اس کا مرزوم ہو، اگرچہ وہاں اس کی رشتہ داریاں اور قرابتیں ہوں، اگرچہ وہاں اس کی جاگیریں اور دولت کے خزانے ہوں۔

چنانچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے جنگ کی، حالانکہ یہ آپ کا پیدائشی وطن تھا، یہیں آپ کا پورا خاندان تھا، آپ کے ساتھیوں کے گھر تھے، ساتھیوں کی بہت سی زمینیں اور جاگیریں تھیں۔ ہاں یہ سب کچھ تھا، مگر وہ دارالاسلام اسی وقت بنا جب اسلام کے زیر نگیں ہو گیا، اور شریعت الہی وہاں پوری طرح نافذ ہو گئی۔

یہ ہے اسلام، ہاں صرف یہ ہے اسلام۔ اسلام کوئی لفظ نہیں ہے جو زبان سے ادا کر دیا جائے، نہ کوئی خطہ زمین ہے جس پر اسلامی پوسٹر چسپاں ہو یا اسلامی

سائن بورڈ آویزاں ہو!

تو نہیں اے محمد! تمہارے رب کی قسم ایہ کبھی  
مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے درمیان  
اٹھنے والے اختلافات میں تم کو حکم نہ بنائیں  
پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر دلوں میں کوئی تنگی  
نہ محسوس کریں اور بالکل اپنے آپ کو حوالہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى  
يُحْكَمُوا لَكَ فِيمَا شَجَدَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ  
لَا يَجِدُوا فِي أَلْسِنِهِمْ حَرَجًا  
مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا  
تَسْلِيمًا

کر دیں۔

(النساء ۶۵)

صرف یہی اسلام ہے، اور بس یہی دارالاسلام ہے۔ جنس و وطن حسب و

نسب اور خاندان و قبیلہ سے دُور، بہت دور، کوسوں دور!!

اسلام نے انسان کو خاک کی فطرت سے آزاد کر دیا، تاکہ وہ بلندیوں کی طرف

پکے، اور نسل و خون کی حیوانی قید سے رستگار کر دیا، تاکہ علیین کی رفعتوں میں پرواز  
کرے۔

مسلم کی وہ قومیت جس سے وہ پہچانا جاتا ہے وہ کوئی ملکی قومیت نہیں مسلم کا  
وہ وطن جس کے لیے وہ شوق و محبت کے جذبات رکھتا، اور جان و دل سے اس کا  
دفاع کرتا ہے، وہ زمین کا کوئی خطہ نہیں مسلم کا وہ خاندان جس میں وہ رہتا، اور  
جس کے لیے سروہٹ کی بازی لگاتا ہے، وہ کوئی خونی قرابت نہیں، مسلم کا وہ جھنڈا جس پر  
وہ فخر کرتا اور جس کے تلے شہید ہوتا ہے، وہ کسی قوم کا جھنڈا نہیں، اور مسلم کی وہ فتح  
جس کی وہ آرزو کرتا، اور جس کے حصول پر بارگاہ ایزدی میں تشکر و امتنان کے نذرانے  
پیش کرتا ہے، وہ کسی لشکر کی کامیابی نہیں، وہ جس فتح سے خوش ہوتا اور جس کی تمنا میں  
جیتا ہے وہ عقیدے کی فتح ہے، وہ جس غلبہ کے لیے تڑپتا اور جان و مال کی بازی  
لگاتا ہے، وہ دین الہی کا غلبہ ہے۔ وہ جس سرزمین کو اپنے خون سے سینچتا اور جس کے

ذروں میں آنکھوں کی ٹھنڈک پاتا ہے، وہ صرف دارالاسلام کی سرزمین ہے۔ ملاحظہ ہوں درج ذیل آیتیں:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ  
وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ  
فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ  
بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ  
إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا - (سورہ النصر)

جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح ہو، اور تم دیکھو کہ لوگ خدا کے دین میں فوج درفوج داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد و تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت چاہو، وہ بڑا بخشنے والا ہے۔

پھر ان ساری ہی سرگرمیوں میں اس کا کعبہ مقصود صرف خدا ہوتا ہے اس کے دل میں نہ مال غنیمت کی طلب ہوتی ہے نہ نام و نمود کی ہوس، نہ قوم و وطن کی حمیت ہوتی ہے نہ خاندانی غیرت و نخوت، حقیقت میں یہی ایمان ہے اور اسی کا نام جہاد ہے۔

عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ  
عَنْهُ قَالَ: سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ  
الرَّجُلِ يُقَاتِلُ شُجَاعَةً وَ  
يُقَاتِلُ حَمِيَّةً وَيُقَاتِلُ رِيَاءً،  
أَيُّ ذَلِكَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ؟  
فَقَالَ مَنْ قَاتَلَ لِيَكُونَ كَلِمَتَهُ  
اللَّهُ هِيَ الْعُلْيَا فَمُؤْتَى سَبِيلِ  
اللَّهِ -

ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، ایک شخص داد شجاعت دینے کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص حمیت کی وجہ سے لڑتا ہے، اور ایک شخص نام و نمود کی خاطر لڑتا ہے، کون سا لڑنا راہ خدا میں ہوگا، فرمایا، جو لڑے تاکہ خدا کا نام بلند ہو، پس اسی کا لڑنا راہ خدا میں ہوگا۔

اور صرف اسی جنگ میں شہادت نصیب ہوگی، نہ کہ ہر اس جنگ میں جو

اعلاء کلمۃ اللہ کے علاوہ کسی اور عقیدے سے لڑی جائے۔  
ہر وہ سرزمین جو مسلم سے عقیدے کے سلسلہ میں کشمکش کرے اور اس کو دین سے  
برگشتہ کرنے کی کوشش کرے اور اس کے لیے شریعت پر عمل کرنا دو بھر کر دے،  
وہ "دارالحرب" ہے۔ اگرچہ اس کے اہل و عیال، وہیں ہوں۔ اعزہ و اقربا وہیں  
ہوں اور تجارت و معیشت سب کچھ وہیں ہو۔ اور ہر وہ سرزمین جہاں اس کے  
عقیدے کی عملداری اور شریعت کی فرمانروائی ہو۔ وہ "دارالاسلام" ہے اگرچہ  
وہاں اس کے اپنے اہل و عیال اپنے اعزہ و اقربا اور اپنا کوئی کاروبار نہ ہو۔  
وطن وہ جگہ ہے جہاں عقیدے، نظام زندگی اور شریعت الہی کی حکمرانی  
ہو۔ وطن کا یہ مفہوم انسان کے شایانہ ہے۔ اور قومیت، عقیدہ اور نظام زندگی  
ہے یہی وہ رشتہ ہے جو آدمیوں کو نسیب دیتا ہے۔

رنگ و نسل، قوم و وطن اور قبیلہ و خاندان کی عصبیتیں گھٹیا، اور پیمانہ  
عصبیتیں ہیں، جاہلی عصبیتیں، جن سے انسانیت اُس وقت آشنا ہوتی، جب  
اس کے اندر روحانی پستی آتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے "ملتہ"  
کی صفت تجویز فرمائی ہے۔ ایسی صفت جس کے تصور سے ہی اُبکانی آئے۔  
جب یہود نے محض نسل و قومیت کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا کہ ہم لوگ خدا کی  
چہیتی قوم ہیں، تو خدائے تعالیٰ نے یہ دعویٰ ان کے منہ پر پھینک دیا۔  
اور کسی بھی نسل و قومی، جنسی اور وطنی تفریق کے بغیر قدر و قیمت کی میزان صرف  
ایمان و قرار دیا،

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى  
تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ  
حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ

وہ (یہودی، اور عیسائی) کہتے ہیں :  
یہودی یا عیسائی ہو جاؤ تو ہدایت پاؤ گے  
کہہ دو نہیں، بلکہ طریقہ ابراہیمی کی پیروی

تَوَلَّوْا اٰمَنًا بِاللهِ وَمَا اُنزِلَ  
 اِلَيْنَا وَمَا اُنزِلَ اِلَى  
 اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ  
 وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ  
 وَاَلْسَبَاطِ وَمَا اُوْتِيَ  
 مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَا اُوْتِيَ  
 النَّبِيُّوْنَ مِنْ سَرِّبِهِمْ  
 لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ  
 مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ  
 فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا  
 اٰمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اٰهْتَدَوْا  
 وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ  
 شِقَاقِ طٰسِيْنٰ كَفِيْكُمْ اللهُ ط  
 وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ صِبْغَةَ  
 اللهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ  
 صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عٰبِدُوْنَ۔

دالبقرہ آیت ۱۲۵-۱۲۸

کہ جو ایک (خدا) کا ہو رہا تھا اور وہ مشرکوں  
 میں سے نہ تھا۔ کہو، ہم ایمان لائے اللہ پر،  
 اور اس چیز پر جو ہماری طرف نازل ہوئی۔  
 اور اس پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق،  
 یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف نازل  
 ہوئی، اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دی گئی اور  
 جو دوسرے سبھی انبیاء کو ان کے رب کی  
 طرف سے ملتی رہی۔ ہم ان کے درمیان  
 کوئی تفریق نہیں کرتے، اور ہم اس کے مسلم  
 (فرماں بردار) ہیں، اب اگر وہ ان باتوں  
 پر ایمان لے آئیں جن پر تم ایمان لائے ہو،  
 تو وہ راست روہوں گے اور اگر روگردانی  
 کریں تو پھر وہ درپٹے مخالفت ہیں، اللہ  
 ان کے مقابلے میں ضرور تمہاری مدد کریگا  
 اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے بس  
 اللہ کا رنگ! اللہ سے اچھا کس کا رنگ  
 ہوگا، اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔

یہی سچ مچ خدا کی پسندیدہ جماعت تو یہ وہ امت مسلمہ ہے، جو نسل و قوم کی تفریق

اور رنگ و وطن کے امتیازات سے بلند ہو کر پرچم الہی کے سایہ میں جمع ہو جاتی ہے۔

تم بہترین گروہ ہو، جو لوگوں میں پیدا ہوا،  
 بھلائی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ  
 لِلنَّاسِ تَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ



وَتَتَّبِعُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ - اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔  
 وہ اُمت جس کی صف اول میں ابو بکر عمریؓ، بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، سلمان فارسی اور انہی جیسے ان کے دوسرے معزز بھائی نظر آتے ہیں اور جس کی بعد کی صفیں بھی اسی حسین انداز سے سامنے آتی ہیں، اس اُمت کی قومیت، عقیدہ، وطن دارالاسلام دستور قرآن اور حاکم صرف اللہ ہے۔

یہ ہے وطن و قومیت اور رشتہ و قرابت کا وہ بلند تصور جو داعیانِ حق کے دل پر نقش رہنا چاہیے۔ اور یہ تصور اس قدر واضح رہنا چاہیے کہ دوسرے جاہلی تصورات کی اس میں کوئی آمیزش نہ ہو سکے۔ اور شرکِ خفی کی آلودگیوں سے وہ ہمیشہ محفوظ رہے۔ خواہ وہ شرک کسی بھی صورت میں ہو۔ وطن پرستی کی صورت میں ہو یا نسل پرستی کی صورت میں۔ قوم پرستی کی صورت میں ہو یا نسب پرستی کی صورت میں، مفاد پرستی کی صورت میں ہو یا کسی بھی صورت میں۔ شرکِ خفی کی یہ ساری صورتیں اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آیت میں جمع کر دی ہیں۔ اگر انہیں ترازو کے ایک پلے میں رکھا ہے اور ایمان اور اس کے تقاضوں کو دوسرے پلے میں۔ اور پھر ہمیں چھوڑ دیا ہے، کہ جسے چاہیں اپنے لیے پسند کر لیں۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ  
 وَأَخْوَالُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَ  
 عَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ  
 اقْتَرَفْتُمْ مِمَّا  
 كَسَبْتُمْ وَتِجَارَةٌ  
 تَمْشُونَ  
 كَسَادَهَا وَمَلِكٍ  
 تَرْضَوْنَهَا  
 أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ  
 اللَّهِ وَرَسُولِهِ

کہ دو: اگر تمہارے باپ اور بیٹے بھائی  
 اور بیویاں اور گھرانے کے لوگ، اور مال  
 جو تم نے کمانے ہیں اور کاروبار جس کے  
 مانند پڑ جانے کا تمہیں خوف ہے، اور گھر جو  
 تم کو پسند ہیں، تمہیں اللہ اور اس کے رسول  
 اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے عزیز تر نہ ہوں

وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ  
يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ عَظِيمٍ وَاللَّهُ لَا  
يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ

تواضع و جدوجہاد کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ  
تمہارے سامنے لے آئے۔ اور اللہ فاسق  
لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

(التوبہ - ۲۲)

اس طرح اسلام و جاہلیت کی حقیقت دارالاسلام اور دارالحسب کی تعریف  
کے سلسلہ میں رکیک شکوک و شبہات سے داعیان دین کے قلب و دماغ  
ہمیشہ پاک رہنے چاہئیں۔ کہ عموماً اسی طرف سے تصورات و عقائد میں کمزوری  
آتی اور یہیں سے ایمان و یقین کی منزل کھولی ہوتی ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے  
کہ جہاں اسلام کی حکمرانی اور شریعت کی عملداری نہ ہو۔ وہاں اسلام کا وجود نہیں  
اور وہ خطہ دارالاسلام نہیں۔ دارالاسلام تو صرف وہ خطہ ہے جہاں اسلام پورے  
طور پر غالب اور اپنے تمام قوانین کے ساتھ نافذ ہو۔ یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ جہاں  
ایمان نہیں، وہاں کفر ہے، جہاں اسلام نہیں وہاں جاہلیت ہے اور جہاں حق  
نہیں وہاں گمراہی ہے۔

## ہمنہ جہتی انقلاب

ایک انتہائی اہم اور بنیادی حقیقت ہے جو اسلام کو پیش کرتے ہوئے ہمارے ذہن میں پوری طرح واضح رہنی چاہیے۔ چاہے ہمارے مخاطب اہل ایمان ہوں یا غیر اہل ایمان۔ اور یہ حقیقت خود اسلام کی تاریخ اور اسلام کے مزاج سے مترشح ہوتی ہے۔

اسلام وجود و زندگی کا ایک مستقل اور کامل ترین تصور ہے، جو کچھ نمایاں خصوصیات کا حامل ہے یہی وجہ ہے کہ اس سے ایک ایسا دستور وجود میں آتا ہے جو زندگی اور زندگی کے سارے ہی تعلقات و معاملات اور حلقہ مسائل سے بحث کرتا ہے اور اس کی بنیاد پر ایک ایسا نظام قائم ہوتا ہے، جو اپنی صفات و خصوصیات میں بالکل منفرد ہے۔

یہ تصور بنیادی طور پر سارے جاہلی تصورات سے مختلف ہے، خواہ وہ اس دور کے تصورات ہوں یا کسی بھی دور کے۔ اور اگر کچھ جزئیات میں وہ ان سے مشابہ نظر آتا ہے تو یہ مشابہت بس ظاہری ہے، کیونکہ جن اصولوں سے ان جزئیات کا تعلق ہے، وہ جاہلی اصولوں سے دور کی بھی مناسبت نہیں رکھتے۔

اسلام کا اولین کام یہ ہے کہ وہ ایک ایسا انسانی گروہ تیار کرے جو اس تصور سے

پوری طرح ہم آہنگ اور اس کی زندہ تصویر ہو۔ اور زمین پر ایک ایسا نظام قائم کرے جو خدائی اصولوں کا پابند اور ان مقاصد کے لیے سرگرم ہو جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو وجود بخشا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ  
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ  
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ -  
تم بہترین گروہ ہو جو لوگوں میں پیدا ہوا،  
بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو،  
اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

دوسری جگہ اس امت کی توصیف کرتے ہوئے فرمایا:

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ  
أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ  
وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا  
عَنِ الْمُنْكَرِ - (الحج ۴۱)  
وہ لوگ کہ اگر ہم زمین میں انہیں اقتدار عطا  
کریں تو وہ نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ  
دیں اور بھلائی کا حکم دیں، اور برائی  
سے روکیں۔

اسلام کا کام یہ نہیں کہ وہ حکمران جاہلی تصورات اور قائم و برپا جاہلی نظاموں کے ساتھ سلج و مفاہمت کرے۔ جس روز وہ آیا تھا اس روز اس کا یہ کام تھا، نہ آج ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔ کیونکہ اسلام اسلام ہے، جاہلیت جاہلیت ہے اگر اسلام یہ ہے کہ بندگی بس رب کی ہو، حکمرانی صرف نظام الہی کی ہو، حاکمیت و قانون سازی کا مالک تھا خدا ہو، اور نظریہ و نظام، شرائع و احکام اور اقدار و اعتبارات کا ماخذ و منبع بھی صرف خدا ہی ہو، تو جاہلیت یہ ہے کہ بندگی انسان کی ہو، حاکمیت و قانون سازی بھی انسان کی ہو، دستور و نظام بھی انسان کے ہوں، اقدار و اعتبارات کا سرچشمہ بھی انسان ہو، گو یادوں کی راہیں دو ہیں ایک کی منزل اور ہے دوسرے کی منزل اور ہے یہیں سے اسلام کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ انسانیت

کو جاہلیت کے خارزار سے نکال کر اسلام کے چمن زار میں پہنچائے۔  
یہ وہ حقیقت ہے جو خود اسلام اور تاریخ اسلام کے مزاج سے مترشح  
ہوتی ہے۔ اسلام کو پیش کرتے وقت اس حقیقت کو سامنے رکھنا ناگزیر ہے، خواہ  
ہمارے مخاطب مسلم ہوں یا غیر مسلم!

اسلام جاہلیت کے ساتھ صلح اور ٹھوکرے پر راضی نہیں، نہ تصور میں، نہ  
اس تصور سے وجود میں آنے والے نظاموں میں۔ بس یا تو اسلام ہوگا یا جاہلیت۔  
کوئی اور شکل جو نصف اسلام ہو اور نصف جاہلیت، اسلام کے لیے قابل قبول  
نہیں۔ اسلام کا نقطہ نظر تو بالکل واضح ہے کہ حق صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، کئی  
نہیں۔ اور حق کے علاوہ جو کچھ ہے گمراہی ہے۔ نیز ان دونوں کا اجتماع ناممکن ہے بس  
یا تو خدا کی حکومت ہوگی۔ یا جاہلیت کی۔ یا شریعتِ الہی کی پیروی ہوگی یا ہوا  
و نفسانیت کی۔ قرآن کریم کی کتنی ہی آیتیں اس دعوے کی تائید میں ہیں:

(۱) وَ اِنْ اَحْكُمُ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلِ  
اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ  
وَ اَحْذَرُهُمْ اَنْ يَفْتِنُوْكَ  
عَنْ بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ  
(المائدہ ۴۵)

تراسی (دین) کی طرف بلاؤ اور جھے رہو  
جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات  
کی پیروی نہ کرنا۔

(۲) فَلِذٰلِكَ فَاذَعُ وَاَسْتَقِمْ  
كَمَا اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ  
(الشوریٰ ۱۵)

اب اگر وہ تمہاری دعوت پر لبیک نہیں کہتے  
تو جان لو کہ وہ صرف اپنی خواہشات پر چلتے ہیں۔

(۳) فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوْكَ فَاَعْلَمْ  
اَنَّ مَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ

اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہو گا جو ہدایت  
الہی سے بے پروا ہو کر اپنی خواہشات پر چلے؟  
بیشک اللہ ایسے ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا۔  
پھر دین کے معاملے میں ہم نے تمہیں ایک واضح  
راستے پر لگا دیا ہے، تو تم اسی راہ پر چلو، اور  
ان لوگوں کی خواہشات پر نہ چلنا جو جانتے  
نہیں۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ کام  
نہیں آسکتے۔ بلاشبہ ظالم لوگ ایک دوسرے  
کے دوست ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں  
کا دوست ہے جو متقی ہیں۔

کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ  
(اللہ پر) یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ سے  
اچھا فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟

یہ آیات اپنے مفہوم میں بالکل واضح اور قطعی ہیں جن کے بعد کسی بحث و تکرار  
کی گنجائش نہیں رہتی بس دو ہی شکلیں ہیں کوئی تیسری شکل نہیں۔ یا تو خدا اور رسول  
کی پیروی ہوگی یا ہر اولفسانیت کی۔ یا تورب کی حکمرانی ہوگی یا جاہلیت کی، یا تو  
سارے احکام الہی کا نفاذ ہوگا یا سبھی سے انحراف۔

أَضَلَّ مَثَرًا تَبِعَ هَوَاهُ بَعْدَ هُدًى  
مِّنَ اللَّهِ ط إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي  
الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (القصص ۵۰)  
(۴) ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِّ أَمْرٍ  
فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ  
الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ إِنَّهُمْ  
لَنْ يُغْنُوا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا  
وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ  
أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ط وَاللَّهُ وَوَلِيُّ  
الْمُتَّقِينَ ۝ (المجادلہ ۱۸)  
(۵) أَفَحُكْمُ الجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۝  
وَمَنْ أَحْسَنُ مِنْ اللَّهِ حُكْمًا  
لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝ (المائدہ ۵)

اسلام کا مقصد ہے انسانی قیادت سے جاہلیت کو بے دخل کرنا، پھر  
ان اصولوں کے مطابق انسانوں کی قیادت جو اپنی خصوصیات میں بالکل متفرد  
اور ایک انتہائی شان کے مالک ہیں، یہ اصول بزرگے کو خدا سے جوڑتے

اور انسان کو کائنات سے ہم آہنگ کرنے میں اور اس طرح انسان کے لیے خیر و فلاح عزت و سعادت اور امن و آشتی کی راہیں کھولتے ہیں۔ اسلام کا مقصد ہے کہ انسانیت نفس کی غلامی اور نفسانیت کی حکمرانی سے آزاد ہو کر اس بلند و اشراف معیار پر پہنچ جائے، جو خدا نے اس کے لیے تجویز کیا ہے جیسا کہ ربیع بن عامر نے ایرانی کمانڈر رستم کے جواب میں کہا تھا۔ رستم نے پوچھا تم کس لیے آئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: "اللہ نے ہمیں بھیجا ہے، تاکہ جسے وہ توفیق دے اسے بندوں کی بندگی سے آزاد کر کے خدائے واحد کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر دنیا و آخرت کی فراخیوں میں پہنچائیں اور دیگر مذاہب کی زیادتیوں سے بچا کر عدل اسلام سے ہم کنار کریں۔"

گویا اسلام اس لیے نہیں آیا کہ وہ انسانوں کی نفسانیت کو شہ دے جو ان کے تصور و افکار، ان کی معیشت و معاشرہ، ان کے رہن سہن کے معاملے کے اندر سے جھانکتی ہے، خواہ وہ نفسانیت ہو جو ابتدائے اسلام میں تھی، یا وہ نفسانیت ہو جس میں آج انسانیت غوطے لگا رہی ہے۔ وہ تو آیا ہے تاکہ نفسانیت کے یہ سارے ہی نقشے مٹا دیے بالکل ہی مٹا دے، ان کا کوئی نام و نشان نہ رہنے دے۔ اور اپنے خاص اصولوں پر انسانی زندگی کی تعمیر کرے۔ وہ آیا ہے تاکہ زندگی کو صحیح معنوں میں وجود سے آشنا کرے۔ ایک ایسی زندگی کو وجود بخشنے جو اسی سرچشمے سے سھوٹتی اور اسی محور پر گھومتی ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ کچھ باتوں میں وہ نئی زندگی اس جاہلی زندگی سے مشابہ نظر آئے لیکن فی الحال ان دونوں میں کوئی مماثلت نہ ہوگی یہ تو محض اتفاقی مشابہت ہوگی، جو بس ظاہری شاخوں تک ہی محدود ہوگی، ورنہ درختی جڑ بالکل ہی مختلف ہوگی ظاہر ہے، ایک وہ درخت ہے جسے حکمت الہیٰ اُکاتی ہے اور دوسرا وہ ہے جسے ہوا وہوس اور نفسانیت پر ان چڑھاتی ہے، ان دونوں میں مشابہت کا کیا سوال۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتًا  
بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبثَ  
لَا يَخْرِجُ إِلَّا نَجَسًا -  
(الاعراف ۵۸)

اور جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے  
حکم سے خوب پھل پودے اگاتی ہے اور جو  
زمین خبیث (خراب) ہوتی ہے اس سے  
ماقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

یہ جاہلیت پہلے بھی خبیث تھی، اور اب بھی خبیث ہے۔ اس خبیث کی شکلیں  
اور صورتیں تو بدلتی ہیں، لیکن جڑ ایک ہی رہتی ہے۔ وہ جڑ ان جاہل اور عرض پرست  
گروہوں کی ہوا و نفسانیت ہے جو اپنی پستی و پست فطرتی یا جنسی معلومات اور طبقاتی  
تعصبات سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ وہ اپنی نفسانیت اور ہوا و ہوس کو عدل و انصاف اور حق و  
صداقت پر غالب کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ شریعت الہی نمودار ہو کر ان ساری چیزوں کو صاف کرتی اور تمام انسانوں  
کے لیے ایک ہی قانون بناتی ہے جس میں انسانی جہل کا شائبہ نہیں ہوتا۔  
ہوا و نفسانیت کی آلودگی نہیں ہوتی اور گروہی مصلحتوں کے لیے گنجائش نہیں ہوتی۔  
چونکہ خدائی اور انسانی دستوروں کے مزاج میں یہ بنیادی فرق ہے اس لیے ایک ہی  
نظام میں ان کا یکجا ہونا محال ہے۔ ایک ہی معاشرے میں ان کو باہم سازگار کرنا محال  
ہے ”آدھا تیترا آدھا بٹیر“ کی شکل کا کوئی دستور مرتب کرنا محال ہے جس  
طرح اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں معاف کر سکتا، اسی طرح اپنے دستور کے ساتھ کوئی  
دوسرا دستور بھی نہیں گورا کر سکتا۔ دونوں کی حیثیت ایک ہے کیونکہ حقیقت میں  
دونوں ایک ہیں۔

جس وقت ہم لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کریں، ہمارے ذہن و دماغ میں  
حقیقت پوری طرح آ جا کر ہو کہ اس کے اظہار میں ہچکچاہٹیں یا شرمائیں نہیں۔ اور لوگوں  
کو کسی شک و شبہ میں نہ رہنے دیں۔ ہم ان پر یہ اچھی طرح واضح کر دیں کہ اگر وہ اسلام  
کی طرف آئیں گے تو وہ ان کی پوری زندگی بدل کر رکھ دیگا۔ جہاں وہ ان کی وضع



اور ہمیشہ کو بدلے گا، وہیں ان کی زندگی کے سارے تصورات کو بھی بدلے گا۔ وہ انہیں بدلے گا تاکہ ان سے کہیں بہتر چیز دے، اتنی بہتر کہ دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ وہ انہیں بدلے گا تاکہ ان کے تصورات کو بلندی عطا کرے، ان کے طرز رہن سہن کو رفعت بخشنے، اور ان کو اس بلند و اشرف سطح سے قریب کر دے جو انسانی زندگی کے نمایاں ہے۔ گویا جس جاہلیت کی پستی میں وہ پڑے ہیں، اس کے گھٹیا اور ذلیل طریقوں کا وہ کوئی اثر و نشان نہیں چھوڑے گا، ہاں وہ جزئیات ضرور رہیں گی جن کا نظام اسلامی سے کوئی تصادم نہ ہو، مگر اپنی ماہیت کے اعتبار سے وہ بھی اب پہلے سے مختلف ہوں گی، کیونکہ جاہلیت کی جس اصل خبیثت سے ان کا تعلق ہوگا، اس سے کٹ کر اب وہ ایک دوسری اصل سے وابستہ ہو چکی ہوں گی۔ ساتھ ہی ان کے ”خالص فنی و تنسی“ علوم سے وہ انہیں محروم نہیں کرے گا، بلکہ انہیں اور تیز رفتاری سے آگے بڑھائے گا۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم ان پر یہ واضح کر دیں کہ اسلام کوئی خود ساختہ اجتماعی مذہب نہیں نہ انسانی ہاتھوں کا تراشا ہو کوئی حکومتی نظام ہے، دوئے زمین پر جس طرح اور دوسرے نظام رائج ہیں جو مختلف ناموں سے جانے جاتے اور مختلف جھنڈوں سے پہچانے جاتے ہیں، اس طرح کا یہ کوئی نظام نہیں ہے۔ یہ تو بس اسلام ہے! وہ اسلام جو اپنا مستقل وجود، مستقل فلسفہ اور مستقل نظام رکھتا ہے۔ وہ اسلام جو انسانیت کو ان سے زیادہ ارفع و اعلیٰ نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے، جن کا ان نظاموں کی بنیاد پر وہ خواب دیکھتی ہے۔ وہ اسلام جس کے اندر رفعت و بلندی ہے پاکیزگی و ستھرائی ہے، توافق و ہم آہنگی ہے، رعنائی و زیبائی ہے۔ اور جو سراسر وحی الہی اور پیام ربانی ہے۔

اگر ہم اس انداز سے اسلام کو سمجھ لیں تو جس وقت لوگوں کے سامنے اسے پیش کر رہے ہوں گے، ہماری گفتگو میں زور ہوگا۔ ہمارے لب و لہجہ میں خود اعتمادی ہوگی۔ ہماری تپلیوں میں انسانی شفقت و ہمدردی کی بے پناہ اور انتہائی دلاویز چمک ہوگی۔ اس شخص کی سی خود اعتمادی ہوگی، جسے یہ یقین ہو کہ جو اس کے پاس ہے وہی حق ہے، اور جس پر لوگ ہیں، وہ باطل ہے، اس شخص کی سی دسوزی ہوگی جو انسانوں کی بدبختیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو اور اسے یہ معلوم ہو کہ کس طرح انھیں وہ ساحل سعادت سے ہم کنار کر سکتا ہے۔ اس شخص کی سی ہمدردی ہوگی جو لوگوں کی گمراہی کو پوری طرح محسوس کر رہا ہو اور یہ جانتا ہو کہ وہ نسخہ ہدایت کہاں ہے، جس کے سوا اور کہیں ہدایت نہیں!

لوگوں کے سامنے اسلام پیش کرتے وقت ہم پُر فریب سیاست سے کام نہیں لیں گے، ہم ان کی نفسانیت اور بھٹکے ہوئے تصورات کو تھپکیاں نہیں دیں گے۔ ہم تو ان سے انتہائی صریح انداز میں کہیں گے۔ یہ جاہلیت جس میں تم آلودہ ہو، یہ نجس ہے، اور اللہ تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے۔ یہ جاہلی رسمیں جن کے تم دلدادہ ہو، یہ خمیشت ہیں، اور اللہ تمہیں طیب بنا چاہتا ہے۔ یہ زندگی جو تم بسر کر رہے ہو، یہ پستی ہے اور اللہ تمہیں رفعتوں میں لے جانا چاہتا ہے۔ یہ صورت حال جس سے تم دوچار ہو، یہ شقاوت و بدبختی اور نحوست ہے، اور اللہ تمہیں سعادتوں سے ہمکنار، اور رحمتوں سے مالا مال کرنا چاہتا ہے۔ اسلام تمہارے اقدار و تصور اور تمہارے نظاموں کو بدلے گا، اور تم کو ایک ایسی زندگی کی رفعتوں میں پہنچا دے گا جہاں سے تمہیں اپنی موجودہ زندگی سے نفرت معلوم ہوگی۔ تم کو ایسے نظام کی بلندیوں پر پہنچا دے گا جہاں سے مشرق و مغرب کے یہ سارے نظام حقیر نظر آئیں گے تمہیں ایسی اعلیٰ قدریں عطا کرے گا، جن کے بعد زمین کی ان ساری حکمراں قدروں سے

گھن آئے گی۔ اور اگر تم نے اپنی بے نصیبی سے اس اسلامی زندگی کی محسوس تصویر نہیں  
 دیکھی، کیونکہ تمہارے دشمن — اس دین کے دشمن — اس تصویر کے  
 محسوس و مجسم پیکر اختیار کرنے کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں، تو محمد اللہ ہمارے  
 قلب و ضمیر کی نگاہوں نے قرآن و سنت اور تاریخ و شریعت کے درتچوں اور یقیناً آنے والے  
 مستقبل کے تصورِ رعنا کے جھروکوں سے اسے بالکل محسوس و مجسم شکل میں دیکھا  
 ہے!

\*

\*

\*

لوگوں کے سامنے اسلام پیش کرتے وقت ہمارا یہی انداز ہونا چاہیے۔ کیونکہ  
 یہی حقیقت ہے، اور یہی وہ انداز ہے جو اسلام نے پہلے پہل اختیار کیا تھا۔  
 جزیرہ عرب، روم و ایران، اور جہاں کہیں بھی اس نے لوگوں کو خطاب کیا، اس کا  
 یہی انداز تھا۔

اس نے بلندیوں سے نگاہ ڈالی کہ یہی حقیقت ہے۔ پیار و محبت کی زبان  
 میں گفتگو کی کہ یہی اس کا مزاج ہے۔ بالکل کھلے کھلے اور واضح انداز میں اپنی دشمنی  
 پیش کی، جس میں نرودیا ابہام و پیچیدگی کا نام نہ تھا، کہ یہی اس کا طریقہ ہے۔  
 اس نے کبھی نہیں کہا کہ وہ اُن کی زندگیوں، ان کے نظاموں، ان کے قصور اور قدروں میں  
 بس برلے نام ترمیم کرے گا، نہ یہ کہا کہ وہ جن نظاموں سے مانوس اور جس طرز زندگی  
 کے خوگر ہیں، ان سے وہ بہت حد تک مشابہ ہے۔ جیسا کہ اسلام پیش کرتے  
 وقت ہمارے کچھ مبھاشیوں کی زبانوں سے اسی طرح کی باتیں سُنی جاتی ہیں۔  
 کبھی "اسلامی ڈیموکریسی" کے نام سے، تو کبھی "اسلامی اشتراکیت" کے عنوان  
 سے! اور کبھی اس انداز سے کہ ان کے یہاں جو سیاسی، قانونی اور اقتصادی  
 طور طریقے رائج ہیں وہ اسلام کی طرف سے بس ذرا سی ترمیم کے محتاج ہیں!!

ہو اور نفسانیت کو تھپکیاں دینے، اور عیٹھے اور پرفریب انداز سے ماٹل کرنے والے یہ اور اسی جیسے دوسرے الفاظ آئے دن سنے جاتے ہیں۔

ہرگز نہیں! معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بالکل برعکس ہے۔ عالمگیر جاہلیت سے اسلام کی آغوش میں آنے کے لیے بہت ہی لمبی اور ہمہ جہتی جست لگانی ہوگی، کیونکہ اسلامی زندگی کی شکل جاہلی زندگی کی شکلوں سے بالکل ہی مختلف ہے۔ پہلے بھی مختلف تھی، اور آج بھی مختلف ہے۔ یہ شقاوت و بدبختی جس سے آج انسانیت دوچار ہے، نظریہ و نظام کی جزئی تبدیلیوں سے ختم ہونے والی نہیں۔ اگر اس سے نجات حاصل کرنی ہے تو وہی لمبی اور ہمہ جہتی جست لگانی ہوگی۔ مخلوق کے دستوروں سے خالق کے دستور کی طرف، انسانی نظاموں سے خدائی نظام کی طرف اور بندوں کے احکام سے رب کے احکام کی طرف جست لگانی ہوگی۔

بیچہقیقت ہے اور حقیقت بھی ایسی کہ ہم برملا اس کا اظہار کریں، لوگوں کے لیے اس کی گنجائش کبھی نہ چھوڑیں کہ وہ اس سلسلہ میں کسی غلط فہمی یا وہم کا شکار ہوں۔ ہو سکتا ہے شروع میں لوگ اسے گوارا نہ کریں، یا ابتداء میں اس سے بدکیں اور خطرہ محسوس کریں، لیکن پہلے پہل جب اسلام کی دعوت دی گئی تھی، اس وقت بھی لوگوں کو ناگوار ہوا تھا، اُس وقت بھی ان کے ماتھوں پر پل آیا تھا، اس وقت بھی ان کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ اس کا انھیں انتہائی صدمہ تھا کہ محمد

صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کے تصورات و عقائد سے بدل، ان کے خداؤں سے متنفر ان کے طور طریق سے بیزار اور ان کی عادات و روایات سے برسرِ پیکار ہیں۔ اور جاہلی طور طریق، جاہلی قدروں اور جاہلی رسوم سے ہٹ کر بالکل ہی نئے طور طریق، نئی قدریں اور نئی رسوم اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔

پھر کیا ہوا؟ پھر وہ اسی حق کی طرف بڑھے جو شروع میں انھیں ناگوار گزرا

تھا، جس سے وہ اس طرح بد کے تھے جیسے گدھے شیر سے بد کہیں، جس سے انھوں نے جنگ کی تھی، جس کو مٹا دینے کے لیے اپنی ساری تدبیریں اور تمام قوتیں وقف کر دی تھیں، جس کے فداکاروں کو مکی زندگی میں کمزور بنا کر لڑنے خیز مظالم کا تختہ مشق بنایا تھا، اور جب مدینے پہنچ کر انھیں قوت حاصل ہو گئی۔ تو ہونٹ چبا چبا کر ان سے ہولناک خونیں ٹکڑیوں لی تھیں۔

دعوت اسلامی شروع میں آج سے زیادہ بہتر حالت میں نہ تھی۔ وہ اس وقت بالکل گمنام اور جاہلیت کی خشکیوں کا ہدف تھی۔ مکے کی گھاٹیوں میں محصور اور ارباب جاہ و اقتدار کی زد میں تھی۔ ساری دنیا کے لیے اجنبی اور ہر ایک کی نگاہ میں معتوب تھی۔ چاروں طرف سے ایسی ظالم و جابر اور مقتدر شہنشاہیتوں کے ترغیبیں تھی، جو اس کے اصول و مبادی سے متنفر اور مقاصد سے بیزار تھیں لیکن ان سب کے باوجود وہ طاقتور تھی، جس طرح آج طاقتور ہے اور آئندہ بھی طاقتور رہے گی۔ قوت کے حقیقی عناصر خود اس عقیدے کے مزاج میں پنہاں ہیں، اسی لیے یہ عقیدہ خراب و خراب اور ناسازگار سے ناسازگار حالات میں بھی اپنا کام کر سکتا ہے اسلام کی قوت کا راز یہ ہے کہ اس کی بنیاد حق پر ہے۔ اس فطرت (NATURE) سے وہ پوری طرح ہم آہنگ ہے، جس کا مقابلہ دیر تک ناممکن ہے۔ قوت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ یہ دین انسانیت کو ترقی کی شاہراہ پر لے کر آگے بڑھ سکتا ہے، چاہے وہ اقتصادی، اجتماعی، علمی اور عقلی ترقی یا پیمانہ زندگی کے اعتبار سے کسی بھی مرحلے میں ہو۔ اس کی قوت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ مادی قوتوں سے مسلح جاہلیت کے سامنے کھڑا ہو کر بھی وہ صاف گوئی اور صراحت بیانی سے کام لیتا ہے، وہ اپنے اصولوں میں ایک حرف کی بھی قطع و برید نہیں کرتا۔ وہ جاہلیت کی خواہشات کو تھپکیاں نہیں دیتا، نہ اسے ہم نوا بنانے کے لیے مکر و جیلہ سے کام لیتا ہے، وہ علانیہ

اور بر ملاحق کا اظہار کرتا ہے، اور یہ بتا کر کرتا ہے کہ وہ انسانیت کے لیے خیر و فلاح کی نوید اور رحمت و برکت کا پیامی ہے۔

جس خدانے انسانوں کو پیدا کیا، وہ ان کی فطرت سے خوب واقف ہے وہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں تک پہنچنے کی کیا راہیں ہیں۔ اُسے خوب معلوم ہے کہ اگر حق کا اعلان پوری قوت و پبلیا کی سے کیا جائے، تو وہ کس طرح اس کی طرف بڑھتے اور تیزی سے پکنتے ہیں!

انسان کے اندر ایک نقشہ زندگی کو چھوڑ کر دوسرا نقشہ زندگی اختیار کر لینے کی پوری استعداد موجود ہے، بلکہ بسا اوقات یہ چیز جزوی ترمیمات سے زیادہ آسان ہوتی ہے۔ ایک نظام حیات کو چھوڑ کر کسی ایسے نظام حیات کو اختیار کر لینا، جو اس سے زیادہ بلند، پاکیزہ اور مکمل ہو، جسے خود اپنی معقولیت کی روشن دلیل ہے۔ لیکن نظام جاہلیت سے نظام اسلامی کی طرف آنے کے لیے کیا وجہ جواز ہو سکتی ہے، اگر وہ بس تھوڑی سی ترمیم پر ہی اکتفا کر لے، اور بقیہ چیزوں کو ہو ہو قائم رکھے، اس وقت تو سابقہ نظام پر ہی قائم رہنا زیادہ قرین عقل و قیاس ہوگا، کہ وہ ایک قائم شدہ نظام تو ہے، جو اصلاح و ترمیم کی بھی گنجائش رکھتا ہے۔ ظاہر ہے اسے چھوڑ کر ایک ایسے نظام کی طرف آنے کی کیا ضرورت، جو ابھی قائم و نافذ بھی نہیں، اور مجموعی حیثیت سے وہ اسی کے مشابہ ہے!

اسی طرح کچھ لوگ دنیا کے سامنے اسلام کو اس طرح پیش کرتے ہیں، گویا وہ ایک ملزم ہے، جس کے دامن سے وہ الزام کو دھونا چاہتے ہیں! اور مدافعت کے لیے جو ڈھالیں وہ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ موجودہ

نظام دین اسلام پر جن عجیب کی تہمت رکھتے ہیں ان کی چیینٹوں سے خود ان کے دامن بھی محفوظ نہیں، اور اس سلسلہ میں اسلام نے جو کچھ کیا، وہ اس سے کچھ زیادہ نہ تھا، جو چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی آج جدید ”تہذیبیں“ کر رہی ہیں۔

کتنی بودی ہے یہ مدافعت! کس قدر بری ہے یہ حمایت!!

اسلام جاہلی نظاموں اور ان کے غلط رویوں کی آڑ کبھی نہیں لیتا۔ یہ

”تہذیبیں“ جو بہتوں کی نگاہیں خیرہ اور کتنے ہی ذہنوں کو مرعوب کیے دیتی ہیں

حقیقت میں جاہلیت کے سوا کچھ نہیں۔ ان نظاموں کا تو یہ حال ہے کہ اگر اسلام

کے مقابلے میں انہیں رکھا جائے، تو نہایت ہی گھٹیا، بودے اور پست نظر

آئیں۔ پھر اس سلسلہ میں یہ بات کوئی وزن نہیں رکھتی کہ ان نظاموں کے ماننے

والے نام نہاد وطن اسلامی یا ”عالم اسلام“ کے رہنے والوں سے زیادہ خوش

حال ہیں! کیونکہ ہماری بد حالی کی وجہ اسلام دشمنی ہے۔ نہ کہ اسلام دوستی۔

اسلام تو انسانوں کے سامنے اس دعوے کے ساتھ آتا ہے، کہ وہ ان نظاموں سے

بہتر ہے، اتنا بہتر کہ دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں، اور وہ آیا ہے تاکہ انہیں

بدل ڈالے نہ کہ ہو ہو قائم رکھے، اور انسانیت کو پستیوں سے اٹھا کر رفعتوں میں

لے جائے، نہ کہ ”تہذیب“ کی پرفریب کچھڑ میں لت پت رہنے پر لہدیہ تبریک

پیش کرے۔

لہذا ہماری مرعوبیت اس حد تک نہ بڑھ جائے کہ ہم دورِ حاضر کے نظاموں

اور موجودہ افکار و مذاہب میں اسلام سے مشابہت کے پہلو تلاش کرنے لگیں ہم

ان سارے نظاموں کو حقارت سے ٹھکرا دیں، چاہے وہ مشرق کے نظام

ہوں یا مغرب کے، کیونکہ اسلام انسانیت کو جس بلندی پر لے جانا چاہتا ہے،

اس کے مقابلے میں یہ پسماندہ اور گھٹیا ہیں۔

جب ہم لوگوں کے سامنے یہ حقیقت رکھیں گے، اور اسلام کی یہ بنیادی حیثیت انہیں بتائیں گے، تو ایک تصور سے دوسرے تصور اور ایک وضع سے دوسری وضع کی طرف آنے کی توجیہ و تائید خود ان کی فطرت کی گہرائیوں سے ہوگی۔ البتہ ہمارا یہ کہنا ذرا بھی دلپندیر اور موثر نہ ہوگا، کہ تم عملاً قائم نظام کو چھوڑ کر ایک دوسرے نظام میں آ جاؤ، جو ابھی قائم و نافذ نہیں، اور اطمینان رکھو، وہ تمہارے موجودہ نظام میں بس ذرا سی تبدیلی کرے گا، کیونکہ وہ تو اس سے بہت حد تک مشابہ ہے چنانچہ دیکھو، تم اس معاملے میں یہ کرتے ہو، اور یہ بالکل وہی ہے جو وہ کرتا ہے، وہ تو تمہاری عادات و خواہشات اور وضع قطع میں بس ذرا سی تبدیلی کرے گا، ان میں سے جو باتیں بھی تم چاہو گے انہیں علیٰ حالہ باقی رکھے گا، بس برائے نام ہی ان سے تعرض کرے گا!!

یہ بات جو بظاہر آسان نظر آتی ہے، فی نفسہ اس کے اندر کوئی کشش کوئی جاذبیت اور کوئی اپیل نہیں، جبکہ حقیقت بھی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ تصورات و احساسات کو بھی بدلتا ہے، وضع قطع اور نظاموں کو بھی بدلتا ہے، شرائع و قوانین کو بھی بدلتا ہے، اور بالکل بدلتا ہے۔ اس طرح بدلتا ہے کہ جاہلی زندگی کا تسمہ بھی نہیں چھوڑتا۔ پھر یہی کیا کم ہے کہ وہ انہیں مکمل طور پر غلامی کی لعنت سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں لے آتا ہے۔

”فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ  
شَاءَ فَلْيُكْفُرْ“۔ ”وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ  
اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ“

”تو جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کفر  
کرے“۔ البتہ جو کفر کرے وہ جان لے کہ  
اللہ سارے جہان سے بے نیاز ہے۔“

مشدد حقیقت کفر اور ایمان، شرک اور توحید، جاہلیت اور اسلام کا ہے اور یہ بالکل واضح ہونا چاہیے۔ لوگ جب تک جاہلی زندگی سے پوری طرح آزاد



نہ ہوں گے، وہ ہرگز ہرگز مسلمان نہ ہوں گے، خواہ وہ کتنے ہی دعوے کریں،  
 اگر کوئی چاہتا ہے کہ خود کو یا دوسروں کو فریب میں رکھے، اور یہ سمجھے کہ اسلام  
 اس جاہلیت کے ساتھ بھی رہ سکتا ہے، تو اسے اختیار ہے۔ لیکن اس کی یہ خود  
 فریبی یا فریب کاری حقیقت واقعہ کو نہیں بدل سکتی۔ یاد رہے، یہ اسلام نہیں  
 اور وہ لوگ مسلمان نہیں۔ اور آج دعوتِ اسلامی کا پہلا کام یہ ہو گا کہ ان جاہلیت زدہ  
 حضرات کو پھر سے اسلام کی طرف لائے، اور از سر نو انہیں مسلم بنائے۔

ہم اسلام کی طرف اس لیے نہیں بلا تے کہ ہم کسی صلے کے بھوکے ہیں، ہم زمین  
 میں غلبہ و اقتدار حاصل کرنا یا فساد مچانا بھی نہیں چاہتے۔ اپنے لیے ہم کچھ نہیں  
 چاہتے، بالکل نہیں چاہتے، ہمارا حساب چکانا اور صلہ دینا لوگوں کے ذمے نہیں  
 ہم تو اسلام کی طرف صرف اس لیے بلا تے ہیں کہ ہمیں لوگوں سے محبت ہے، ہم ان کے  
 ہی خواہ ہیں۔ اگرچہ وہ ہمیں ستائیں اور اذیتیں دیں کہ ایک داعیِ اسلام کا یہی مزاج  
 ہوا کرتا ہے۔ یہی اس کے جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں  
 اسلام کی حقیقت سے آگاہ کریں، اور بتائیں کہ اسلام ان پر کچھ ذمہ داریاں تو  
 عائد کرے گا، مگر جن عظیم نعمتوں سے انہیں بہال کرے گا، ان کے مقابلے میں وہ  
 کچھ بھی نہ ہوں گی۔ پھر یہ بھی بتائیں کہ جس جاہلیت کو وہ سینے سے لگاتے ہوئے  
 ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے۔ بلاشبہ وہ جاہلیت ہے، اسلام سے اسے  
 کوئی واسطہ نہیں، وہ نفسانیت ہے، ”شریعت“ سے اس کا کوئی رشتہ نہیں،  
 وہ ”گمراہی“ ہے، حق سے اسے کوئی نسبت نہیں۔ ظاہر ہے جو چیز حق نہیں،  
 وہ گمراہی نہ ہوگی تو کیا ہوگی؟!

ہمارے اسلام میں کوئی ایسی چیز نہیں، جس سے ہم شرمائیں اور جس کے

دفاع پر مجبور ہوں اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کے لیے ہم حیلہ و فریب کی راہیں اختیار کریں۔ یا جس کی اصل حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچاہٹیں۔ مشرق و مغرب اور ہر سو پھیلی ہوئی جاہلی رسوم سے ذہنی شکست اور مرعوبیت کا ہی نتیجہ ہے کہ کچھ ”مسلمان“ انسانی نظاموں میں اسلام سے جڑی مناسبتیں تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور جاہلی ”تہذیب“ کے ان کاموں کا سراغ لگاتے ہیں جنہیں وہ اسلام کی سرگرمیوں اور اس کے کچھ فیصلوں کے حق میں بطور سند پیش کر سکیں۔

اگر کوئی ایسا شخص ہے جو معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتا ہے۔ تاویل و توجیہ اور دفاع و معذرت پر ہی اپنے کو مجبور پاتا ہے تو یہ شخص فی الواقع اسلام کو نہیں پیش کرتا، بلکہ یہ تو ایسا شخص ہے جو ہنوز بودی کھولی اور انتہائی کفناؤنی جاہلیت کی مسموم فضاؤں میں ہی سانس لے رہا ہے، اور اس جاہلیت کے لیے وہ جو از تلاش کرنا چاہتا ہے، جس کا پورا جسم داغدار اور سارا نظام ناقص کا شکار ہے یہ لوگ ہی اسلام پر پوششیں کرتے ہیں، اور اس طرح ان کم فہم اور سادہ لوح مسلمانوں کو بھی جو حقیقت حال سے بے خبر ہوتے ہیں، اس کے دفاع پر مجبور کر دیتے ہیں، گویا وہ کوئی ملزم ہے جو تہمت کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہے!

میں امریکہ میں مقیم تھا، تو وہاں بھی کچھ اسی قسم کے لوگ تھے، جن سے ہم چند متوسلین اسلام کو آٹے دن سابقہ پڑتا۔ ہمارے کچھ ساتھی تو دفاع و معذرت اور توجیہ و تاویل کا موقف اختیار کرتے۔ لیکن میں خود مغربی جاہلیت پر بڑھ چڑھ کر حملے کرتا۔ اس کے بودے دینی عقائد کے نیچے ادھیڑتا۔ اس کی اجتماعی اور اقتصادی پستی اور اخلاقی زبوں حالی کی قلعی کھولتا۔ باپ بیٹے اور

روح القدس کے یہ اتقانیم تلاشہ . یہ انسان کی پیدائشی گنہگاری، اور یہ عقیدہ کفارہ کے تصورات جو کسی سچی عقل و ضمیر کے لیے قابل تسلیم نہیں۔ پھر یہ احتکار کرنے والی سود خوار اور مکروہ و بھیانک سرمایہ داری۔ یہ خود غرض انفرادیت پسندی جس کے ہوتے ہوئے باہمی تعاون و ہمدردی کا سوال ہی نہیں، جب تک قانون کا ڈنڈا سر پر نہ ہو۔ پھر یہ زندگی کا روکھا پھیکا اور گھٹیا مادی تصور، یہ "آزادانہ اختلاط" کے حسین نام سے جانوروں کی سی آوارگی۔ یہ "عورت کی آزادی" کے دل فریب عنوان سے غلاموں کا بازار۔ یہ نکاح و طلاق کے معاملے میں حد سے بڑھی ہوئی فضول خرچی، بیہودگی، بے جا مراسم اور ظاہری ٹیم ٹام جن کا مسائل زندگی سے کوئی جوڑ نہیں۔ یہ نسلی تفریق و امتیاز جس کے مکروہ و خبیث ہونے میں شک کی گنجائش نہیں، اس وقت یہ ساری ہی باتیں میرا نشانہ بنتیں۔ پھر ان کے بالمقابل میں اسلام کی معقولیت پسندی، انسانیت نوازی، خوش مزاجی، عالی ظرفی نیز اس کی عظمت و رفعت اور لامحدود آفاقیت کو پیش کرتا اور بتاتا کہ وہ کس طرح وقت کے عملی مسائل سے بچت کرتا اور خالص فطری اصولوں کے مطابق ان کے حل تجویز کرتا ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جن سے مغربی زندگی میں ہمیں آنے دن سابقہ پڑتا۔ اور جب انہیں اسلام کی روشنی میں پیش کیا جاتا تو شرم سے اہل مغرب کی گردنیں جھک جاتیں۔ لیکن آج کچھ "مسلمان" تعفن انگیز جاہلیت سے ہی بڑی طرح مرعوب ہیں۔ وہ مغرب کے نہایت پچھلے چھسے اور ہر لحظہ بدلتے اصولوں کے انبار اور مشرق کی گھناؤنی مادی خباثتوں میں اسلام سے مشابہت کے پہلو تلاش کرتے ہیں۔

اب شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہی کہ ہم دعوتِ دین کے علمبرداروں کے لیے

یہ قطعاً زیبا نہیں کہ افکار و تصورات، وضع قطع، اور طور طریق کے سلسلے میں جاہلیت کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش کریں۔ اگرچہ ہم پر کتنا ہی دباؤ پڑے۔ ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم جاہلیت کے بجائے اسلامی تصورات، اور اسلامی روایات کو رواج دیں، اور یہ جاہلیت کی دوڑ میں حصہ لیتے، اور شروع میں کچھ دُور تک اس کے شانہ بشانہ چلنے سے ممکن نہیں۔ جیسا کہ ہمارے کچھ بھائیوں کا گمان ہے کہ یہ تو پہلے ہی قدم پر اپنی کمزوری اور شکست کا کھلا کھلا اعتراف ہوگا۔

بلاشبہ معاشرے کی خرافات اور ماحول میں فروغ پائی ہوئی روایات کا دباؤ بہت سخت اور بالخصوص عورت کے لیے تو انتہائی حوصلہ شکن ہوتا ہے، مسلم عورت اس دباؤ میں بالکل پس کر رہ جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جس کے بغیر چارہ کار ہی نہ ہو اسے کیونکر چھوڑ دیا جائے؟ ناگزیر ہے کہ پہلے ہم پیروں کو جمائیں پھر اس جاہلیت پر غالب آئیں۔ ناگزیر ہے کہ جاہلیت جس سطح پر کھڑی ہے اس کی حقیقت کو ہم پوری طرح بے نقاب کریں، اور بتائیں کہ جس نظام اسلامی کے ہم آرزو مند ہیں، اس کی پُر نور اور تابناک بلندیوں کے مقابلے میں وہ کس قدر پستی میں ہے۔

یہ اس طرح ہرگز نہ ہوگا کہ کچھ روز تک ہم جاہلیت کے قدم بہ قدم چلیں، نہ اس طرح ہوگا کہ سرے سے اس سے تعلق ہی توڑ لیں، اور بالکل علیحدہ و کنارہ کش رہیں۔ نہیں، اس سے ملیں، لیکن شانِ امتیاز میں فرق نہ آئے، یسین دین کریں، لیکن خودداری پر آنچ نہ آئے، حق کا اعلان کریں، لیکن پیار کے ساتھ، ایمان پر فخر ہو، لیکن تواضع کے ساتھ، پھر ان سب کے علاوہ ہم اصل حقیقت سے کبھی غافل نہ ہوں بہر ان ذہن میں یہ تصور رہے کہ حق و صداقت بس ہمارے ساتھ ہے۔ باور ہے! ہمارے گرد و پیش جو کچھ ہے سب جاہلیت ہے، اور اس جاہلیت سے اسلام کی طرف آنے کے لیے بہت ہی

لمبی جنت لگانی ہوگی، پھر ان دونوں کے درمیان جو خلیج ہے اس پر پل اس لیے نہیں تعمیر کیا جائے گا کہ یہ سچ راہ میں دونوں آکر مل جائیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہو گا کہ اہل جاہلیت اسلام کی طرف آسکیں۔ خواہ وہ نام نہاد وطن اسلامی کے "نمائشی" مسلمان ہوں یا کہیں اور کے رہنے والے غیر مسلم۔ اور اس طرح وہ تاریکیوں سے نکل کر نور میں آسکیں جن بد بختیوں کے چنگل میں گرفتار ہیں، ان سے آزاد ہو سکیں۔ اور ہم اسلام کو جاننے اور اس کی روشنی میں زندگی گزارنے کا عزم رکھنے والے جس خیر کے لذت آشنا ہیں اس سے ذرہ بھی لذت گیر ہو سکیں۔ اور اگر وہ نہ مانیں تو ہم بھی وہی کہہ دیں جو کبھی ہمارے نبیؐ نے کہا تھا:

لَكُمْ دِينُكُمْ وَ لِىَ دِينِى  
 تمہیں تمہارا دین، اور مجھے میرا دین۔ (کفرون آیت ۶)

## اسلام کی سرپرستی

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا أَوْ أَنْتُمْ  
الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔  
سست نہ پڑو، غم گین نہ ہو، تم ہی اونچے  
ہو اگر تم مومن ہو۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد مبارک کا مصداق وہ خاص حالت  
جہاد ہے، جو میدان جنگ میں ہوتی ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو اس ہدایت میں بڑی  
وسعت ہے، الفاظ کا مہموم اور آیت کی روح شاہد ہے کہ جہاد کی جتنی بھی شکلیں  
ممکن ہیں، ان سب پر یہ حاوی ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ مومن کے احساس و شعور کی ہمیشہ کیا کیفیت ہوگی بھی شخص، یا کسی  
بھی چیز، یا کسی بھی واقعہ، یا کسی بھی نظریہ کے سلسلہ میں اس کا کیا اندازہ فکر ہو۔  
یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک مومن کو اپنی برتری کا کیسا احساس ہوگا، ایمان اور  
ایمانی قدروں پر اسے کتنا ناز ہو، سارے باطل نظام اور باطل قہلیں اور تمام باطل پرست  
انسان اس کی نگاہ میں کس طرح بیچ اور بے وقعت ہوں۔

دنیا کی ساری ہی چیزوں کے مقابلے میں اسے اپنی برتری کا احساس ہو۔ اور وہ تمام  
نظام و قوانین، وہ تمام قدربیں اور روایتیں اور دینیوی طاقتیں اسے حقیر و کمتر نظر آئیں۔  
جو ایمان سے دور اور خدا کی روشنی یا خدا کی سرپرستی سے محروم ہوں۔

وہ چاہے کمزور و ناتواں ہو، بے پار و مددگار ہو، مال و دولت سے محروم ہو  
لیکن پھر بھی اسے اپنی برتری کا احساس ہو۔ بالکل ویسا ہی احساس ہو، جیسا زور  
و قوت کی موجودگی اور مال و دولت کی فراوانی میں ہو۔

اور یہ احساس کبھی سرنگوں ہونے کو تیار نہ ہو، نہ کسی باغی قوت کے سامنے  
جھکنے کو تیار ہو، نہ معاشرتی رسوم و رواج اور باطل قوانین سے مرعوب ہو، اور نہ کسی  
ایسے نظام سے متاثر ہو، جو ایمان کی پشت پناہی سے محروم ہو، اگرچہ دنیا کی نگاہوں  
میں اسے کتنی ہی وقعت حاصل ہو۔

ایک مومن معرکہ جہاد میں جس ثابت قدمی و پامردی کا مظاہرہ کرتا ہے وہ مومن  
کی ایمانی قوت اور اس کے احساس برتری کے ان بہت سے مظاہر میں سے  
بس ایک ہے جن کی طرف آیت کریمہ میں اشارہ ہے۔

پھر مومن کا یہ احساس برتری کسی کھوکھلے عزم، کسی ہیجانی نخوت، یا کسی  
ہنگامی شجاعت کا نتیجہ نہیں ہوتا اس کے پیچھے توحق کی وہ لازوال طاقت ہوتی ہے جو مزاج  
کائنات میں مرکوز ہے، اور جو اقتدار کی منطق، ماحول کے تصورات، معاشرے کی خرافات  
اور تمام جاہلی رسوم و روایات کے دباؤ سے آزاد ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق  
اس خدائے حی و قیوم سے ہے جس کے لیے کبھی فنا نہیں۔

معاشرے کے باطل عقائد و نظریات اور جاہلی رسوم و روایات کا اس شخص پر انتہائی شدید  
دباؤ پڑتا ہے، جو کسی محکم قوت کا سہارا لیے بغیر مقابلے میں نکل آئے۔ غالب و حکمران  
تصورات اور ماحول میں پھیلی ہوئی خرافات کا حملہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ  
جب تک پشت پر کوئی ایسی قوت نہ ہو جس کے سامنے وہ تصورات و نظریات  
مانڈ پڑ جائیں۔ یا کسی ایسے سرچشمے سے تعلق نہ ہو، جو ان کے سرچشمے سے بھی زیادہ ارفع

نہ اعلیٰ اور قوی تر ہو، اس وقت تک ان کی زد سے بچنا دشوار ہوتا ہے۔

جو شخص معاشرے کے مقابلے میں کھڑا ہوتا ہے، اس کی غلط رسوم و روایات، عقائد و نظریات، افکار و تصورات، میلانات و رجحانات اور عزت و ذلت کے پیمانوں سے بغاوت کرتا ہے، اس پر معاشرے کا اتنا شدید دباؤ پڑتا ہے کہ وہ اس کے مقابلے میں ٹک نہیں سکتا جب تک کہ پشت پر کوئی ایسی قوت نہ ہو جو انسانوں سے زیادہ قوی پہاڑ سے زیادہ اٹل اور زندگی سے زیادہ عزیز نہ ہو۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ مومن کو اس طوفانِ کشمکش میں یکہ و تنہا، اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دیتا، کہ وہ عزیمت و غم اور احساسِ ناتوانی سے ہمت چھوڑ بیٹھے۔ بلکہ وہ اس کے سر پر شفقت و محبت کا ہاتھ رکھتا اور اسے یہ جاں نواز پیغام دیتا ہے:

وَلَا تَيْهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ  
الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝  
عزت نہ پڑو، غم گین نہ ہو۔ تم ہی اعلیٰ  
ہو، اگر تم مومن ہو۔

(آل عمران ۱۳۹)

اس موقع پر لازماً عزیمت و غم کا بھی حملہ ہوتا ہے، اور احساسِ ناتوانی کا بھی۔ یہ ہدایت آتی ہے تاکہ مومن اس کے ذریعہ ان دونوں کا مقابلہ کرے۔ جہاں وہ اس موقع پر صبر و استقامت سے کام لے، وہیں اپنی عظمت و بلندی کے احساس سرشار بھی ہو وہ سرکش قوتوں، نامعقول قدروں، جاہلی نظریوں، باطل نظاموں، بے جا رسموں نامناسب عادتوں، ترک و اختیار کے غلط پیمانوں اور گمراہی پر متحد جتھوں سے ذرا بھی مرعوب نہ ہو، بلکہ انہیں اپنے سے کمتر اور فروتر سمجھے۔

اور غور کرو تو حقیقت بھی یہی ہے۔ ہر لحاظ سے بلند و برتر مومن ہی ہے۔ اس کا سہارا سب سے بڑا سہارا ہے، اس کا سرچشمہ سب سے اونچا سرچشمہ ہے۔ بھلا اسے



انسانوں سے کیا سروکار؟ ساری دنیا سے کیا علاقہ؟ ونبوی قدرداروں کی لے سے کیا پروا؟  
انسانی پیمانوں سے کیا واسطہ؟ وہ تو اللہ ہی سے لیتا، اللہ ہی کی طرف پلٹتا، اور  
اللہ ہی کے راستہ پر چلتا ہے۔

تصورِ الہ کے لحاظ سے بھی وہی بلند ہوتا ہے کیونکہ ایمان باللہ کی جو شکل اسلام  
نے پیش کی ہے، خدا شناسی یا معرفت الہی کی مکمل ترین شکل ہے۔ اور اگر اس روشن،  
تابناک، متوازن اور پر جمال شکل کا موازنہ بت پرستانہ نظریات عیسائی خرافات یہودی  
تصورِ ایاکروہ و بھیمانک مادی مذاہب کی بے حساب موثر گافیوں سے کیا  
کیا جائے۔ یا ان تصورات و عقائد اور ان مذاہب سے کیا جائے، جو قدیم و جدید فلسفوں  
نے پیش کیے، تو عقیدہ اسلامی کی عظمت نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔  
اور اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ علم و عرفان کی ان بلندیوں کو چھو لیتے ہیں۔ حقیقت میں  
وہی ارفع و اعلیٰ اور وہی بلند و برتر ہیں۔

زندگی کی وہ قدریں اور وہ پیمانے جن کی بنیاد پر کسی کے محترم یا ذلیل ہونے کا حکم لگایا  
جاتا ہے، یا جن کی روشنی میں کسی فعل یا کسی واقعہ کا فیصلہ کیا جاتا ہے ان کے سلسلہ میں بھی مومن کا  
تصور جتنا بلند ہوتا ہے، کسی اور کا نہیں ہو سکتا، عقیدہ اسلامی جس کی بنیاد خدا  
شناسی ہے، جس کا سرچشمہ صفات الہی سے صحیح وابستگی ہے، جس کا منبع ان قدروں  
سے آگہی اور ان حقائق کی جانکاری ہے جن کا تعلق اس چھوٹے سے کرۂ زمین سے  
ہی نہیں، بلکہ پوری کائنات وسیع و لامحدود کائنات سے ہے، وہ عقیدہ مومن  
کو قدروں اور پیمانوں کا اتنا بلند اور محکم تصور دیتا ہے کہ یہ ناقص اور بودی انسانی  
قدریں ان کے سامنے ہیچ نظر آتی ہیں۔ اور ایسا ہونا فطری بات ہے کیونکہ ان  
انسانوں کا علم ناقص ہے۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ پاؤں تلے کے علاوہ انھیں کچھ نظر  
ہی نہیں آتا۔ اسی لیے کسی ایک پیمانے پر انہیں قرار نہیں۔ ان کے پیمانوں کی عمر تو ایک

فسل کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ حدیہ ہے کہ ایک ہی شخص کے باب میں صبح شام میں ان کے پیانے بدلتے رہتے ہیں۔

جذبات و احساسات، خیالات و رجحانات اور اخلاق و معاملات کے لحاظ سے بھی وہی بلند ہوتا ہے، کیونکہ جس خدا پر اس کا ایمان ہوتا ہے۔ وہ تمام اچھائیوں سے آراستہ اور ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ سارے اچھے نام اور ساری اچھی صفات اسی کے لیے ہیں۔ تمام اچھائیوں سے متصف خدائے تعالیٰ کا یہ عقیدہ اس کو رخصت و بلندی، طہارت و پاکیزگی، عفت و خداترسی اور نیکو کاری پر اکساتا ہے۔ اس کے اندر خدا کی سچی جانشینی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اسے آخرت کی ان کامرانیوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، جن کے سامنے دنیوی آلام و مصائب کی کوئی حقیقت نہیں مومن کو اس سے اتھاہ قلبی سکون اور بے پناہ روحانی سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کے آسمان تجلیل پر یقین و اطمینان کے اتنے تارے جھک گاتے تگتے ہیں کہ پھر وہ ساری محرومیوں اور ساری اذیتوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔

زندگی کے نظاموں اور رہن سہن کے لحاظ سے بھی وہی بلند ہوتا ہے۔ ایک مومن جب سارے قدیم و جدید انسانی نظاموں کا جائزہ لے کر خدائی نظام زندگی اور خدائی شریعت سے ان کا موازنہ کرتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ زندگی کے وہ سارے نظام اس نظامِ کامل کے سامنے بچوں کی بے معنی حرکتوں اور اندھوں کی ٹاماک ٹوٹیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اور اس وقت جہاں اسے انسانیت کی گمراہی، محرومی اور بدبختی پر ترس آتا ہے، وہیں اپنی بلندی و برتری کا بھی احساس ہوتا ہے۔

مغزور و بدست طاقتوں، جاہلیت کے حکمراں پیمانوں، اور کھوکھلے تمدنی

یاد رہے جاہلیت کسی مخصوص دور کا نام نہیں۔ جاہلیت تو اس کیفیت کا نام ہے جو ہر اس موقع پر عود کرتی ہے جب کوئی معاشرہ اسلامی بیخ سے ہٹ جاتا ہے۔ یہ جاہلیت پہلے بھی تھی آج بھی ہے اور آئندہ بھی ہو سکتی ہے۔

مظاہر کے مقابلے میں قرن اول کے مسلمانوں کا یہی انداز تھا۔

مشہور ایرانی کمانڈر رستم کے کیمپ میں جاہلی رسوم، جاہلی تصورات، جاہلی روایا اور جاہلی خرافات کے مقابلے میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کا یہی کردار سامنے آتا ہے۔ ابو عثمان نہدی سے روایت ہے کہ جب مغیرہ دریا کا پل عبور کر کے ایرانی لشکر میں پہنچے، تو ان لوگوں نے مغیرہ کو بٹھالیا، اور آگے جانے کے لیے رستم سے اجازت طلب کی۔ اس موقع پر وہ بہت ہی نفرت و حقارت سے پیش آئے مروت و انسانیت اور بھلمناہت کی جیسے انھیں ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ پھر مغیرہ بن شعبہ آگے بڑھے۔ اعیانِ مملکت اپنی خاص وضع میں تھے۔ سروں پر تاج تھے اور جسم پر زرتار پوشاکیں اور قالینیں تقریباً تین چار سو قدموں کی دوری میں سجھی ہوئی تھیں گویا تین چار سو قدم چلنے کے بعد کہیں رستم تک پہنچنا ممکن تھا۔ مغیرہ نہایت شان کے ساتھ آگے بڑھے اور جا کر بے تکلف شاہی تخت پر بیٹھ گئے۔ اسی لمحے سارے درباری ان پر ٹوٹ پڑے انھیں گھسیٹ کر نیچے لائے، اوز زمین پر دے پٹخا۔ حضرت مغیرہ نے کہا: میں سنتا تھا تم لوگ عاقل و بالغ اور ہوش مند لوگ ہو، لیکن آج کھلا کہ تم سے زیادہ نادان قوم کوئی نہیں۔ ہم عربوں کا تو یہ حال ہے کہ ہم میں سب برابر ہیں۔ کوئی کسی کو غلام نہیں بناتا الا آنکہ وہ اس کا دشمن ہو۔ میں سمجھتا تھا تمہارے ہاں بھی یہی بات ہوگی، اسی لیے میں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ مگر تم نے یہ جو کچھ کیا، یہ کہاں کی انسانیت تھی۔ اگر تم پہلے ہی مجھے بتا دیتے کہ ہم میں کچھ آقا ہیں اور کچھ غلام اور یہ باتیں ہماری تہذیب کے خلاف ہیں۔ تو میں ایسا کیوں کرتا۔ پھر میں خود سے تو آیا نہیں تھا، تم نے ہی مجھے بلایا تھا خیر آج مجھے اندازہ ہوا کہ تمہارا چراغ اب جلد ہی گل ہونے والا ہے، اب جلد ہی تمہیں تخت و تاج سے ہاتھ دھونا ہے کہیں ان عادات و اطوار اور ان جہالتوں کے ساتھ دنیا میں کوئی حکومت چلتی ہے؟! اسی طرح جنگِ قادسیہ سے پہلے رستم اور اس کے حاشیہ نشینوں کے درمیان

ربیع بن عامر کا یہی کردار سامنے آتا ہے:

”حضرت سعد بن وقاص نے جنگ قادسیہ سے پہلے حضرت ربیع بن عامر کو ایرانی کمانڈر رستم کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ آئے تو دیکھا، مچھلیں قالینوں پر پڑی ہیں گاؤتکیے لگے ہیں بیش قیمت ندر جو اہر انپی چمک دمک سے لگا ہیں خیرہ کر رہے ہیں۔ اور رستم سر پر تاج رکھے انتہائی شان سے زریں تخت پر جلوہ افروز ہے حضرت ربیع بن عامر گھوڑے پر بیٹھے ہاتھوں میں ایک ڈھال لیے، اور جسم پر کچھ لوسیدہ کپڑے پہنے اندر داخل ہوئے، وہ گھوڑے پر سوار ہی رہے، یہاں تک کہ قالینوں کے کچھ حصے روند گئے، پھر اتر کر گھوڑے کو کسی گاؤتکیے سے باندھا، اور ہتھیار اچھلنے ہوئے سر پر خود (آہنی ٹوپی) رکھے ہوئے بڑھے۔ درباریوں نے کہا: ہتھیار اتار دو۔ جواب دیا: میں خود تو آیا نہیں ہوں، تمہارے بلانے پر آیا ہوں، مجھے یوں ہی رہنے دو، ورنہ میں واپس جاتا ہوں۔ رستم نے کہا: چھوڑ دو۔ چنانچہ وہ تکیوں کو نیزے سے کو نچتے ہوئے آگے بڑھے۔ رستم نے پوچھا: تمہارے آنے کی غرض کیا ہے؟ جواب دیا: اللہ نے ہمیں بھیجا ہے تاکہ جسے وہ توفیق دے، اسے ہم بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر دنیا و آخرت کی فراخیوں میں پہنچائیں، اور دیگر مذاہب کی زیادتیوں سے بچا کر اسلام سے ہم کنار کریں۔“

حالات بدلتے ہیں مسلم مغلوب و مفتوح اور مادری قوتوں سے محروم ہو جاتا ہے لیکن اس کا یہ احساس اس سے جدا نہیں ہوتا کہ وہی بلند و برتر ہے۔ وہ جب تک مومن رہتا ہے اپنے کو فاتح سے اونچا ہی سمجھتا ہے، اس کو یقین ہوتا ہے کہ مغلوبیت کا یہ دور ایک ہنگامی دور ہے، جو گزر کر رہے گا۔ اس کے بعد ایمان کا دور اقبال ہوگا۔ بلاشبہ اس کا بھی احتمال ہے کہ اسی حالت میں اس کا خاتمہ ہو جائے، بھگت پھر بھی

وہ سزگوں کیوں ہو؟ مرنا تو سبھی کو ہے۔ البتہ وہ شہادت سے سرفراز ہو کر جنت کی نعمتوں سے ہم کنار ہوگا، جبکہ اس کا فاتح جہنم کی ہولناکیوں سے دور چار ہوگا۔ اور دونوں میں کتنا فرق ہے، کتنا عظیم فرق! وہ مسلسل اپنے رب کریم کی یہ صدائے جاں نواز سننا رہتا ہے:

لَا يَغُرُّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ  
كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ وَمَتَلَعُ قَلِيلٌ  
لَهُمْ مَا وَابَهُمْ جَهَنَّمُ وَيُبْسِ الْمِصَادُ  
لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ  
جَنَّتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ  
خَالِدِينَ فِيهَا نَزَّلًا مِّنْ  
عِنْدِ اللَّهِ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ  
خَيْرٌ لِّلْآبِرَارِ۔

دنیا میں کافروں کی چلت پھرت تمہیں کسی  
دوسو کے میں نہ ڈالے۔ یہ تو بس چار دن کی بہار  
ہے، پھر تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور وہ  
کتنی بری جائے قرار ہے۔ البتہ جو اپنے  
رب سے ڈرتے رہے، ان کے لیے باغ ہیں  
جن کے نیچے سے نہریں رواں ہوں گی، جہاں  
وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے  
سامانِ ضیافت ہوگا۔ اور جو کچھ اللہ کے

پاس ہے وہی نیکیوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔  
(آل عمران ۱۹۶ - ۱۹۸)

معاشرے میں ایسے عقائد و تصورات کا غلبہ اور ایسے پیمانوں کی حکمرانی ہوتی  
ہے، جو اس کے عقائد و تصورات اور پیمانوں کی بالکل ضد ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی  
یہ احساس اس سے جدا نہیں ہوتا کہ وہی بلندی پر ہے، اور دوسرے پستی میں ہیں۔  
وہ انتہائی بلندیوں سے ان کی طرف دیکھتا ہے۔ اس وقت جہاں اسے اپنی  
خوش نصیبی اور برتری کا احساس ہوتا ہے وہیں ان کی پستی و محرومی پر اسے  
رونا آجاتا ہے۔ بے اختیار اس کا دل چاہتا ہے کہ جس خیر سے وہ خود نہال ہے  
اس خیر کی راہ انہیں بھی کھجھادے۔ جن بلندیوں پر اس کا بسیرا ہے، ان بلندیوں  
تک انہیں بھی پہنچا دے۔

باطل اکڑتا اور ڈینگیں مارتا ہے۔ غراتا اور تیج و تاب کھاتا ہے۔ اس کے چاروں طرف ایسے مصنوعی ہالے ہوتے ہیں، جو اس کے قلب و نگاہ کے لیے حجاب بن جاتے ہیں۔ وہ ان ہالوں سے ہٹ کر اپنے گھناؤنے اور نفرت انگیز ناسوروں کو نہیں دیکھ پاتا۔ مومن غرانے والے باطل اور فریب خوردہ جتھوں کو بلندیوں سے دیکھتا ہے۔ اس طرح وہ پست بہتی یا رنج و ملال کا شکار ہونے کے بجائے اور زیادہ متحرک اور سرگرم ہو جاتا ہے۔ وہ پوری مضبوطی و پامرویی سے حق پر ڈٹتا رہتا ہے۔ اپنے نیچ پر قائم دوائم رہتا ہے۔ نیز ان گمراہ اور فریب خوردہ نادانوں کو صحیح راہ پر لانے کی پیہم کوشش کرتا ہے۔

معاشرہ شہوانی و لچیلیوں اور بیہودہ حرکتوں میں غرق اور کچھڑ مٹی میں ملوث رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ساری بیڑیوں اور بندھنوں سے آزاد ہو کر کھنوب مزے کر رہا ہے۔ اس قسم کے معاشرے میں ہر پاکیزہ اور حلال و طیب شے نایاب ہوتی ہے۔ بدبودار پانی اور کچھڑ مٹی کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں رہتی؛ مومن بلندیوں سے ان کچھڑ میں دھنسنے ہوئے اور مٹی سے چمٹے ہوئے نادانوں کو دیکھتا ہے۔ اور اپنے کو بالکل یکہ و تنہا پاتا ہے۔ مگر اس کو ناتوانی یا حزن و غم کا احساس نہیں ہوتا۔ نہ کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اپنی پاکیزہ و پر نور چادر اتار پھینکے۔ اور خود بھی کچھڑ میں جا ڈوبے۔ بلاشبہ یقین کی یہ لذت اور ایمان کی یہ دولت اس کی برتری کے لیے کافی ہے۔

دین و شرافت، اخلاق و مروت اور ہر پاکیزہ و طاہر اور پر جمال شے سے بیزار معاشرے میں دین پر قائم رہنے والے مومن کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو ہاتھوں میں انگارہ دبائے ہوئے کسی شخص کی ہو سکتی ہے۔ دوسرے اس کی اس کیفیت کا مذاق اڑاتے اور اس کی دینی قدروں پر پھبتیاں کتے ہیں۔ مگر مومن پست بہتی کا شکار

نہیں ہوتا۔ وہ بلند یوں سے ان بے خبر نادانوں پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتا ہے۔ اور پُر نور قافلہ ایمان کے ایک معزز رہنما حضرت نوح علیہ السلام

کی زبان میں کہتا ہے:

اگر تم ہم پر ہنستے ہو، تو ہم بھی تم پر ہنسیں گے،  
جس طرح تم ہنس رہے ہو۔

اِنَّ تَسْخَرُوْا مِنَّا تَسْخَرُوْا  
مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝ (سود ۲۸)

وہ ان آیات الہی کے دستکچوں سے اپنا انجام بھی دیکھتا ہے اور نور سے دشمنی

اور تاریکی سے آشنائی کرنے والے ان نادانوں کا بھی:

یہ مجرم ایمان لانے والوں پر ہنستے تھے۔  
یہ جب ان کے پاس سے گزرتے تو آپس  
میں اشارے کرتے، جب اپنے لوگوں کی  
طرف پلٹتے تو چہکتے ہوئے پلٹتے اور جب  
انہیں دیکھتے تو کہتے: یہ لوگ تو گمراہ ہیں  
— حالانکہ یہ ان پر نگہبان بنا کر نہیں  
بھیجے گئے تھے — تو آج کے دن  
ایمان لانے والے کافروں پر ہنس رہے  
ہیں۔ اونچی مسندوں پر بیٹھے دیکھ رہے  
میں کیوں، کافروں کو جو کچھ وہ کرتے تھے  
اس کا بدلہ مل گیا...؟

اِنَّ الَّذِيْنَ لَجَدُّوْا كَاٰنُوْا مِنَ  
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ  
وَ اِذَا فَرُّوْا بِهِمَّ يَتَّخِضُوْنَ  
وَ اِذَا اُنْقَلَبُوْا اِلٰى اٰهْلِيْهِمْ  
اُنْقَلَبُوْا فِكٰهِيْنَ ۚ وَ اِذَا رَاوْ  
هُم قَالُوْا اِنَّ هٰؤُلَاءِ لَضٰلُوْنَ  
وَ مَا اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ  
فَاٰلِيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ  
الْكُفٰرِ يَضْحَكُوْنَ عَلٰى اُوْرٰٓئِكِ  
يَنْظُرُوْنَ ۚ هَلْ تُؤِْبَ الْكُفٰرِ  
مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ؟

(المطففين ۲۹-۳۶)

اور کفار کی کج سنجھیوں سے تو قرآن کریم ہمیں پہلے ہی آگاہ کر چکا ہے۔

اور جب انہیں ہماری واضح آیت سنائی  
وَ اِذَا اُنْتَلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ

قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا الَّذِينَ آمَنُوا  
أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَآخِرًا

نَدِيًّا؟

جاتی ہیں، تو کافر اہل ایمان سے کہتے ہیں:  
ہم دونوں میں حیثیت کے لحاظ سے کون اچھا  
اور اعلیٰ و انصار کے اعتبار سے کون اچھا

ہے۔

(مریم ۷۶)

کون لوگ اُدبچے ہیں؟ وہ اشرافِ قریش جو محمد کے دشمن ہیں، یا وہ فقراء جو  
آپ پر فدا ہیں؟ کون اچھے ہیں؟ نضر بن حارث، عمرو بن ہشام، ولید بن مغیرہ  
اور ابوسفیان بن عرب؟ یا بلال و عمار اور صہیب و جناب؟ محمد کی دعوت  
اگر بہتر ہوتی تو کیا ان کے پیرو ایسے ہی ہوتے؟ ایسے ہی مفلس و نادار اور بے وقت  
لوگ؟ کہ دارا رقم جیسے معمولی گھرانے کا مرکز بنیں۔ اور کیا ان کے مخالفین اس طرح  
عیش کرتے، ایسی اونچی اونچی کوٹھیوں میں رہتے۔ اس طرح با اقتدار اور صاحبِ جاہ  
و منصب ہوتے؟

زمین کی ہمیشہ یہی منطق رہی ہے۔ کائنات کی رفعتوں سے بے خبر انسانوں کی  
ہر جگہ اور ہر دور میں یہی منطق رہی ہے۔ مگر حکمتِ الہی کا تقاضا ہے کہ عقیدہ زیب  
وزینت سے عاری اور دل ربا چیزوں سے خالی ہو۔ یہاں حاکم کا تقرب ہونہ  
جاہ و اقتدار کا فتنہ یہاں لذتِ کام و دہن کے سماں ہوں نہ طبیعت کو گدگدانے  
والے ارماں۔ یہاں بس جہد و مشقت ہو، جہاد ہو، اور شہادت کے سرخ جام ہوں۔  
تاکہ جو اس طرف آنے، بس اسی کے لیے آئے۔ پورے اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ  
آئے، حیوانی قدروں اور مادی دلفریبیوں سے کٹ کر آئے۔ اور جو چمک دکھ پر فریفتہ  
ہو جو زیب و زینت کا جو بیا ہو، جو مال و دولت کا پرستار اور آسائشوں کا طلب گار ہو  
اور جو میزانِ الہی میں بے وزن ثابت ہو جانے کے بعد بھی انسانی پیمانوں کو وزن  
دیتا ہو وہ اس کو چے میں قدم ہی نہ رکھے۔



مومن زندگی کی قدریں، ترک و اختیار کے پیمانے اور بنیادی عقائد و تصورات۔ بندوں سے نہیں لیتا کہ ان کی ناقدری پر رنجیدہ ہو، وہ یہ ساری چیزیں بس خدا سے لیتا ہے۔ اور وہ اس کے لیے کافی ہے۔ وہ یہ چیزیں انسانی ذہن سے نہیں لیتا کہ ان کی خواہشات کے جھولے میں جھولتا رہے۔ حق کی اٹل میزان سے لیتا ہے، جو کبھی ڈانوا ڈول نہ ہو۔ گویا ان امور میں اس کا تعلق محدود اور فانی دنیا سے نہیں، کائنات کے اصل اور لافانی سرچشموں سے ہوتا ہے۔ بتاؤ اب وہ محزن و غم یا احساس ناتوانی کا شکار کیونکر ہو جبکہ اس کا تعلق خدا سے ہے۔ حق کی اٹل میزان اور کائنات کے اصل سرچشموں سے ہے؟ وہ حق پر ہوتا ہے۔ اور حق کے علاوہ جو کچھ ہے، گمراہی ہے، باطل کے پاس جاہ و اقتدار ہوا کرے، دولت کی ریل پیل ہوا کرے، لاؤشکر کا سیلاب اور انسانوں کی بھیڑ ہوا کرے۔ مگر حق بہر حال حق ہے۔ وہ حق پر ہے۔ اور حق کے علاوہ جو کچھ ہے گمراہی ہے ایک مومن اگر وہ سچ مچ مومن ہے، تو کبھی حق پر گمراہی کو تزیح نہیں دے سکتا، نہ دونوں کو ایک کر سکتا ہے، اگرچہ حالات کتنے ہی بُرے ہوں، زمانہ کتنا ہی ناموافق ہو۔

دَبْنَا لَهٗ تُزِغُ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۗ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ دَبْنَا لَكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

## یہی شاہراہ ہے

قسم ہے بروجوں والے آسمان کی، اور  
اس دن کی جس کا وعدہ ہے، اور شاہد  
اور مشہود کی۔ ناس ہو کھائی والوں کا،  
ایندھن بھری آگ والوں کا، جبکہ وہ  
اس پر بیٹھے ہوئے تھے، اور جو کچھ اہل  
ایمان کے ساتھ کر رہے تھے، اسے دیکھ  
رہے تھے۔ انہیں ان کی صرف یہ بات  
بری لگی کہ وہ اللہ پر ایمان رکھیں، جو غلبہ  
کا مالک اور حدود ستائش کا سزاوار ہے  
جو آسمان اور زمین کی بادشاہت کا  
مالک ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے  
جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں  
سکو ستایا۔ پھر توبہ نہ کی، ان کے لیے  
عذاب ہے جہنم کا، اور ان کے لیے

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ وَ  
الْيَوْمِ الْمَوْعُودِ وَشَahِدٍ  
مَّشْهُودٍ قَتِلَ اصْحَابُ الِ  
خُدُودِ النَّارِ ذَاتِ الْوُقُودِ  
اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ وَهُمْ  
عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ  
شُهُودٌ، وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ  
اِلَّا اَنْ يُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ الْعَزِيزِ  
الْحَمِيدِ الَّذِي لَهٗ مُلْكُ  
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ  
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ، اِنَّ الَّذِيْنَ  
فَتَنُوْا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ  
ثُمَّ لَمْ يُتُوْبُوْا اَفَلَهُمْ عَذَابٌ  
جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا  
الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي  
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ، ذَٰلِكَ  
الْفَوْزُ الْكَبِيرُ، إِنَّ بَطْشَ  
رَبِّكَ لَشَدِيدٌ إِنَّهُ هُوَ  
بُدِيٌّ وَبُعِيدٌ وَهُوَ الْغَفُورُ  
الْوَدُودُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ  
فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ -

(البروج)

عذاب ہے بھڑکتی ہوئی آگ کا بلاشبہ  
جو لوگ ایمان لائے، اور اچھے کام کیے  
ان کے لیے باغ ہیں، جن کے قریب سے  
نہریں رواں ہوں گی، یہی بڑی کامیابی  
ہے۔ بلاشبہ تمہارے رب کی پکڑ بڑی ہی  
سخت ہے۔ اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے  
اور وہ انتہائی معاف کرنے والا اور  
محبت کرنے والا ہے۔ سخت ممالک  
بڑی شان والا، جو چاہے کر ڈالے۔

اصحاب الاخذود کا یہ واقعہ اس قابل ہے کہ مومن داعیان حق اس پر  
کھڑے غور کریں، چاہے وہ کسی بھی جگہ اور کسی بھی دور کے ہوں۔ قرآن کا اسے  
ایک خاص پیرائے میں لینا، ایک خاص تمہید کے ساتھ بیان کرنا، ایک خاص  
زاویے سے اس پر تبصرہ کرنا، اور پیچ پیچ میں مختلف رموز و حقائق کی طرف اشارے  
کرنا صرف اس لیے تھا کہ وہ کچھ گہرے اور واضح خطوط کھینچ دے جن سے آسانی  
اندازہ ہو سکے کہ دعوت حق کا مزاج کیا ہے، اس کے ساتھ ہمیشہ انسانیت کا  
کیا سلوک رہا ہے۔ اور وہ کبھی کیسی جگر پاش مصیبتیں اور زہرہ گداز آزمائشیں میں  
دعوت دین کی روح میں پیش آسکتی ہیں۔ قرآن چاہتا کہ واضح طور پر مومنین  
کے لیے نشانہ راہ متعین کر دے اور انہیں ان تمام مصائب کو کھیلنے کیلئے پہلے سے تیار  
کر دے، جو فیصلہ الہی کے سخت آتے، اور اپنے اندر گونا گوں حکمتیں رکھتے ہیں  
گو ہم انہیں سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

یہ ایک ایسے گروہ کا واقعہ ہے جو اپنے رب پر ایمان لایا، ایمان کا برملا

اعلان کیا، پھر ایسے درندہ خصلت ظالموں کا نشاۃ ستم بنا، جو آزادی ”انسان“ کے دشمن تھے۔ ایک انسان پیدائشی طور پر آزاد، اور قابل احترام ہے۔ اس کو فطری طور پر حق کو قبول کرنے، اور خدا پر ایمان لانے کا حق ہے، مگر وہ ظالم یہ حق چھیننا چاہتے۔ اور اگر کوئی اس حق سے دستبردار نہ ہوتا، تو اس کے لیے سراپا ظلم و ستم بن جاتے۔ اس گروہ نے ایمان کا اعلان کیا، تو انہوں نے درندگی و سفاکی کے سبھر پورے مظاہرے کیے۔ وہ اس کو ستا سنا کر اس کی اذیتوں سے محظوظ ہوئے۔ اور آگ کے الاؤ میں چھونک کر اس کی بے قرار یوں کا پھر شوق نظارہ کرتے رہے!

یہ نفوس زندگی کی بندگی سے آزاد تھے۔ موت اس بھیانک انداز سے ان کے سامنے کھڑی تھی، لیکن زندگی کی محبت انہیں اپنی طرف نہ جھکا سکی۔ وہ زمین کی ساری بندشوں سے آزاد اور راضی علاقے پر پوری طرح غالب رہے کیونکہ عقیدہ زندگی پر غالب رہا۔

ان مومن خیر پسند، اور باند و اشرف نفوس کے مقابلے میں انتہائی سرکش، شر پسند، مجرم اور کہنی طبیعتیں تھیں، یہ آگ کے پاس بھٹتے، کہ دیکھیں، مومنین کس طرح بھلتے اور تڑپتے ہیں، کس طرح آگ زندگی کو کھاتی اور ان نیک افراد کو تودہ راکھ بنا دیتی ہے۔ ان نیک اور صالح مومنین میں سے جب بھی کوئی جوان مرد یا جوان عورت، ننھی بچی یا بوڑھی خاتون، طفل شیرخوار یا پیر کہن سال آگ کے الاؤ میں جھونکا جاتا، ان سرکش طبیعتوں کے خست آمیز نشے میں طغیانی آجاتی، اور آگ کو بھڑکانے والے درندے خون اور آنتوں کے ساتھ خوب شیطنیت کے مظاہرے کرتے!

یہ وہ شر مناک واقعہ ہے جس میں سرکش طبیعتیں انتہائی پستی میں اتر کر

بربریت کی غلیظ کچھڑ میں خوب آلودہ ہوئیں، جس بیہودگی کے ساتھ وہ اس منظر  
جا لکھ سے محظوظ ہوتی رہیں، اس سے انسان تو انسان، درندے بھی شرما  
جائیں، کہ درندے بھی حملہ کرتے ہیں تو اس لیے کہ اس سے بھوک کی آگ بجھائیں  
نہ کہ بیہودگی کے ساتھ شکار کی بے قرار یوں کا نظارہ کریں!

نیز یہی وہ عظیم واقعہ ہے جس میں مومنین کی روحیں رفتوں سے آشنا  
ہوئیں۔ سارے بندھنوں سے آزاد ہو کر وہ بلندی کے اس نقطہء کمال پر پہنچ  
گئیں کہ ساری انسانیت، ہر دور کی انسانیت، ہر نسل کی انسانیت بجا طور  
پر ان پر فخر کر سکتی ہے۔

مادی نقطہ نظر سے دیکھو تو یہاں طغیان کفر ایمان پر غالب رہا، وہ ایمان  
جو نیک، خیر پسند، ثابت قدم اور باعزم دلوں میں بلندی کی آخری سرحد میں  
چھو رہا تھا، اس کشمکش میں بڑی طرح ناکام و سہک سر ہوا۔

قرآن یا حدیث۔ کہیں بھی یہ تذکرہ نہیں کہ اس موقع پر خدا کا ہاتھ حرکت  
میں آیا، ان درندوں کی سفاکیاں رنگ لائیں۔ قوم نوح، قوم ہود، قوم  
صالح، قوم شعیب، قوم لوط، اور فرعون و آل فرعون کی طرح  
ان پر بھی عذاب الہی کے تازیانے برسے۔ اور قسراً الہی نے بالکل  
ان کا صفایا کر دیا۔

مادی نقطہ نگاہ سے دیکھو تو یہ اختتام بہت ہی دل شکن، اور یہ انجام انتہائی

مایوس کن ہے!

کیا بات یہیں ختم ہو گئی؟ کیا ایمان کی بلند چوٹی پر پہنچ جانے والی جماعت  
یوں ہی مٹ گئی؟ اخذ و دکی جائزہ اذیتوں کے ساتھ مٹ گئی؟ اور کیا وحشت و  
بربریت کا مظاہرہ کرنے والا سرکش گروہ یوں ہی بچا رہا۔

بلاشبہ مادی نقطہ نظر سے اس انجام پر روح کو خلش اور ڈول کو کھٹکے ہوتی

ہے!

لیکن قرآن مومنین کو ایک دوسرا ہی تصور دیتا ہے، وہ ایک دوسری ہی حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے۔ وہ انہیں ان قدروں کے مزاج سے آگاہ کرتا ہے، جو ان کی میزان میں، اس معرکے کی سرحدیں بتاتا ہے، جس میں وہ شریک ہیں۔

اس کے نزدیک یہ زندگی، اس زندگی کی لذتیں اور اذیتیں اس دنیا کی کامرانیاں اور محرومیاں ہی قابل لحاظ نہیں۔ یہی وہ پونجی نہیں جس پر سود و زیاں کا فیصلہ ہو۔ نصرت مادی غلبہ و اقتدار کے تنگ دائرے میں ہی محصور نہیں، کہ یہ تو نصرت کی محض ایک صورت ہے۔

خدا کی میزان میں قابل لحاظ چیز صرف عقیدہ ہے، خدا کے بازار میں چلنے والی پونجی تو بس ایمان ہے نصرت کی سب سے ارفع و اعلیٰ شکل یہ ہے، کہ روح مادے پر عقیدہ اذیتوں پر، اور ایمان آزمائشوں پر غالب رہے۔

بلاشبہ اس واقعہ میں مومنین کی رو میں خوف و الم پر غالب رہیں، زمین اور زندگی کے علائق پر حاوی رہیں اور آزمائشوں پر پوری طرح فتحیاب رہیں، وہ اس شان سے غالب رہیں کہ ساری نوع انسانی، ہر دور کی نوع انسانی اس پر فخر کر سکتی ہے۔ اور غور کرو تو یہی اصل غلبہ ہے۔ موت کس کو نہیں آتی، موت تو سبھی کو آتی ہے، اور مختلف انداز سے آتی ہے۔ لیکن سب کے لیے یہ رتبہ بلند کہاں؟! یہ غلبہ و نصرت، یہ شرف و عزت اور یہ ذکر و نام کہاں؟! یہ تو بس انہی کا نصیب تھا۔ یہ خدا کا خصوصی انعام و اکرام تھا کہ وہ نیک رو میں موت میں تو سب کی شریک رہیں، مگر عز و شرف میں سب سے منفرد رہیں۔ پھر عز و شرف بھی ایسا کہ زمین کی وسعتیں بھی

اس کیلئے ناکافی ہوئیں۔ اسی لیے تو نہ صرف روٹے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں میں اس کا چرچا ہوا بلکہ ملائکہ اعلیٰ کے قدسیوں اور آسمان کے فرشتوں میں بھی اس کا شہرہ ہوا۔

مومنین کے لیے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ ایمان کی ہر ذمیت گوارا کر کے خود اپنی جان بچا لیتے، مگر یہ سودا کتنے خسارے کا ہوتا! کتنا عظیم خسارہ ہوتا ان کا بھی، اور ساری ذریعہ انسانی کا بھی! کتنا عظیم خسارہ ہوتا اگر وہ اس تصور کا خون کر ڈالتے، کہ عقیدہ ہی زندگی کی رُوح اور آزادی ہی اس کی جوت ہے۔ اگر سرکش قومیں جسم سے گزر کر رُوح پر بھی حاوی ہو جائیں، تو حقیقت میں یہی موت ہے۔

اس تصور میں کتنی بلندی ہے اور کتنی رعنائی بھی! آگ میں جلتے ہوئے بھی ان کے دل اسی تصور سے معمور تھے۔ اسی تصور کی شمعیں ان کے سینوں میں فروزاں تھیں۔ چنانچہ فانی جسم تو جل جاتے ہیں، مگر یہ بلند تصور نہ صرف فتیاب ہوتا ہے، بلکہ آگ میں پڑ کر اور زیادہ نکھر آتا ہے!

پھر اس معرکے کا میدان بس زمین یا یہ دنیوی زندگی ہی نہیں۔ اور اس کے شرکاء و مشاہدین کسی ایک نسل کے انسان ہی نہیں، زمین کے ہنگاموں میں آسمان کے فرشتے بھی شریک ہیں۔ وہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور سب کے گواہ بھی ہوں گے۔ پھر جن پیمانوں سے وہ انہیں ناپتے ہیں، وہ بھی بالکل مختلف ہیں، انسانی پیمانوں سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ علاوہ ازیں آسمان پر رہنے والی یہ نیک روحیں مادر گیتی کے فرزندوں سے کئی گنا زائد ہیں۔ اور یہ مسلم ہے کہ ان کی مدح و ستائش اور ان کی تعظیم و توقیر کے مقابلے میں انسانی تعریف و تحسین اور انسانی مدح و ستائش کی کوئی قیمت نہیں۔

پھر ان سب کے علاوہ آخرت بھی ہے۔ اور وہی اصل ہے جس سے اس دنیا کا بھی سررشتہ جا کر مل جاتا ہے۔ یہ بات جہاں ایک قطعی حقیقت ہے، وہیں عقیدہ مومن کی جان اور اس کی ایک اہم بنیاد بھی ہے۔

گو یا معرکہ ابھی ختم نہیں ہوا، اصل انجام ابھی سامنے نہیں آیا۔ لہذا واقعات کی چند ظاہری کڑیوں کی ہی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا صحیح نہ ہوگا، کہ یہ محض وہم و گمان ہوگا، سنجیدگی اور حقیقت پسندی سے اسے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

پہلی نگاہ انتہائی تنگ اور محدود نگاہ ہے، جو عجلت پسند انسان کی نگاہ ہے۔ قرآن دوسری وسیع اور دور رس نگاہ ہی مومنین کے اندر پیدا کرنی چاہتا ہے کیونکہ یہی نگاہ صحیح ایمانی تصور کی بنیاد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ایمان و طاعت، آزمائشوں پر صبر، اور فتنوں سے شکست نہ کھانے پر بطور انعام جن چیزوں کا وعدہ فرمایا۔ وہ سچا اسی انداز کی ہیں مثلاً:

(۱) وہ قلبی سکون و اطمینان کی دولت لازوال سے مالا مال ہوں گے:

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ  
بِذِكْرِ اللَّهِ ط الْآيَاتِ الذِّكْرِ  
تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ۔

جو لوگ ایمان لائے، اور جن کے دلوں کو یاد الہی سے اطمینان نصیب ہوتا ہے  
سن لو، یاد الہی سے ہی دلوں کو اطمینان

نصیب ہوتا ہے۔

(الرعد ۲۸)

(۲) وہ خدائے رحمان کی خوشبودیوں سے بہرہ مند ہوں گے، اس کی چاہتوں

سے سرفراز ہوں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا  
الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ  
وُدًّا۔ (صہیم ۹۶)

بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے، جلد ہی رحمان ان کے لیے محبت پیدا کر دے گا۔

(۳) وہ ملائکہ اعلیٰ کی نورانی محفلوں میں فرشتوں کی پاکیزہ و مقدس مجلسوں میں یاد



کیے جائیں گے۔ اور وہاں ان کے چہرے ہوں گے۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا مَاتَ وَلَدُ الْعَبْدِ - قَالَ اللَّهُ لَمَلَأْتُكَ بِهَا: قَبَضْتُمْ وَلَدَ عَبْدِي؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ، فَيَقُولُ: قَبَضْتُمْ ثَمْرَةَ فُؤَادِهِ؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ فَيَقُولُ: مَاذَا قَالَ عَبْدِي؟ فَيَقُولُونَ: حَمْدَكَ وَالسَّتْرَ جَمْعًا. فَيَقُولُ: ابْنُ الْعَبْدِ يَتَنَا فِي الْجَنَّةِ وَسَمُوهُ بَيْتَ الْحَمْدِ. (الترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب بندے کی اولاد مرتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے: میرے بندے کی اولاد تم لے آئے؟ وہ کہتے ہیں: جی ہاں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اس کے دل کا پھل توڑ لائے؟ وہ عرض کرتے ہیں: جی ہاں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تب میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ عرض کرتے ہیں: اس نے تیری حمد کی اور اتنا اللہ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بناؤ، اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔

وَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: إِنَّا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي، وَإِنَّا مَعَهُ حِينَ يَذْكُرُنِي، فَإِذَا ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ، ذَكَرْتَهُ فِي نَفْسِي، وَإِنِ ذَكَرَنِي فِي مَلَأٍ، ذَكَرْتَهُ فِي مَلَأٍ خَيْرٍ مِنْهُ، فَإِنِ اقْتَرَبَ إِلَى شَيْءٍ، اقْتَرَبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَإِنِ اقْتَرَبَ إِلَى ذِرَاعٍ، اقْتَرَبْتُ مِنْهُ نَاعًا، وَإِنِ أَنَانِي مَشِيًا أَتَيْتُهُ هَرُورًا. (بخاری شریف و مسلم شریف)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے متعلق بندے کا جیسا گمان ہوگا مجھ کو ویسا ہی پائے گا۔ اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے، وہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے، تو میں کبھی اسے دل میں



كَمْ يَلْحَقُوْا اِبْهِيْمَ مِّنْ خَلْفِهِمْ  
اَرَخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ  
يَحْزَنُوْنَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةِ  
مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلِ وَّ اِنَّ اللّٰهَ  
لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(آل عمران ۱۶۹-۱۷۱)

کبھی وہ خوش ہو رہے ہیں، جو ان کے  
پچھے رہ گئے ہیں، ابھی ان سے ملے نہیں  
ہیں کہ انہیں بھی نہ کوئی خوف ہوگا اور  
نہ کوئی حزن وہ اللہ کے انعام اور اس کے  
فضل پر مگن ہیں اور مطمئن ہیں کہ اللہ اہل  
ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار باغی و سرکش اور نافرمان بندوں کی آخرت  
میں پکڑ کرنے اور دنیا میں ایک وقت تک انہیں ڈھیل دیتے رہنے کا وعدہ  
فرمایا۔ بلاشبہ کبھی کبھی اس نے دنیا میں بھی پکڑ کی۔ لیکن یہ اصل اور بھرپور سزا نہ تھی  
کہ اصل اور بھرپور سزا تو آخرت میں ہی ملے گی۔

وَلَا يَخْرُجُ مِنْكَ الْقَلْبُ الَّذِيْنَ  
كَفَرُوْا فِي الْبَلَادِ، مَتَاعٌ قَلِيْلٌ  
ثُمَّ مَا وَّهُمْ جَهَنَّمَ وَيَبُئْسَ  
الْمِهَادُ۔ (آل عمران ۱۹۶-۱۹۷)

دنیا میں کافروں کی چلت پھرت تمہیں  
کسی دھوکے میں نہ ڈالے، یہ تو بس  
چار دن کی بہار ہے، پھر تو ان کا ٹھکانہ  
دوزخ ہے، وہ کتنی بری جگہ قرار ہے۔  
یہ ظالم جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ کو اس سے  
غافل نہ سمجھو، وہ تو انہیں بس اس دن  
کے لیے ٹال رہا ہے، جبکہ آنکھیں پٹی کی  
پھٹی رہ جائیں گی، اپنے سر اٹھائے  
دوڑتے ہوں گے۔ ان کی نگاہیں ان کی  
طرف پلٹ نہ سکیں گی اور ان کے دل اڑے  
جاتے ہوں گے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا  
يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ، اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ  
لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ  
مُهْطِعِيْنَ مُّقْنِعِيْ رُءُوسِهِمْ  
لَا يَدْرُكُ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ  
وَ اَنۡفُدَّهُمْ هَوَآءُ

(ابراہیم ۲۲-۲۳)

اب چھوڑ دو انہیں۔ باتیں بنائیں، اور کھیلیں، یہاں تک کہ وہ دن ان کے سامنے آجائے۔ جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ وہ دن جبکہ یہ قبروں سے تیزی سے نکلیں گے، جیسے کسی نشانے کی طرف دوڑ رہے ہوں۔ نگاہیں جھکی ہوں گی اور ان پر ذلت چھا رہی ہو گی۔ یہ ہے وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

فَذَرُهُمْ يَخْوَضُونَ وَيَلْعَبُونَ  
حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي  
يُوعَدُونَ - يَوْمَ يَخْرُجُونَ  
مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَانَتْهُمْ  
إِلَىٰ نَصِيبٍ مِّنْ فِضْوَنٍ خَاشِعَةً  
أَبْصَارُهُمْ تَرَاهُمْ ذَلِيلًا  
ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا  
يُوعَدُونَ . (المعارج ۲۲-۲۴)

اس طرح انسانی زندگی کا سرا ملاد اعلیٰ کی زندگی سے جا ملا، دنیا کا تعلق آخرت سے مجھڑ گیا، اور تنہا زمین ہی معرکہ خیر و شر، رزم حق و باطل اور کشاکش ایمان و طغیان کا میدان نہ رہی، دنیوی زندگی ہی اس سلسلے کی آخری کڑی یا اس کشاکش کے فیصلے کی آخری میعاد نہیں ٹھہری۔ نیز زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والی لذتیں اور اذیتیں، شاد کامیاں اور محرومیاں ہی خدا کی میزان میں قابل لحاظ نہ ہوں۔

اس طرح زمان و مکان کی حدیں ٹوٹ گئیں، قدروں اور پیمانوں میں وسعت آگئی۔ مومن کی دنیا میں لامحدود ہو گئیں۔ اس کے عزائم اور حوصلوں میں بلندی آگئی۔ ظاہر ہے اس کے بعد مومن کی نگاہ میں دنیا اور اس کی لذتوں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ وہ توجوں جوں آفاق کا مشاہدہ کرتا، اور کائنات کی وسعتوں سے بانجبر ہوتا ہے، اس کے اندر رفعت و بلندی آتی جاتی ہے۔ اصحاب الاخدود کا یہ واقعہ اس پہلو سے انتہائی اہم اور اس بلند و اشرف اور جامع تصور ایمانی کا بہترین شاہکار ہے۔

واقعہ اصحاب الاخذود سے دعوتِ دین کے مزاج اور داعیِ حق کے

موقف پر ایک اور زاویے سے روشنی پڑتی ہے۔

تاریخِ دعوت نے زمین پر تحریکِ اسلامی کے مختلف انجام دیکھتے ہیں۔

اس نے قومِ نوح، قومِ ہود، قومِ شعیب اور قومِ لوط کی بربادی بھی دیکھی

ہے۔ اور مختصر سی مومن جماعت کی نجات بھی۔ مگر یہاں پہنچ کر قرآن خاموش

ہو جاتا ہے۔ وہ نجات یافتہ گروہ کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ ان کے بعد

کا دور کیسا رہا۔ یہ مثالیں اس سنتِ الہی کا پتہ دیتی ہیں کہ عذابِ الہی کا تازیانہ

کبھی دنیا میں ہی نمودار ہو کر سرکش منکرینِ حق کی گردنِ استکبار توڑ دیتا ہے۔ گرچہ

اصل اور بھرپور سزا تو آخرت میں ہی ملے گی۔

تاریخِ دعوت نے فرعون اور آل فرعون کی غرقابی اور موسیٰ اور قومِ موسیٰ کی

سر بلندی کا بھی مشاہدہ کیا ہے، اور یہ بھی دیکھا ہے کہ قومِ موسیٰ جب تک خیر و

صلاح میں سب سے نمایاں رہی اس وقت تک وہ قوت و اقتدار کی مانگ رہی

گرچہ وہ کبھی کامل استقامت کا ثبوت نہ دے سکی نہ زمین پر دینِ الہی کو بہ

حیثیت ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی قائم کرنے کا ہی رتبہ بلند حاصل کر سکی۔ یہ مثال

پہلی مثالوں سے کچھ مختلف ہے۔

تاریخِ دعوت نے ان مشرکین کی بربادیوں کا بھی نظارہ کیا ہے جنہوں نے

حق کو قبول کرنے اور رسولِ خدا پر ایمان لانے سے مسلسل اعراض کیا، اور ان پیروانِ

رسول کا دور اقبال بھی دیکھا ہے جو ایمان و یقین کی تلوار ہاتھ میں لے کر سارے

عالم پر چھا گئے۔ اور پھر نظامِ الہی کی ایسی زبردست اور پر شکوہ سلطنت قائم

کی جو اپنی نظیر آپ تھی، کہ ویسی سلطنت پہلے کبھی قائم ہوئی تھی نہ بعد۔ میں ہی

فام ہو سکتی۔

راہ دعوت و عزیمت میں اور کبھی مختلف انجام سامنے آتے رہتے ہیں۔ تاریخ آج بھی انہیں ڈہرا رہی ہے، اور آئندہ بھی ڈہراتی رہے گی۔ مگر ان سب کے پہلو بہ پہلو وہ انجام بھی سامنے آنا ناگزیر تھا جس پر واقعہ اُحدود سے روشنی پڑتی ہے۔

اس طرح کا انجام سامنے آنا ناگزیر تھا کہ مومنین بچ نہ سکیں اور کفار کی گرفت نہ ہوتا کہ علمبردارانِ حق آگاہ رہیں کہ راہ دعوت میں کبھی اس قسم کے انجام سے بھی سابقہ پڑ سکتا ہے۔ نیز ان کے دائرہ اختیار میں کچھ بھی نہیں، ان کی لگام اور عقیدے کی زمام سب خدا کے ہی ہاتھ میں ہے!

ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کریں، پھر چلے جائیں ان کا فرض ہے کہ وہ اللہ سے ہی رشتہ جوڑیں۔ عقیدے کو زندگی پر ترجیح دیں، ایمان کو آزمائشوں پر غالب رکھیں اور فکر و عمل میں اخلاص و تلہیت پیدا کریں۔ انجام کیا ہوگا؟ کاوشوں کا نتیجہ کیا ہوگا؟ زمانے کا رد عمل کیا ہوگا؟ یہ ان کے سوچنے کی چیزیں نہیں، یہ تو خدا کی مرضی پر ہے، وہ جو چاہے گا، فیصلہ فرمائے گا چاہے گا تو ان کے ساتھ پھلی کسی تحریک کا سامنا کرے گا، یا وسیع علم و حکمت کی بنیاد پر کسی اور انجام کا فیصلہ فرمائے گا۔

وہ تو اللہ کے مزدور ہیں۔ جہاں بھی جس وقت بھی اور جس طرح بھی وہ چاہے گا، ان سے کام لے گا۔ پھر انہیں ان کی مزدوری ملے گی! دعوت کا انجام کیا ہوگا؟ یہ نہ ان کے اختیار میں ہے، نہ وہ اس کے مکلف ہیں، کہ یہ تو مالکِ کام ہے مزدوروں کا کام نہیں! ان کا کام تو بس یہ ہے کہ اپنی ڈیوٹی ادا کریں اور اپنی مزدوری لیں۔ پہلی قسط میں انہیں قلب و ذہن کی یکسوئی، احساس و شعور کی بلندی،

نکر و تصور کی رعنائی سارے بندھنوں سے رستگاری اور خوف و اضطراب سے آزادی ملے گی۔

دوسری قسط میں ملائکہ اعلیٰ کی مدح و ستائش اور فرشتوں کی تعظیم و تکریم کا گراں بہا صلہ ملے گا۔

پھر سب سے بڑی قسط آخرت میں ملے گی: آسان حساب، عظیم نعمتیں۔ اور ہر قسط کے ساتھ ان سب سے بڑی نعمت ملے گی: خدا کی خوشنودی اور یہ رتبہ بلند کہ وہ خدا کے منتخب بندے ہیں۔ وہ اس کے فیصلے نافذ ہونے کا ذریعہ اور اس کی قدرت کے ظہور کا واسطہ ہیں۔ وہ زمین پر جو کچھ کرنا چاہے گا ان ہی کے ذریعہ سے کرے گا۔

قرآنی تربیت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بالکل یہی کیفیت ہو گئی تھی وہ اپنی شخصیت سے آزاد اور ذاتی اختیارات سے بالکل دستبردار ہو گئے تھے۔ وہ بس مالک کے مزدور تھے، کہ خدا کی رضا ان کی رضا تھی اور خدا کی پسند ان کی پسند تھی۔

قرآنی ہدایات کے ساتھ ساتھ رسول خدا کی تربیت بھی اپنا کام کرتی۔ وہ قلب و نگاہ کا رخ جنت کی طرف پھیر کر خدا کی مشیت پر اور ان کے فیصلوں پر صبر کرنے اور ہمیشہ راضی برضا رہنے کی ترغیب دیتی۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمارؓ اور ان کے ماں، باپ کو دیکھتے کہ وہ ملے کی گھاٹیوں میں بڑی بے دردی سے ستائے جا رہے ہیں۔ اس وقت آپؐ اس سے زیادہ کچھ نہ فرماتے؛

صبر ال یا سر موعدکم الجنة۔ آل یا سر صبر کرو، تمہارا ٹھکانہ

جنت ہے۔

حضرت جناب بن اللارت فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سائے میں ایک چادر کا تکیہ بنائے آرام فرما رہے تھے ہم نے بطور شکایت عرض کیا: آپ خدا سے نصرت کی درخواست نہیں کرتے؟ ہمارے لیے آپ دعا نہیں فرماتے؟ آپ نے فرمایا: تم سے پہلے تو یہ حال تھا کہ گرٹھا کھو دکراؤمی کو گاڑ دیا جاتا، پھر سر پر آرا رکھ کر بیچ سے چیر دیا جاتا، اور لوہے کی کنگھیاں کی جاتیں جن سے گوشت کھرچ جاتا، لیکن پھر بھی وہ دین سے برگشتہ نہ ہوتا۔ بخدا یہ دین قائم ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ سوار صنعاء (مین) سے شہر موت تک کا سفر کرے گا، اور راستہ میں اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا بس چرواہے کو بھیر پوں کا ڈر رہے گا۔ مگر (افسوس کہ) تم جلدی مچاتے ہو (بخاری) ہر واقعہ کے پیچھے خدائے تعالیٰ کی کوئی حکمت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے جو ہستی پوری کائنات کا نظم چلاتی ہے جو اس کے ایک ایک گوشے کی خبر رکھتی ہے جو اس کے لیے سارے واقعات و حوادث کی نگرانی کرتے اور اس کے تمام اجزاء میں سازگاری پیدا کرتی ہے۔ وہی ہستی یہ جان سکتی ہے کہ اس کے مخفی پردہ بے غیب میں کیا کیا حکمتیں پنہاں ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد ہم پر ایک واقعہ کی حکمتیں کھلتی ہیں، جبکہ خود اس کے دور کے لوگ ان سے بالکل بے خبر تھے اور شاید ان کے ذہن میں رہ رہ کر یہ سوال بھی ابھرتا رہا ہو گا کہ: کیوں؟ میرے رب ایسا کیوں؟ خود یہ سوال کرنا ہی ایسی جہالت ہے جس سے مومن بچتا ہے کیونکہ اول روز سے ہی وہ جانتا ہے کہ ہر فیصلہ الہی کے پیچھے کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔ پھر اس کے عالم تصور کی وسعت اس کی قدروں اور پیمانوں کی آفاقیت اور اس کے زمان



و مکان کی لامحدودیت شروع سے ہی اس طرح کے سوالات سے اسے بے نیاز کر دیتی ہے، اور وہ کاروانِ قضا و قدر کے ساتھ پورے سکون و اطمینان کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

قرآن ایسے افراد تیار کرنا چاہتا تھا جو اس بارِ امانت کو اٹھا سکیں۔ ایسے افراد کے لیے ضروری تھا کہ ان میں اتنی مضبوطی اور اتنی بے لوثی ہو کہ وہ — ہر چیز ٹٹاتے ہوئے اور ہر طرح کی اذیتیں جھیلتے ہوئے بھی دنیا کی کسی چیز پر پرشوق نہ لگائیں، نہ ڈالیں، جن کی نگاہیں صرف آخرت کی طرف اٹھیں، جو صرف رضائے الہی کے طلب گار ہوں جو حیاتِ دنیا کی پوری مسافت تکلیفوں اذیتوں، مصیبتوں اور محرومیوں کے ساتھ طے کرنے کے لیے تیار ہوں جو قربانیوں پر قربانیاں پیش کرنے، حتیٰ کہ خطرات کے نرغے میں گھرے رہنے کیلئے ہر آن مستعد ہوں، پھر ان سب کا صلہ وہ دنیا میں نہ چاہتے ہوں، اگرچہ یہ صلہ دعوت کی کامیابی، اسلام کی سر بلندی، مسلمانوں کی فتح و ظفریابی، حتیٰ کہ قہر الہی کے نتیجہ میں ظالموں کی تباہی و بربادی ہی کیوں نہ ہو!

چنانچہ جب اس طرح کے نفوس تیار ہو گئے جو اس بات سے آگاہ تھے کہ اس دنیا میں انہیں صرف دینا ہی دینا ہے، اور حق و باطل کے درمیان فیصلے کے لیے آخرت کا انتظار کرنا ہے۔ نیز انہوں نے کامل اخلاص و ولایت کا ثبوت دے دیا، تو اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت سے نواز کر انہیں زمین کا امین بنایا، شخصی مصالح اور ذاتی اغراض کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ شریعت الہی جیسی عظیم امانت کو اٹھا سکیں۔ اور سچ پوچھو تو وہ امین بننے کے پوری طرح اہل ہو بھی چکے تھے کیونکہ ان کی نیوی منفعت کا وعدہ نہیں تھا کہ اس کے طلب گار ہوتے، کسی نیوی منفعت کی طرف انہوں نے سر

سے دیکھا ہی تھا کہ اس سے وہ نوازے جاتے۔ وہ سچ مچ اللہ تعالیٰ کے لیے بے لہو ہو چکے تھے، کہ رضائے الہی کے سوا ان کے ذہن میں کوئی سودا نہ تھا۔  
 وہ آئینیں جن میں فتح و نصرت اور مالِ غنیمت، مومنین کے ہاتھوں میں شریکین کو تباہ کرنے کے وعدے تھے، وہ سب مدینہ میں نازل ہوئیں۔ جبکہ یہ ساری چیزیں مومنین کے پروگرام سے خارج ہو چکی تھیں، اور وہ ان چیزوں کے ذرا بھی آرزو مند نہ رہ گئے۔ پھر فتح و نصرت آنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مشیت الہی اس نظام کو واقعاتی دنیا میں ایک ایسی عملی اور محسوس شکل دینا چاہتی تھی، جسے قومیں اپنی نگاہوں سے دیکھ سکیں۔ گویا یہ فتح و ظفر مندی ان کی قربانیوں کے صلے میں نہ تھی بلکہ فیصلہ الہی اور تقدیر الہی کے تحت تھی، جو گونا گوں حکمتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ گرچہ ہم ان سے بے خبر ہوتے!

یہ ایک اہم نکتہ ہے جس پر داعیانِ حق کو مٹھ کر غور کرنا چاہیے، خواہ وہ کسی بھی جگہ ہوں، کسی بھی دور سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس سے نشاناتِ راہ بالکل روشن ہو کر سامنے آجائیں گے۔ نیز ان فداکارانِ حق کے پیروں کو جماؤ حاصل ہوگا، جو بہر قیمت اس راہ کو طے کرنے کا عزم رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ وہ اس خوف ناک راستہ کو طے کرتے ہوئے جو انسانی کھوپڑیوں اور کٹی ہوئی آنتوں سے پٹا ہوا اور بے گناہوں کے خون سے لالہ زار ہوگا، اسی دنیا میں فتح و نصرت کے آرزو مند یا حق و باطل کے درمیان فیصلے کے خواہاں نہ ہوں گے۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ خود اپنے دین کے لیے انہیں فتح و نصرت سے نوازنا چاہے گا تو نوازے گا۔ لیکن یہ ان کی قربانیوں کا صلہ نہ ہوگا۔ ہاں یہ صلہ نہ ہوگا، کیونکہ دنیا صلے کی جگہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ خود خدا کے ایک فیصلے کا نفاذ ہوگا، جس کے لیے وہ اپنے کچھ منتخب بندوں سے کام لے گا۔ اور یہ انتخاب بلند ان کے عز و شرف کے لیے

کافی ہے، کہ اس کے سامنے نہ دنیا کوئی چیز ہے نہ زندگی یا اس کی تلخیوں اور مسرتوں کی کوئی حقیقت ہے۔

قصہ اُخدود پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن پاک کا ارشاد ہے :

وَمَا تَقْمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ  
يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ  
الْحَمِيدِ (البروج)

اور انہیں ان کی صرف یہ بات بری لگی  
کہ وہ اللہ پر ایمان رکھیں جو غلبہ کا مالک  
اور حمد و ستائش کا سزاوار ہے۔

اس سے ایک اور نکتے کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو اس قابل ہے کہ دعوتِ دین کا کام کرنے والے مومنین اس پر غور کریں، خواہ وہ کسی بھی دور یا کسی بھی سرزمین سے تعلق رکھتے ہوں۔

اہل ایمان اور دشمنانِ اسلام کے درمیان جنگ دراصل عقیدے کی جنگ ہے۔ یہ دشمنانِ اسلام اہل ایمان سے صرف عقیدے کی وجہ سے چڑتے اور محض ایمان کی وجہ سے بیر رکھتے ہیں۔

یہ کوئی سیاسی یا اقتصادی جنگ نہیں۔ نسلی اور قومی جنگ بھی نہیں۔ اگر ایسی کوئی جنگ ہوتی، تو اس کا ختم ہو جانا آسان تھا، مگر یہ تو عقیدے کی جنگ ہے۔ کہ یا تو کفر ہوگا یا ایمان۔ یا جاہلیت رہے گی یا اسلام!

اشرفِ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مال و دولت کے انبار حکومت کے تخت و تاج اور عیش و عشرت کے سامان، غرض ساری ہی چیزیں پیش کی تھیں کیوں؟ صرف اس لیے کہ آپ عقیدے کی جنگ سے باز آجائیں، اس معاملے میں نرمی و رواداری سے کام لیں۔ اور اگر — معاذ اللہ — ان میں سے کسی چیز پر بھی آپ راضی ہو گئے ہوتے، تو آپ سے

ان کی کوئی جنگ نہ رہتی !

یاد رہے ! یہ دراصل عقیدے کا مسئلہ اور عقیدے کی جنگ ہے۔ اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ جب بھی کسی دشمن کے مقابلے میں صف بستہ ہوں، ان کے ذہن و دماغ میں یہ حقیقت مستحضر رہے۔ کیونکہ عداوت کی بنیاد صرف عقیدہ ہے لڑائی کی وجہ بس یہ ہے کہ وہ خدائے عزیز و حمید پر ایمان رکھتے اسی کے آگے جھکتے اور اسی کی اطاعت کرتے ہیں !

دشمنان دین کی کبھی یہ کوشش ہوتی ہے کہ عرصہ جنگ میں مذہبی جھنڈے کے علاوہ کوئی اور جھنڈا بلند کر دیں۔ خواہ وہ اقتصادی جھنڈا ہو یا سیاسی اور قومی جھنڈا تاکہ وہ اہل ایمان کو جنگ کی حقیقت سے غافل رکھ کر ان کے سینوں میں عقیدے کے دھتے ہوئے انگارے سر در دیں۔ مومنین کا فرض ہے کہ وہ دھوکہ نہ کھائیں، ان کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ چوکنے رہیں کہ یہ ایک ناپاک سازش اور اک خفیہ مقصد کے لیے ملمع کاری ہے، جو ایسا کرتا ہے وہ دراصل فتح و نصرت حقیقی اسلحہ سے انہیں غافل کرنا چاہتا ہے۔ خواہ یہ فتح و نصرت کسی بھی شکل میں ہو، روحانی ترقی کی شکل میں جیسا کہ واقعہ اُحد و دین میں اہل ایمان کو حاصل ہوئی، یا مادی غلبہ و اقتدار کی شکل میں جو روحانی ترقی کا ہی نتیجہ ہے جیسا کہ قرن اول کے مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔

جھنڈے کے رخ پر یہ غازہ ملنے کی زندہ مثال وہ عالم گیر صلیبی تحریک ہے جس کی آج یہ کوشش ہے کہ موجودہ جنگ کی حقیقت کے سلسلہ میں ہم کو فریب میں رکھے اور تاریخ کے بدناما چہرے پر کسی طرح کوئی حسین و جمیل نقاب ڈال دے۔ چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ صلیبی جنگوں کی آٹھ میں دراصل سامراجی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ خود بعد میں نمودار ہونے والے سامراج

کی آڑ میں صلیبی رُوح کی وہ دیوی تھی، جس کے اندر اتنی قوت و ہمت نہ تھی کہ  
 قرون وسطیٰ کی طرح عریاں و بے حجاب ہو سکتی! کیونکہ چند مسلمانوں کی قیادت نے  
 اسے عقیدے کی آہنی چٹان سے ٹکرا کر چور چور کر دیا تھا۔ انہی مسلمانوں میں صلاح الدین  
 مکرہ وی اور توران شاہ ملوک بھی تھے۔ یہ مسلمان ان نسلوں سے تھے جو اپنی قومیتیں بھول  
 کر بس عقیدے کی بہرہ ہی تھیں۔ چنانچہ وہ عقیدے کے جھنڈے تلے فتح و نصرت  
 سے ہم کنار ہو گئے!

وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ

اور انہیں ان کی صرف یہ بات بری لگی، کہ وہ اللہ پر ایمان رکھیں،

جو اقدار کا مالک اور حمد و ستائش کا سزاوار ہے۔

سچ کہا، سچ کہا خدائے برتر نے، اور غلط کہا ان جھوٹے مکاروں نے۔

تفوقِ شہادہ

سید قطب شہید

توجہ

عنایت اللہ سجانی



فاران اکیڈمی

۵۸۔ حلیم اسکوائر۔ ملتان